قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2013، قیمت -/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

اردو زبان و ادب اور ہندی

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:15، شمارہ:12، دسمبر 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر
ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی
قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in
شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194-040

اداریہ
ہماری بات 2
خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3
رپورٹ
اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے پروگرام 7
انٹرویو
علقمہ شبلی — معصوم شرقی 8

کور اسٹوری
اردو اور ہندی: قربتیں اور فاصلے — عبدالواسع 10
اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ — عبدالحی 13
اردو ادب میں رحیم اور کبیر کو جگہ ملنی چاہیے تھی — عبدل بسم اللہ 15
اردو ہندی افسانہ — سلام بن رزاق 19
ہندی کہانیوں کا منظرنامہ — مشرف عالم ذوقی 21
خراج عقیدت
راجندر یادو: نئی ہندی کہانیوں کا روحِ رواں — انوارالحق 24
میموریل لیکچر
سرسید کی انفرادیت — سید محمد اشرف 27
زبان و تعلیم
فاصلاتی نظامِ تعلیم اور اردو — زبیر شاداب 33
ادبی مباحث
ٹیگور کا نظریۂ موت وزیست — مناظر عاشق ہرگانوی 36
قاضی محمد عدیل عباسی ایک معروضی جائزہ — شاداب عالم 38
بریلی کے غیر مسلم شعرا — محمد سلمان بلرام پوری 40

خاکہ نگاری اور مرزا فرحت اللہ بیگ — روحی فرزانہ 42
شخصیت
ابن الخاتمہ اندلسی — عبدالناصر فاروقی 44
مشاہیر ادب
درگاسہائے سرور جہان آبادی — الف ناظم 46
انتخاب کلام سرور جہان آبادی 49
ہماری مطبوعات
تاریخ ابن خلدون کی اہمیت — محمد صہیب 51
صحافت
نامہ نگار: سماج کا ایک باشعور اور ذمہ دار رُکن — سید فضل اللہ مکرم 54
کریئر گائڈ
انٹرنیٹ سے کمائی کے جائز طریقے — ریشما انجم 59
صحت
پانی سے علاج: ایک قدرتی طریقہ — شمس الاسلام فاروقی 61

تہذیب و ثقافت
اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی شاہی شادیاں — محمد قمر عالم 63
فلم
سنیما اور شہر — شائستہ فاخری 66
سائنس
دُم دار ستاروں کی ماہیت — عظیم اقبال 69

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 71
عالمی اردو نامہ
عالمی خبریں — ادارہ 79
خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

زبانیں لوگوں کو جوڑنے کے لیے وجود میں آئی ہیں۔ وہ کسی آسمان سے نہیں اتریں۔ خود انسان نے انھیں اپنی ضرورت کے لیے تخلیق کیا ہے۔ انسانی سماج کی تشکیل سے پہلے جب ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگے تو انسان نے اپنی آواز کو سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جوڑ کر ایسی خاص آوازیں منھ سے نکالنے کا طریقہ اپنالیا جو کسی خاص مفہوم یا مطلب سے وابستہ ہوا کرتی تھیں۔ ان ہی آوازوں کی شکل میں لفظوں کے ابتدائی نقوش ذہنوں میں محفوظ ہونے لگے جن میں رفتہ رفتہ ایک قرینہ اور قاعدہ فروغ پانے لگا اور اس طرح انسانی بولیاں وجود میں آتی چلی گئیں۔ پھر ان آوازوں کو ٹھوس شکل دینے کے لیے انسان نے لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا جس سے بولیاں باقاعدہ زبان کی شکل اختیار کر گئیں اور کہی یا سوچی ہوئی باتیں تحریروں میں محفوظ ہوتی گئیں۔ تب اس ترسیلی قوت نے لوگوں کے بڑے گروہوں کو ایک دوسرے سے جوڑا اور انسانی سماج کی تشکیل وارتقا کا وہ شاندار سفر شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

مگر بدقسمتی سے مذہبی اور علاقائی وابستگیوں کی طرح انسان نے زبانوں کو ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور سماج کو قوموں وملکوں میں تقسیم کرنے کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا گُر بھی اپنا لیا۔ یوروپ اور ایشیا کے کئی خطوں میں یہ ہتھکنڈا کسی نہ کسی شکل میں سامنے آچکا ہے۔ یہ بھی عالمی تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی گروہوں کے بہت سے ٹکراؤ مذہبی، علاقائی اور لسانی تعصبات کو بنیاد بنا کر عمل میں لائے گئے جن سے برصغیر بھی اچھوتا نہیں رہا۔ یہاں لوگ اپنی مذہبی وتہذیبی پہچان کے ساتھ زبان کی پہچان کو بھی عزیز رکھتے آئے ہیں اور اس خطے کے سیاسی مفاد پرستوں نے ہمیشہ اس رنگارنگی کو پھوٹ اور تفریق میں بدل کر حکومت اور اقتدار میں قائم رہنے کی کوشش کی ہے۔

اردو اور ہندی دونوں اس خطے کی وہ بڑی زبانیں ہیں جو کم وبیش ایک ہی عہد میں پیدا ہوئیں، ایک ہی طرح کے سماجی اور معاشرتی حالات میں جنھوں نے پرورش پائی، اور ملک کے طول وعرض میں ایک ساتھ رہ کر مجموعی طور سے ایک ہی جیسے راستوں پر اپنا ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ لیکن سمندر پار کے غیر ملکی حکمرانوں نے اس لسانی ہم آہنگی کو ایک مضبوط اور ناقابل شکست قومی طاقت بننے سے روکنے کے لیے علاحدگی پسندی کی ڈگڈگی کچھ پراسرار ہاتھوں میں تھما دی جس کی آواز پر رقص کرنے والوں نے بالآخر ملک کو تقسیم کر کے دم لیا۔ بدقسمتی سے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہونے والی اس تقسیم میں اردو جیسی زبان کو بھی ملوث کر لیا گیا جو خالص سیکولر بنیادوں پر قائم تھی اور جسے ہم ہندوستانی زبانوں کا تاج محل مانتے آئے تھے۔ اس تقسیم نے ردعمل کے طور پر ہندوستان میں ان متعصب آوازوں کو طاقت دی جو اردو کو فرقہ پرستی کی علامت قرار دے کر ملک سے اس کا نام ونشان مٹا دینا چاہتی تھیں۔ اتر پردیش کی حد تک ایسا چاہنے والوں کو کسی قدر کامیابی بھی ملی۔ لیکن آخر کار ہندوستان کے سیکولر آئین اور مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، فراق گورکھ پوری، پنڈت آنند نرائن ملا جیسی روشن شخصیتوں، فلمی دنیا، موسیقی کی محفلوں، ٹی وی چینلوں اور ثقافتی میلوں نے نہ صرف اردو زبان کی سرپرستی کی بلکہ اردو تہذیب کی بقا کے حالات بھی پیدا کیے۔ ہندی کو اردو پر مسلط کرنے یا اس کا رسم خط دیوناگری کر دینے جیسی کوششوں نے وقت گزرنے کے ساتھ دم توڑ دیا اور تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ ہندوستان کوئی منجمد تہذیبی، ثقافتی وحدت نہیں بلکہ زندہ ومتحرک خیالات ونظریات اور تہذیبی رنگینیوں کا دھڑکتا ہوا حسین مرقع ہے۔ اس شمارے کی کور اسٹوری میں ہم اردو اور ہندی دونوں کے باہمی رشتوں کی اہمیت اور ان کی لسانی بنیادوں میں پیوست مشترک قدروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک وسیع موضوع جس سے کسی ایک شمارے کے پانچ چھ مضامین میں انصاف نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری کوشش رہے گی کہ آئندہ شماروں میں بھی ملک کی ان دونوں عظیم زبانوں پر مضامین کا سلسلہ جاری رہے۔

زیر نظر کور اسٹوری آپ کو کیسی لگی، اس میں کہی گئی کتنی باتوں سے آپ متفق ہیں اور کن سے اتفاق نہیں رکھتے، اس بارے میں لکھیے گا ضرور!

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوار العلوم رام نگر، بارہ بنکی

ماہنامہ اردو دنیا نومبر 2013 کے سر ورق پر لکھا ہوا گوشہ علی سردار جعفری نیز بنگلور میں منعقد قومی اردو کونسل کا پندرہویں کل ہند اردو کتاب میلے کی چھپی خوبصورت تصویروں کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ بڑی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ہماری بات کے موضوع پر محترم مدیر صاحب نے جو بھی باتیں قلمبند کی ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ شاہ فیصل کا وارث علوی سے لیا گیا انٹرویو بھی معلومات سے بھر پور ہے۔ کور اسٹوری میں شامل مضمون بنگلور میں منعقد پندرہویں کل ہند اردو کتاب میلے کی مکمل رپورٹ شاہد اختر نے بڑے ہی اچھے انداز میں تحریر کی ہے۔ 14 ستمبر سے 22 ستمبر 2013 تک چلنے والے اس میلے میں کتابوں کی خرید وفروخت کی نمائش کے ساتھ ساتھ منعقد ہونے والی مختلف محفلیں اور جلسوں کی خوبصورت تصویروں نے شمارے کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ کوراسٹوری کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ یہ شاندار میلہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اردو زبان کسی مخصوص طبقے کی زبان نہیں ہے یہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس کا مستقبل روشن ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو 'محافظ اردو' کا نام دینا بہت ہی مناسب ہے۔

گوشہ علی سردار جعفری کے عنوان میں شامل سبھی مضامین بہت خوب لکھے گئے ہیں۔ کرشن بھاوک کا لکھا ہوا مضمون 'علی سردار جعفری شخصیت اور فن' بہت ہی اچھا اور معلومات سے بھر پور ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی اور علی احمد فاطمی نے بڑی عرق ریزی سے مضمون قلمبند کیے ہیں۔ محمد احسن نے ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی صورت حال کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ ادبی مباحث کے تحت ایس نسیم بانو کا مضمون 'علامہ اقبال اور قومی یکجہتی' بہت ہی اچھے انداز میں سپرد قلم ہوا ہے۔ عبدالعزیز عرفان نے 'پہلی جنگ آزادی اور بہادر شاہ ظفر' مضمون بہت ہی پراثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ حقیقت کی ایک کھلی تصویر ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی بیش بہا قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دیگر مضامین بھی بہت خوب اور لائق ستائش ہیں۔ کونسل کے نئے منصوبوں سے دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کی ترقی کا خواب بھی ان شاء اللہ شرمندہ تعبیر ہو گا۔ اللہ کی ذات سے مجھے یقین کامل ہے کہ اردو دنیا کا معیاری سفر یوں ہی جاری رہے گا۔

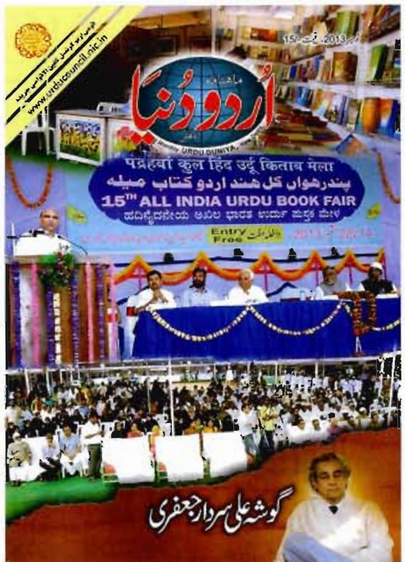

محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' کا اکتوبر 2013 کا شمارہ حسب معمول اپنی امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ ایک دو نہیں متعدد گراں قدر مشمولات اور مضامین کا مجموعہ یا خزینہ معلومات موصول ہوا۔ مندرجہ ذیل حد درجہ معلوماتی مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ علامت لفظ کی میزان ہے، اکیسویں صدی میں اردو فروغ و امکان، معاملات اردو، ادب اور اساطیر، ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس، مخمور سعیدی کی شخصیت، حکیم اجمل خان کی ادبی خدمات اور تبصرے۔ ان مضامین کے لکھنے والے حضرات اور ان کی اشاعت پر آنجناب قابل صد تبریک وتہنیت ہیں۔

ڈاکٹر شریف الدین خاں

سابق ادھیکش کے ضلع آیور ویدادھیکاری نزد یونیورسٹی رائے پور

'اردو دنیا' کا ہر شمارہ بہترین اور معیاری ہوتا ہے۔ مضمون کا انتخاب، طباعت، اسے پیش کرنے کا سلیقہ خوب سے خوب تر ہے۔ آپ کی بات میں بہت اعلا معیار کے خطوط شائع ہوتے ہیں اور تحریر کرنے والے بھی اپنی رائے بے لاگ لکھتے ہیں قلم کار اپنے میدان کے تجربہ کار اور بہت قابل ہوتے ہیں۔ ہماری بات میں جس سبجیکٹ پر بات ہوتی ہے بہت مضبوط اور عمدہ ہوتی ہے۔ 'اردو دنیا' کے شمارے ادب مذہب اور اردو، بچوں کا ادب اور اردو، ہندوستانی مدارس اور اردو بے حد قیمتی سرمایہ ہیں اور بار بار پڑھنے کے لائق ہیں تازہ شمارہ علاقائی زبان وادب و اردو بھی بہت خوب ہے۔ حسب معمول ہماری بات کا جواب نہیں۔ بنگلہ اور اردو: ف س اعجاز، اردو اور پنجابی، اڑیا زبان اردو، اردو مراٹھی کے باہم روابط بہار کی علاقائی زبان وادب و اردو گویا کوزے میں دریا ہے۔ اس کے علاوہ اختر حسین رائے پوری کا اسلوب انتہائی کھوج بین کے بعد قلم بند کیا گیا ہے جس کے لیے خالد ندیم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس طرح مشتاق احمد وانی، جموں وکشمیر میں اردو تحقیق بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ ویسے تحقیقی مقالے لکھنا بہت جانفشانی اور محنت کا کام ہے۔ مرزا شوق لکھنوی پر مضمون اور ان کی تخلیق اچھی لگی اور اس زمانے کی طرز تحریر کا اندازہ ہوا۔ کرشن چندر میرے محبوب رائٹر ہیں۔ ان کی بہت سی تخلیق پڑھنے کا موقع ملا۔ گدھے کی سرگزشت تو ایک رسالے میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔ ان کی زندگی پر تحریر کردہ کتاب جو ان کی شریک حیات سلمیٰ صدیقی نے تحریر کی تھی اس سے ان کے متعلق کافی جانکاری ہوئی تھی۔ پشاور ایکسپریس میں کتنا درد ہے اسی طرح دکن کا بہمنی سلطان تاج الدین افروز اور تمام مضامین کا انتخاب بہت خوب ہے۔ ہر شمارہ سنبھال کر رکھتا ہوں۔ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ اردو رسالوں کا معیار کتنا اچھا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ، ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

ماہ ستمبر 2013 کا 'اردو دنیا' بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر علاقائی زبانوں کے حروف تہجی دیکھ کر ایسا لگا کہ کاش ہندوستانیوں کے دل میں اس کو سیکھنے کا شوق وجذبہ پیدا ہو جائے تاکہ اردو ہر ہندوستانی کی زبان بن جائے جیسا کہ ماضی میں تھا۔ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی سے گفتگو میں اساتذہ پر کڑی تنقید کی ہے وہ کہتی ہیں کہ اساتذہ

بھاری بھرکم تنخواہ لیتے ہیں لیکن ان کے برابر علم وتربیت نہیں کرتے۔ کوراسٹوری کے تحت جتنے مضامین چھپے ہیں وہ بنگلہ، پنجابی، اڑیا، تیلگو، مراٹھی، بہار کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ اور ان کا اس زبان سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شمارے کے دیگر مشملات ارفع اور وقعت کے حامل ہیں۔ رسالے کے مدیر اور ان کے رفقا کو مبارکباد دیتا ہوں لیکن ایک کمی یہ محسوس کی گئی ہے کہ اس ماہ کی مناسبت سے تعلیم، معلم اور درس و تدریس پر مبنی ایک مضمون شائع ہونا چاہیے تھا۔ 5 ستمبر یوم اساتذہ ہے اس لیے اسی مناسبت سے شائع کریں۔ رسالے کے مشملات کا حسن ومعنویت اور دوبالا ہوجائے گی۔

'اردو دنیا' ماہ اکتوبر 2013 کا شمارہ بھی وقت پر ہمدست ہوا۔ بروقت ملنے سے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ویسے اب عادت ہی پڑگئی ہے کہ ماہ کب ختم ہو اور 31 یا 1 تاریخ کو شمارہ مل جائے۔ اس رسالے کے لیے اردو قاری انتظار میں لگا رہتا ہے۔ اکتوبر کے اس شمارے کے سرورق پر گلوب کے درمیان میں بین الاقوامی کانفرنس، اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکانات جو 4 سے 6 ستمبر کو دہلی میں منعقد کی گئی۔ یہ شمارہ اکتوبر کا ہے اس میں UNO کے متعلق کوئی مضمون ہونا چاہیے کیونکہ موقع تھا۔ ویسے آج کل صحافت میں موقع و مناسبت کا بہت کم لحاظ رکھا جارہا ہے۔ ہر ماہ کی تاریخی اہمیت ہوتی ہے۔ 24 اکتوبر کو UNO قائم ہوا۔ بہرحال یہ میری شکایت نہیں تجویز ہے۔ NCPUL نے ایک اہم موضوع پر کانفرنس منعقد کی ہے اس طرح کے اجلاس سے اردو کے مسائل کا حل نکل آئے گا۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر گوناگوں خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ اس سے اردو قاری کو فیض حاصل ہورہا ہے اور طالب علم بھی استفادہ کررہے ہیں۔ اسی نہج پر یہ رسالہ نکلتا رہے گا تو ان شاءاللہ اردو والوں کی عصری ضرورت پوری ہوگی۔ رسالہ عصری آہنگ اور لب و لہجہ لیے ہوئے ہے۔ میری دانست میں ایسا رسالہ نہ تو کبھی ماضی میں نکلا تھا اور نہ آج پوری ادبیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

ایم راگھوراؤ
ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

'اردو دنیا' اکتوبر 2013 کا شمارہ اچھا اور معیاری ہے۔ غزلوں، نظموں اور نثری نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ لطف الرحمٰن ایک فطری شاعر تھے۔ ان کے اشعار ذہنی بالیدگی اور ارتفاع کا اظہار ہیں۔ انھوں نے صحرائے نقد میں اپنی تعمیری فکری بارشوں سے دلکش سبزے بھی اگائے۔ وہ تنقید کو بھی تخلیق سے کمتر نہیں سمجھتے تھے اور ادب کے لیے تنقید کو سائنس تصور کرتے تھے۔ اردو شاعری مختلف تحریکوں سے متاثر رہی ہے، مخمور سعیدی نے ان تحریکوں کے اثرات تو قبول کیے لیکن کسی بھی ایک تحریک کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا۔ انھوں نے قدرتی مناظر کو اپنے تجربوں میں شامل کرکے جدید غزل کے مجموعی رنگ سے ممتاز کرلیا ہے۔ وہ گھر، دل اور تنہائی کے شاعر ہیں۔ لفظیات کا ذخیرہ ان کی خصوصیت میں شامل ہے۔ مخمور سعیدی کی شاعری درد آمیز اور غم انگیز ہے۔ مرزا واجد حسین یاس یگانہ اردو شاعری میں ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل میں فرسودہ روایت پرستی اور بے جا غالب پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ اردو غزل میں صحت مند فضا بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی حرکت، توانائی اور روایت پرستی کے خلاف بغاوت ملتی ہے۔ ساجد رشید نے ادبی اور سیاسی صحافت میں آزادی اظہار، حق گوئی اور منطقی انداز فکر کے محاوروں کو اپنایا۔ انھیں اردو فکشن کی طرح اردو صحافت میں بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے افسانوں کے زیادہ تر کردار اور واقعات بڑے شہروں کے ہوتے ہیں جن میں تجارتی، اقتصادیات اور صنعت سمٹتی چلی جارہی ہے۔ حکیم اجمل خان کی پوری زندگی قربانیوں کی عظیم داستان ہے۔ وہ تمام عمر طبقاتی کشمکش اور ذاتی اختلافات کو دور کرنے کے لیے سرگرداں رہے۔ حکیم صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی طریقہ طب کو جدید سائنسی ایجادات سے ہم آہنگ کرکے طب کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے شاعری ذہنی آسودگی کے لیے کی۔ ان کے کلام میں منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسداللہ
30، گلستان کالونی، ناگپور

'اردو دنیا' اکتوبر 2013 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ حسبِ معمول تقریباً سبھی مضامین متنوع موضوعات پر بھرپور معلومات پیش کرتے ہیں۔ اس شمارے کی سب سے متاثر کن تحریر ساجد رشید کا افسانہ 'راکھ' ہے۔ یہ افسانہ ہمیں جھنجھوڑتا ہے، چونکاتا ہے اور غور وفکر کے دروازے کھولتا ہے۔ موجودہ دور میں خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلم نوجوان لڑکے لڑکیوں میں غیر مسلموں کے ساتھ شادی کا رواج جس تیزی سے بڑھ رہا ہے قومی سطح پر یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس افسانے میں مسلم نوجوان کا اپنی غیر مسلم منکوحہ کی مذہبی روایات کی پاسداری کا عمل ممکن ہے۔ افسانہ نگار کے نزدیک رواداری اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہونا الگ بات، مگر سکے کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ آج نئی نسل میں ہماری مذہبی اور تہذیبی قدریں اس قدر دھندلی ہوتی جارہی ہیں کہ وہ بغیر وقت گنوائے ان سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ مذہب تو بہت دور ہے ہم تو اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کو بھی نئی نسل میں راسخ نہیں کرپارہے ہیں۔ یہ افسانہ اس احساس کو جگانے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک
کوٹھی نمبر 201-A، گلی نمبر 18-K، گورونانک نگر، پٹیالہ پنجاب

''اردودنیا' کا اکتوبر ماہ کا شمارہ حسبِ سابق حسنِ سے مزین دستیاب ہوا۔ سرکارِ ہند کو جلد ہی عربی و فارسی جیسی معیاری شہرۂ آفاق زبانوں کو ان کا واجب حق فراہم کردینا چاہیے اور ہند کے عوام الناس ومشاہیر اس ضرب المثل پر اکتفا کرلیں گے کہ 'دیر آید درست آید'۔ انگریزوں نے دو تین سو سال تہذیب وتمدن کے لیے دنیا میں اول مانے جانے والے ہمارے ملک پر حکومت کرکے ہمیں انگریزی جیسی شہرۂ آفاق زبان کا جو بیش بہا ہدیہ عطا کیا تھا، کیا ایران وعرب ممالک کی ویسی ہی حکومت اپنے اوپر محمول کروانے کے بعد ہی ہم ان کی ان مذکورہ بالا بلند ومعیاری زبانوں سے مستفید ہوسکیں گے، آخر سرکار کس بات یا موقعے کا انتظار کررہی ہے؟

سید محمد اشرف کے کلیدی خطبے (Key-Address) کی ہی مانند دیگر قلم کاروں کے مضامین بھی ملک میں مختلف اداروں میں عربی فارسی زبانوں کی بہبود کے لیے جن اقدام وتجاویز کی پزیرائی کے لیے مناسب زور ڈال رہے ہیں، ان سے تمام قارئین بھی صدفی صد اتفاق رکھتے ہیں اور قومی کونسل کی کاوشوں کے موجب اس کو بھی قابلِ ستائش

قرار دیتے ہیں۔ ریاض احمد کا مضمون بھی معاشی و سماجی طور پر کمزور طلبا کے اسکولوں میں داخلے کے لیے عمر کے 14 ویں سال تک آٹھویں کلاس تک تعلیم فراہم کرنے کے لیے ان کے سرکاری سرپرستی و تحفظ و کفالت کی حصولیابی کے حق کو قائم و بحال کرنے کی خاطر ایک راسخ آواز بلند کرنے اور مختلف سہولیتیں فراہم کرنے کے نظریے سے ایک صحیح مطالبے کو مرتسم کرتا ہے۔ سیدہ جعفر نے اساطیری اہمیت اپنے مقالے میں ثابت کی ہے، سنسکرت و ہندی زبانوں کے ادب سے معقول حوالے دے کر قومی یکجہتی کی قابلِ تقلید نشان دہی کی ہے۔ محمد معظم الدین نے سرسید احمد خاں کی تاریخی تحقیق نگاری اور ادبی کام کو متعارف کرایا ہے، ساتھ ہی اسلامی مذہب کے تئیں انگریزوں کو صحیح معلومات فراہم کی ہے۔ اسلم پرویز نے اپنی معیاری کتاب 'بہادر شاہ ظفر' میں ایک معتبر و مستند حوالے سے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کسی شخص نے بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق سے ظفر کے دیوان کے متعلق دریافت کیا جو ذوق سے منسوب کیا جاتا تھا۔ تب انھوں نے کہا تھا کہ ذوق بھلا کیا کھا کر بادشاہ کے دیوان تحریر کریں گے، بلکہ یہ کہیں کہ قلعے کے تعلق سے ذوق کو از خود اردو زبان آ گئی ہوگی۔ اس ایک تاریخی قول سے ہی سرسید احمد خاں کی قابلِ مدح دوراندیشی کی ناقابلِ تردید خط کشی ہو جاتی ہے۔

مخمور سعیدی پر رام پرساد بینا کا مقالہ بھی کوزے میں سمندر ہے۔ مخمور کے کلام میں موصوف نے ان کے سفرِ آخرت کے واضح کنایوں سے ان کے لاشعور میں پیوست 'وفات' کی استعجاب آمیز پیشن گوئی کو معقول اشعار سے 'ہائی لائٹ' کیا گیا ہے۔ آخری شعر کا یہ مصرعہ ثانی

''آنکھیں حیران ہیں کیا شخص زمانے سے اٹھا''

ذوق کے ہی اس شعر کا متقاضی معلوم ہوتا ہے اور مخمور سعیدی پر از خود بھی یہی شعر صادق آتا ہے:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اتنے خوبصورت شمارے کے لیے ادارے کے تمام افراد مبارک باد کے کاملاً مستحق ٹھہرتے ہیں!

خ ع شاذ
گلی نمبر 3، کانکی نارہ، شمالی 24 پرگنہ (مغربی بنگال)

ماہ اکتوبر کا رسالہ 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ سرورق دیدہ زیب اور دلکش تصویروں سے مزین ہے۔ ہر ماہ رسالہ آتے ہی اس کی خوبصورتی دیکھ کر ہاتھ میں لے بیٹھتا ہوں۔ پہلے ورق گردانی، بعد مشمولات پر نظر ثانی اور اس کے بعد اپنے مزاج کے مطابق مواد کی وادیوں میں سیر کرتا ہوں۔ قومی کونسل کی پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس پر دو مضمون نگاروں کے مضامین اور ایک اداریے کا مضمون پڑھا جس سے اردو کے عروج، اردو کی تواریخ، اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ، اردو اکادمیاں اور میڈیا کا کردار اور ترقی و ترویج کو بخوبی جاننے کا موقع ملا اور اہل اردو کی بڑی بڑی شخصیات کے خطابات سے کچھ نئی باتوں کی جانکاری میں اضافہ ہوا۔ سید محمد اشرف کا کلیدی خطبہ واقعی قابلِ ستائش و قابلِ تحسین ہے۔ بین الاقوامی مشاعرے کچھ خاص شعرا کے اشعار بھی شائع ہوئے جس میں نسیم نکہت، انیس انصاری اور وسیم بریلوی کے اشعار بہت پسند آئے۔ ادبی مباحث میں ادب اور اساطیر، ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس کا ایک تجزیہ، سرسید کی تاریخ نگاری اور مرثیہ کی خواندگی کا فن کا مطالعہ کیا۔ شخصیت میں رام پرساد بینا کی تحریر 'بھیڑ میں ہے مگر اکیلا ہے: مخمور سعیدی کی شخصیت کے مختلف پہلو' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مشاہیر ادب (نثر) سے ساجد رشید کی شخصیت اور ان کا افسانہ 'راکھ' بہت پسند آیا۔ جب کہ دوسری زبانوں سے 'دھواں' ایک گجراتی افسانے کا اردو ترجمہ بھی کافی دلچسپ رہا۔ رسالے میں کیریئر سے منسلک کوئی مضمون شائع تا کہ ملازمت کے متلاشیوں کو صحیح راہ مل سکے۔ شرجیل احمد خان کا سائنسی مضمون 'اسحاق نیوٹن، حیات اور کارنامے' سے اور ساتھ ہی The Elements of Islamic Philosophy کا اردو ترجمہ بعنوان 'مسلم فلسفہ اور اس کی اہمیت' سے ہم کیا اردو دنیا کے قارئین بھی استفادہ کیے ہوں گے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ آج پورے ہندوستان میں اردو کی ترقی و ترویج میں قومی کونسل کا کلیدی رول ہے۔

عزیر احمد
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

اکتوبر کا ماہنامہ 'اردو دنیا' ملا، سرورق پر بین الاقوامی کانفرنس کی دیدہ زیب تصاویر دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ کانفرنس کی روداد اور سبھی مضامین پسند آئے خاص طور پر سیدہ جعفر کا مضمون 'ادب اور اساطیر' اور مشتاق احمد کا مضمون 'لطف الرحمٰن کا نظریۂ شعر و ادب' معلوماتی رہا۔ سید محمد اشرف کا مضمون 'معاملات اردو' جو کہ اردو کانفرنس کا کلیدی خطبہ بھی ہے مختصر مگر معلوماتی ہے۔ انھوں نے اختصار کے ساتھ اردو کی موجودہ صورت حال، اردو اداروں کی حالت زار اور مستقبل کے لائحۂ عمل پر روشنی ڈالی۔ لیکن مدارس کے حوالے سے موصوف نے جو باتیں کہی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو مدارس کے بارے میں مکمل جانکاری نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کی ترقی کا لائحۂ عمل اکثر مدارس کے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ضمنی طور پر تقریباً سبھی مدارس کے دستور میں اردو کی ترقی شامل ہے۔ مدارس کے دستور میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینا شامل ہے۔ ہندوستان کے تناظر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا تصور اردو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو آبادی سے دور آسام اور اڑیسہ جیسے علاقوں کے مدارس بھی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں جب اردو کے نام پر قائم بہت سے ادارے صرف خانہ پری کر رہے ہوں وہاں زمینی سطح پر اردو خواندگی کو فروغ دینے والے مدارس کو صرف اس وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دستور میں اردو کا فروغ نہیں ہے۔

مدرسہ بورڈ سے ملحق مدارس کے بارے میں سید محمد اشرف کو اگرچہ خوش فہمی ہو کہ ان کے اساتذہ کی تنخواہ قابل لحاظ ہوتی ہے لیکن مدارس سے وابستہ افراد اچھی طرح جانتے ہیں جن مدارس کا بھی الحاق مدرسہ بورڈ سے ہوا ان کا معیار تعلیم سرکاری اسکولوں جیسا ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ سبھی اہم دینی ادارے مدرسہ بورڈ سے الگ ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے کہ 'اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا مدارس کی مجبوری ہے اب عربی و فارسی میں تعلیم دینے والے اساتذہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔' اس سے بحث نہیں کہ مدارس کسی مجبوری میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بناتے ہیں یا اس وجہ سے کہ انھیں اسی ملک میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے جہاں کے اکثر مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ اس صورت میں بھی اردو ذریعۂ تعلیم ان کی مجبوری ہی ہوگی۔ ویسے اردو زبان اگر زندہ ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اردو ہماری مجبوری ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ اردو ہی ہندوستان کی عوامی ترسیل کی زبان ہے۔ یہی مجبوری فلمی دنیا اور ٹی وی چینلوں کے ساتھ بھی ہے کہ ان کو عوام سے مخاطب ہونا ہوتا ہے۔ جس دن یہ ضرورت ختم ہو جائے گی اس دن اردو ختم ہو جائے گی۔ اردو ادارے اور انجمنیں صرف اس ضرورت کی تکمیل میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ صرف اردو ہی نہیں کوئی بھی زبان ہو ضرورت ہی اس کو زندہ رکھتی ہے۔ آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مدارس کے نظام تعلیم میں واقعی کچھ کمیاں ہیں، انھیں دور کیا جا سکتا ہے۔ پورے ملک میں پھیلے ان مدارس کو اردو تحریک سے الگ رکھنے کے بجائے ان کو بھی اردو تحریک کا حصہ بنا لیا جائے تو اس سے بہتر نتائج کی امید کی جا سکتی ہے۔

فیض احمد فیض موناوی
پاٹل چوک، ہنس پورا مارکیٹ، پوسٹ پاسپورہ، اورنگ آباد

'اردو دنیا' کا نیا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ تہہ دل سے شکریہ۔ سرورق پر بین الاقوامی اردو کانفرنس کی تصویر اپنی

طرف فوراً توجہ مبذول کراتی ہے، مضامین میں سید محمد اشرف کا مضمون پسند آیا۔ انٹرویو میں حسین الحق کے جواب اچھے لگے۔ حسین الحق ایک بڑے افسانہ نگار و ناول نگار ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت سارے مضامین معلومات سے پر ہیں۔ نثار احمد صدیقی کا مضمون 'خواجہ احمد عباس کی فلمیں' پڑھ کر بہت ساری معلومات ہوئی۔ 'فلم' کے تحت کوئی نہ کوئی مضمون ضرور دیا کریں۔

پرویز ناصر

آریہ بھٹ، انجینیئرنگ کالج، پانہ گڑھ (بنگال)

بلا شبہ 'اردو دنیا' مشعل راہ ہے۔ اکتوبر 2013 کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ اس سے قبل کا شمارہ بھی نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ملک کے علاقائی زبان و ادب کے ساتھ اردو کے اختلاط و اشتراک کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً ماہرین لسانیات اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ زبان کوئی جامد شے نہیں ہے اور وہ سب سے الگ Isolation میں بھی نہیں رہ سکتی۔ زبانیں بہتی ہوئی ندیوں کی طرح ہوتی ہیں جو اپنے کناروں کی مٹی کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ 'ہماری بات' غضب کی ہوتی ہے۔ سرورق پر سہ رنگی زمین پر قد آور درخت اس پر حروف کا بھی پھل لگا ہونا اچھا لگتا ہے۔ علاقائی زبان و ادب اور اردو کے موضوع پر یہ شمارہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

نثار احمد صدیقی

کریم گنج، گیا، بہار

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ اکتوبر 2013 دستیاب ہوا۔ شکریہ! کوراسٹوری کے تحت قومی اردو کونسل کی پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس کی روداد اور دیگر مضامین آپ نے شائع کر کے ہم سب اردو داں پر احسان کیا ہے۔ ان مضامین سے بہت ساری معلومات حاصل ہوئیں۔ دوسرے عظیم فنکاری کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت آپ جو معلومات فراہم کر رہے ہیں وہ عالمی سطح پر اپنی اہمیت کو منوا رہے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں حسین الحق سے لیا ہوا انٹرویو بھی اچھوتا اور لاجواب ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ کامیاب ہے۔

مسعود علی بیگ

شعبۂ لسانیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

'اردو دنیا' ستمبر 2013 دیکھا۔ حسب معمول دلکش ہے اور افادیت سے بھرپور اور اب کونسل نے 'بچوں کی دنیا' جیسا جاذب اور عمدہ رسالہ جاری کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو بطریق احسن پورا کیا ہے۔ آپ سب کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے جس قدر تعریف کی جائے کم ہوگی۔ 'اردو دنیا' کے موجودہ شمارے (ستمبر) میں 'اپنی بات' کے تحت ایک مقام پر سہو ہوگیا ہے یا آپ اسے Slip of Pen کہہ لیجیے۔ 'ملک کی قومی زبان ہندی' کہنا غلط ہے۔ قانونی اور آئینی اعتبار سے ہندی یا کوئی بھی زبان ہندوستان کی قومی زبان (National Language) نہ کبھی تھی اور نہ ہے۔ 22 زبانیں بشمول ہندی سرکاری زبانوں یعنی Official Languages کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تصحیح کے لیے شکریہ۔ دراصل یہاں ''ملک کی قومی سرکاری زبان ہندی'' لکھنا مقصود تھا۔ (ادارہ)

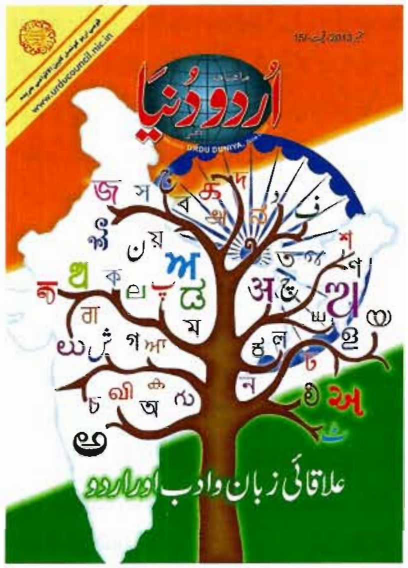

معین الدین شمسی

منجھلا ڈیہہ، گانڈے، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

ماہ ستمبر 2013 و اکتوبر 2014 کے دونوں شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ ہفت روزہ 'نشیمن' کے بانی شاہ امیر اللہ نظامی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ساجد رشید کی رحلت پڑھ کر دکھ ہوا۔ جواں سال شاعروں اور ادیبوں کی عزت افزائی اور ان کی قدردانی کرنے کا جو فیصلہ اردو کونسل ہند نے کیا ہے۔ بہرحال قابل صد ستائش ہے۔ اکتوبر 2013 کے شمارے میں شرجیل احمد کا 'اسحاق نیوٹن حیات اور کارنامے' محمد معظم الدین کا 'سرسید کی تاریخ نگاری' میں سرسید کی سب سے اہم تاریخی تصنیف 'آثار الصنادید' جس کی وجہ سے ان کا شمار مورخین کے زمرے میں ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ 1947 اور دوسرا 1854 میں شائع ہوا، کا سرورق اور سرسید احمد کی تصویر صفحہ 34 پر دیکھنے سے تعلق نہیں بلکہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ سیدہ جعفر کا 'ادب اور اساطیر' بڑا پر لطف ہے۔ حسین الحق سے شاہد اختر کی گفتگو جدید معلومات کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اردو کی نئی نسل کے لیے پیغام (1) اپنے گھروں میں بچوں کا ایک رسالہ اور اردو اخبار ضرور منگوائیے (2) انٹریا کم از کم میٹرک تک اردو ضرور پڑھائیے (3) وسیم بریلوی اور خواجہ محمد اکرام الدین کی محنتوں کی پذیرائی کیجیے وغیرہ پیغام بڑی نعمت سے کم نہیں۔ بین الاقوامی مشاعرہ و بین الاقوامی کانفرنس کے دوران مختلف مواقع پر لی گئیں تصاویر سلیقے سے رکھی گئی ہیں۔

قاضی محمد ایوب

جودھپور (راجستھان)

ماہ ستمبر 2013 کے شمارے میں کرشن چندر کے افسانے 'پشاور ایکسپریس' نے آج 66 سال بعد بھی آزادی کے دوران ظلم و بربریت کی یاد دلا دی۔ صوبہ راجستھان کا شہر جودھپور سندھ پاکستان سے ملحق ہے۔ کچھ آنکھوں دیکھے واقعات کا منظر آنکھوں میں چھا گیا۔

مظلوم مظہر

جوائنٹ سکریٹری، انجمن ترقی اردو، گریڈیہہ، جھارکھنڈ

'اردو دنیا' کے دو شمارے جولائی اور اگست 2013 ایک ساتھ موصول ہوئے۔ جولائی 2013 کے شمارے میں اردو زبان اور مذہب کے تعلق سے اور سارے مضامین بے حد کارآمد اور معلوماتی ہیں۔ چارٹرڈ اکاؤنٹس کورس اور تعلیمی اداروں میں جدید ٹیکنالوجی جیسے مضامین نئی نسل کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قرابادین میں حکیم سعید احسن نے کافی معلومات فراہم کیا ہے۔ 'غذا اور ہماری صحت' کافی کارآمد مضمون ہے۔ اگست 2013 کا سرورق دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے قائمہ کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات ایک امید افزا کوشش ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی سستی مراعات حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سمت میں بیداری مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ جاوید جمال الدین کا مضمون 'ہندوستان کی ترقی کے 66 سال' کوزہ میں دریا کے مصداق ہے۔ 'یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں' سے ملی خبروں کے مطابق عالیہ یونیورسٹی کلکتہ کے اقدام پہ رونا آیا لیکن جامعہ اردو علی گڑھ کی ڈگری پر الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ سن کر یہ جملہ زبان پہ آگیا کہ 'مایوسی کفر ہے'۔ اپنے محلے کی نیشنل اردو لائبریری میں دونوں شماروں کے کئی مضامین پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ موجود اراکین نے اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ساتھ بھرپور تعاون کے عزم کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام اور کاروان کونسل کی سنجیدہ کوششوں کو بے شمار مبارکباد!

■

اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے پروگرام

موجودہ صورت حال کے بارے میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی رپورٹ

- **مدرسوں میں معیاری تعلیم کی فراہمی کی اسکیم (ایس پی کیو ای ایم)** کے تحت سال 2012-13 کے دوران 9905 مدرسوں، 23,146 اساتذہ کو 182.49 کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔ سال 2013-14 کے دوران 2013-9-9 تک 4,806 مدرسوں اور 12,756 اساتذہ کو 61.11 کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔
- **اقلیتی ادارے کے بنیادی ڈھانچے کے فروغ (آئی ڈی ایم آئی) کی اسکیم** کے تحت سال 2012-13 کے دوران 184 اداروں کو 28.38 کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔ سال 2013-14 کے دوران 12.8.2013 تک 81 اداروں کو 11.26 کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کی گئی۔
- سروشکشا ابھیان (ایس ایس اے) کے تحت 2012-13 کے دوران 103 نئے پرائمری اسکولوں، 167 نئے اپر پرائمری اسکولوں، 50,829 فاضل کلاس رومز کی منظوری دی گئی تھی۔ اسی سال اقلیتوں کی گھنی آبادی والے اضلاع کے لیے 272 نئے پرائمری اسکولوں کی عمارتوں، 166 نئے اپر پرائمری اسکولوں کی عمارتوں اور 30,574 اساتذہ کے لیے منظوری دی گئی تھی۔ سال 2013-14 کے دوران 68 نئے پرائمری اسکول، (13) نئے اپر پرائمری اسکول اور 255 فاضل کلاس رومز کھولے گئے۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی گھنی آبادی والے اضلاع (ایم سی ڈی) میں 221 نئے پرائمری اسکولوں، 22 نئے اپر پرائمری اسکولوں، 120 اساتذہ اور 3236 ٹوائیلیٹس کی منظوری دی گئی ہے۔
- **کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ (کے جی بی وی)** کے تحت کافی اقلیتی آبادی والے اضلاع میں 555 کے جی بی وی کی منظوری دی گئی ہے۔ ان میں سے 543 کے جی بی وی کام کر رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں جن 48,967 لڑکیوں کو داخلہ دیا گیا ہے ان میں سے 8014 (16.37 فیصد) لڑکیاں مسلم ہیں۔
- **جواہر نوودے ودیالیہ (جے این وی) اسکیم** کے تحت تمل ناڈو کو چھوڑ کر سبھی اضلاع میں جے این وی قائم کیے گئے ہیں۔ اقلیتوں کی گھنی آبادی والے اضلاع میں 175 گرلز ہاسٹلوں کی منظوری دی گئی ہے۔ ان میں سے کرناٹک میں 14 ہاسٹل اور اتراکھنڈ میں 7 ہاسٹل کام کر رہے ہیں۔
- **مڈ ڈے میل** اسکیم میں مدرسوں اور مکتبوں کو بھی شامل کرنے سے بنیادی تعلیم میں داخلہ لینے والے مسلم بچوں کی تعداد 2008-09 میں 1.97 کروڑ سے بڑھ کر 2011-12 میں 2.55 کروڑ ہوگئی اور اپر پرائمری سطح پر یہ تعداد 0.43 کرڑ سے بڑھ کر 0.72 کروڑ ہوگئی۔
- سال 2012-13 اور 2013-14 کے دوران بلاک **انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچر ایجوکیشن (بی آئی ٹی ای)** نے 40 اقلیتی بلاکوں کو منظوری دی ہے۔
- خواندگی کی سطح کو اوپر اٹھانے کے مقصد سے شروع کی گئی **ساکشر بھارت** کے تحت اقلیتوں کی گھنی آبادی والے 66 اضلاع کو شامل کیا گیا ہے۔
- **راشٹریہ مادھیمک شکشا ابھیان (آر ایم ایس اے)** کے تحت اقلیتی گھنی آبادی والے اضلاع میں 890 نئے سیکنڈری اسکول منظور کیے گئے ہیں جن میں سے 461 اسکول کام کرنے لگے ہیں۔
- **ماڈل اسکول اسکیم** کے تحت 427 اقلیتی گھنی آبادی والے بلاکوں اور 37 قصبوں میں سے 186 بلاکوں اور 22 قصبوں میں ایک اسکول فی بلاک/قصبہ کی شرح سے ماڈل اسکول کی منظوری دی گئی ہے۔
- **جن شکشن سنستھان (جے ایس ایس)** غیر خواندہ، نوخواندہ کے ساتھ ساتھ اسکول چھوڑ دینے والے طلبا کو پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرانے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت 88 اہل اقلیتی گھنی آبادی والے اضلاع میں سے 33 میں جے ایس ایس قائم کیے گئے ہیں۔
- 16 اقلیتی گھنی آبادی والے اضلاع (ایم سی ڈی) میں **ماڈل ڈگری کالج** قائم کرنے کی تجاویز منظور کی گئی ہیں۔
- 57 اہل اقلیتی گھنی آبادی والے اضلاع میں سے 54 میں پالی ٹیکنیکس منظور کیے گئے ہیں۔
- 11ویں پنج سالہ منصوبے کے دوران اقلیتی گھنی آبادی والے اضلاع میں 285 **ویمنز ہاسٹلوں** کی منظوری دی گئی ہے۔
- یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (اعلیٰ تعلیمی اداروں میں برابری کو فروغ) ضابطے 2012 کے ضابطے 3 (ایف) میں ایک مساوی مواقع کا سیل (ایکول اپارچونٹی سیل) قائم کرنے اور ایک جانبداری مخالف افسر (اینٹی ڈسکریمینیشن آفیسر) کی تقرری کی شرط عائد کی گئی ہے۔
- 5 ستمبر 2013 تک **اقلیتی تعلیمی اداروں کے قومی کمیشن (این سی ایم ای آئی)** نے 8551 تعلیمی اداروں کو اقلیتی سرٹیفکیٹ جاری کیے ہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ: ارشد گوڑ)

معصوم شرقی

علقمہ شبلی

علقمہ شبلی کا شمار اردو کے اُن معتبر اور بزرگ شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنا تخلیقی سفر اردو کی روایتی شاعری سے شروع کیا اور ترقی پسندی و جدیدیت کی تحریکوں سے گزرتے ہوئے اپنی الگ راہ اختیار کی۔ اردو ادب بالخصوص شعری اردو ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر معصوم شرقی کو دیے گئے ان کے انٹرویو کے اہم اقتباس پیش ہیں۔ (ادارہ)

معصوم شرقی: کچھ اپنے اور اپنی تعلیم وغیرہ کے بارے میں قارئین کو بتائیں؟

علقمہ شبلی: میرا پورا نام ابوعلقمہ محمد شبلی نعمانی ہے، میر عیاث چک، ضلع نالندہ (سابق پٹنہ) میں ایک نومبر 1930 (سرٹیفکیٹ کے مطابق) پیدا ہوا۔ مولانا عبدالجبار (مرحوم) میرے والد تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بی کام (بہار یونیورسٹی)، بی ٹی (کلکتہ یونیورسٹی)، اور ایم اے (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی اسناد حاصل کیں۔ میرا تعلق ایک مذہبی و علمی خاندان سے ہے۔ والد، چچا اور خالو سب عالم دین تھے اور درس و تدریس سے وابستگی تھی۔ یہ مذہب پر گہری نگاہ رکھتے تھے مگر مذہب کو روشن خیالی کی ضد نہیں سمجھتے تھے۔

م ش: گھر کا ماحول کس طرح کا تھا؟

علقمہ شبلی: جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں نے ایک علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ والد محترم باضابطہ شاعر تو نہیں تھے مگر عروضی رموز و نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ گھر میں مذہبی و ادبی رسالے بھی آتے تھے جس نے شوق مطالعہ کو مہمیز کیا۔

م ش: باقاعدہ ادبی زندگی کب شروع ہوئی؟

علقمہ شبلی: یوں تو ادب سے لگاؤ اسکول میں تعلیم کے زمانے ہی سے ہوا۔ دو ایک مضامین بھی لکھے اور دوستوں کے ساتھ مصرعے پر مصرع بھی لگاتا رہا لیکن باضابطہ ادبی زندگی 1948 سے شروع ہوئی جب میں نے پہلی غزل کہی اور مشاعرے میں پڑھی۔

م ش: آپ کی کتنی کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں؟

علقمہ شبلی: شعری کتابیں آٹھ، نثری کتابیں: دو، بچوں کے لیے کتابیں: تین، درسی کتابیں: دو در جن سے زیادہ

م ش: شاعری اور نثر نگاری دونوں میں آپ کس کو فوقیت دیتے ہیں؟

علقمہ شبلی: شاعری اور نثر نگاری، دونوں کی اپنی اہمیت ہے۔ فوقیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

م ش: کون سی ادبی تحریکیں تھیں جن کا آپ نے ساتھ دیا؟

علقمہ شبلی: میرے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک عروج پر تھی۔ کچھ لوگ فیشن کے طور پر بھی اس تحریک سے وابستگی ظاہر کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی ادبی تحریک بھی چل رہی تھی۔ آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک رو بہ زوال ہوئی اور جدیدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ میں نے ہر تحریک کا بہ غور مطالعہ کیا، کبھی کبھی اس کے جلسوں میں بھی شریک ہوتا رہا لیکن عملی وابستگی کسی سے نہیں رہی۔ ہاں صحت مند اثرات کو ضرور قبول کیا۔

م ش: آپ نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تو اس کے محرکات کیا تھے؟

علقمہ شبلی: جیسا کہ میں نے عرض کیا میں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں علم و ادب کی باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی تھیں۔ ادبی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہتی تھیں اس لیے ادب سے تعلق تو بچپن ہی سے تھا۔ ہاں پہلی غزل کہنے کا محرک وہ طرحی مشاعرہ ہوا جس میں میں شریک ہوا پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

م ش: اب آپ کی شاعری کا محرک کیا ہے؟

علقمہ شبلی: انسان اپنے معاشرے میں سانس لیتا ہے، اپنے گرد و پیش کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور سماجی، معاشی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس طرح ذات و کائنات کی جستجو ہی ہر دور میں شاعری کی محرک رہی ہے۔

م ش: تخلیقی اور شعری تربیت میں کن افراد یا عناصر کا عمل دخل رہا ہے؟

علقمہ شبلی: میری تخلیقی تربیت والدین کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی مرہونِ منت ہے۔ اس میں ان ادیبوں اور شاعروں کا بھی دخل رہا ہے جنھیں میں وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی کے قدیم اور معاصر اہل قلم سب شامل ہیں۔

م ش: کن شعرا کا اثر قبول کیا؟

علقمہ شبلی: شعوری طور سے تو کسی کا اثر قبول نہیں کیا۔ غیر شعوری طور پر لینے اور دینے کا عمل جاری رہتا ہے جس کا صحیح اندازہ ہمارے ناقدین اور قارئین ہی لگا سکتے ہیں۔

م ش: کن شعرا کے اسلوب و فکر سے آپ زیادہ متاثر ہوئے؟

علقمہ شبلی: یہ کہنا بہت دشوار ہے۔ سامنے کے کچھ نام میر، غالب، مومن، جمیل مظہری اور پرویز شاہدی ہیں۔

م ش: آپ نے کسی کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی؟

علقمہ شبلی: جیسا کہ عرض کر چکا ہوں شعوری طور پر کسی کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا صحیح فیصلہ تو آپ ہی لوگ کر سکتے ہیں۔

م ش: گزشتہ چند برسوں میں غزل کن تجربوں سے ہمکنار ہوئی اور کیا اس میں نئی معنویت کو تلاش کیا جا سکا؟

علقمہ شبلی: غزل اردو کی محبوب و مرغوب صنف شاعری ہے۔ اسے ریزہ کاری اور نیم وحشی صنف سخن کا طعنہ بھی دیا گیا، اس کے باوجود یہ ہر دور میں اردو شاعری کی آبرو رہی۔ جہاں تک غزل کی ہیئت کا سوال ہے وہ متعین ہے اس میں کسی تجربے کی گنجائش نہیں۔ جب بھی اس طرح کی کوئی کوشش ہوئی، اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جہاں تک اسلوب اور طرزِ بیان کا تعلق ہے، اس میں تو ہر دور میں تجربے ہوتے رہے ہیں۔ عہدِ حاضر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کچھ تجربے یقیناً ایسے ہوئے ہیں جن سے غزل نئی معنویت سے ہم کنار ہوئی ہے۔

م ش: جدید شاعری میں نظموں کی بہ نسبت غزلوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اس کی کیا وجوہ ہو سکتی ہیں؟

علقمہ شبلی: جب ترقی پسند تحریک کا زور تھا تو نظمیں نسبتاً زیادہ لکھی جا رہی تھیں کیونکہ گفتگو عوام سے تھی، جس کا تقاضا تھا کہ باتیں کھلے ڈلے انداز میں کہی جائیں لیکن بعد میں خارج سے داخل کی طرف سفر شروع ہوا اور کائنات سے زیادہ ذات پر نگاہیں مرکوز رہیں۔ اس صورتِ حال میں اظہار خیال کے لیے غزل ہی مناسب اور موثر وسیلہ ہے کیونکہ اس میں رمز و ایما کی زیادہ گنجائش ہے اور دلی جذبات و احساسات کا اظہار، اشارات و استعارات میں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری میں غزلوں

پر زیادہ توجہ دی گئی اور ان کو موثر وسیلۂ اظہار سمجھا گیا۔

م ش: ابلاغ کا مسئلہ آج جدید ادب میں تنازع کا سبب بنا ہوا ہے۔ اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

علقمہ شبلی: ترقی پسندی کے بعد جب اردو میں جدیدیت کا رجحان سامنے آیا تو آزادیٔ تحریر کی باتیں زیادہ ہونے لگیں۔ ہر فرد اپنی سوچ کو اپنے انداز میں ظاہر کرنے پر زور دینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شاعر یا ہر ادیب اپنی اصطلاحیں خود وضع کرنے لگا اور اس طرح قاری و قلم کار میں رشتہ استوار نہیں رہا اور ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ سامنے آیا، لیکن بہت دنوں تک یہ صورت حال نہیں رہی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ابلاغ یا ترسیل اضافی الفاظ ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر ادب پارے کے مفہوم کی ترسیل ہر شخص تک ایک ہی انداز اور ایک ہی طرز سے ہو۔ علم و فہم اور بصارت و بصیرت کے فرق سے معنویت تک پہنچنے میں بھی یقیناً فرق ہوگا۔ جو ادب پارہ تہہ دار ہوتا ہے اس کی مختلف تہیں ہوتی ہیں اور ہر تہہ تک ہر قاری پہنچ جائے ایسا ممکن نہیں ہے۔

م ش: کیا قلم کے ذریعے معاشرے کی اصلاح ممکن ہے؟

علقمہ شبلی: قلم کار کا منصب مصلح یا پیغامبر کا نہیں ہے۔ وہ اصلاح کے مقصد سے تخلیق ادب نہیں کرتا۔ وہ اپنے اندرونی جذبے کے اظہار اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے تخلیق ادب کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے اس تجربے میں شریک ہوتے ہیں اور اس سے اثر قبول کرتے ہیں اور اس طرح اصلاحِ معاشرہ کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

م ش: کیا بحیثیت شاعر و ادیب موجودہ عہد کی صورتِ حال سے مطمئن ہیں؟

علقمہ شبلی: ادیب و شاعر کبھی صورت حال سے مطمئن نہیں ہوتا۔ 'اطمینان' شعر و ادب کے لیے پیغام اجل ہے۔ 'کوشش ناتمام' ہی سے زندگی رواں دواں ہے اور یہی شاعر و ادیب کو مہمیز کرتی رہتی ہے، جس سے اس کے فن میں تنوع، حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔

م ش: آپ کے خیال میں بڑے شاعر کی پہچان کیا ہے؟

علقمہ شبلی: میرے خیال میں شاعر کے ساتھ بڑے اور چھوٹے کا سابقہ لگانا ہی صحیح نہیں ہے۔ شاعری جنس تجارت نہیں، جسے ترازو پر رکھ کر تولا جاسکے۔ شاعر کا مطالعہ، مشاہدہ، وسعت نظری، فن کے رموز و نکات سے واقفیت، معائب و محاسن کا ادراک اور ذاتی تجربات کو آفاقی تجربات سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر اسے رفعت و عظمت سے ہم کنار کرتے ہیں۔

م ش: شعر کہتے وقت کیا کیفیت ہوتی ہے آپ کی؟

علقمہ شبلی: شعر کہتے وقت کوئی غیر معمولی کیفیت نہیں ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ وہ انہماک اور یک سوئی رہے، جس کے بغیر عبادت عبادت نہیں ہوتی۔

م ش: غزل یا نظم کہتے وقت آپ کو کسی خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے؟

علقمہ شبلی: نہیں۔ طبیعت کا میلان اگر شعر گوئی کی طرف ہوتا ہے تو پھر اس کے لیے کسی ماحول کی قید نہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو کوئی مصرع ذہن میں آجاتا ہے بشرط پسندیدگی کچھ اشعار اسی وقت ہوجاتے ہیں۔ صبح کے وقت یادداشت سے نقل کرلیتا ہوں اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو اسی وقت دو چار شعر کا اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔

م ش: آپ کا خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا کوئی پروگرام ہے؟

علقمہ شبلی: چاہتا تو ہوں کہ زندگی کی یادداشتوں کو قلم بند کرلوں مگر مکروہات زمانہ سے فرصت نہیں ملتی۔ اگر وقت نے اجازت دی تو ممکن ہے یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ ویسے اور بھی کام ہیں جن کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملتا۔

م ش: آپ کے نزدیک شاعری میں Commitment کی کیا اہمیت ہے؟

علقمہ شبلی: Commitment سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر اس کا مطلب کسی خاص نظریے کی پابندی یا کسی خاص جماعت سے وابستگی ہے تو شاعری کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ ہاں ہر شخص کا زندگی میں ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ تخلیق ادب میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے شاعری عظمت اور استحکام سے ہم کنار ہوتی ہے۔

م ش: آپ شاعری میں کن موضوعات کو اہمیت دیتے ہیں؟

علقمہ شبلی: ذات و کائنات کا کوئی پہلو میرے لیے شجر ممنوعہ نہیں۔ بذات خود کوئی موضوع اہم یا غیر اہم نہیں ہوتا۔ شاعری کا شاعرانہ رویہ، طرز اظہار، اسلوب اور پیش کش موضوع کی اہمیت کے ضامن ہیں۔

م ش: انڈو پاک کے چند ایسے شعرا کے نام بتائیں جنھیں آپ پسند کرتے ہیں؟

علقمہ شبلی: پسندیدگی و ناپسندیدگی بالکل ذاتی ہوا کرتی ہیں۔ اس سے ہر ایک کا اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے اور اس سے کسی کی شاعرانہ قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہوتا اس لیے نام گنانے سے کیا حاصل؟

م ش: آپ کے بعد جو لکھنے والے آئے ہیں، کیا آپ ان سے پر امید ہیں؟

علقمہ شبلی: میں اپنے بعد آنے والے اہل قلم سے بہت پر امید ہوں اور میں ان کی تخلیقات کا مطالعہ بھی کرتا رہتا ہوں۔ ان میں ذہانت بھی ہے اور تخلیقی صلاحیت بھی۔ زمان و مکان پر ان کی گرفت بھی ہے اور بدلتے ہوئے حالات کا ادراک بھی۔ اگر یہ مطالعہ و مشاہدہ اور مشق و مزاولت پر توجہ دیں اور سہل پسندی سے کام نہ لے کر سنبھل سنبھل کر قدم بڑھائیں تو یہ دور تک جاسکتے ہیں اور دیر تک راہِ ادب کو روشن رکھ سکتے ہیں۔

م ش: آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عہد میں اردو کہاں کھڑی ہے؟

علقمہ شبلی: اس عہد میں اردو دوسری زبانوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی ایجاد و ارتقا نے جس طرح دوسری زبانوں کو متاثر کیا ہے، اُسی طرح اردو پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ آج زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے، اسے سنوارنے اور سنبھالنے کے بعد فرصت بہت کم ملتی ہے اس لیے کتابوں (خصوصاً ادبی) کا مطالعہ پس پشت پڑ گیا ہے اس کے باوجود کتابوں کی اپنی اہمیت ہے اور یہ آئندہ بھی برقرار رہے گی۔

م ش: آپ کو اپنی کون سی تخلیق سب سے اچھی لگتی ہے؟

علقمہ شبلی: جس طرح والدین کو اپنی ایک اولاد کو دوسری پر ترجیح دینا بہت مشکل ہوتا ہے ٹھیک یہی حال تخلیق کار کا بھی ہے۔ اسے اپنی ہر تخلیق عزیز ہوتی ہے۔ کسی پر 'سب سے اچھی' کا لیبل لگانا غیر فطری ہے۔ اس کا فیصلہ تو قارئین اور ناقدین کو کرنا ہے۔

م ش: اپنے ہم عصر ادبا و شعرا کو ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

علقمہ شبلی: ہم عصر کا لفظ بڑا پرفریب ہے۔ اس میں وہ ادیب اور شاعر بھی شامل ہے جن کی طبعی اور تخلیقی عمر بھی ہم سے زیادہ ہے لیکن ایک ہی عہد میں ساتھ ساتھ تخلیقی سفر جاری رہا۔ ایسے بزرگ ہم عصر شعرا اور ادبا میں ل احمد اکبرآبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، جرم محمد آبادی، رضا مظہری، عبدالرؤف، سالک لکھنوی، نواب دہلوی، ابراہیم ہوش، حرمت الاکرام، ناظر الحسینی، مظفر حیدری اور احسان دربھنگوی کے نام یاد آرہے ہیں، ہم عمر معاصرین کی فہرست میں مظہر امام، جاوید نہال، ظفر اوگانوی، مظفر حنفی، اعزاز افضل، رونق نعیم، قیصر شمیم، ناظم سلطان پوری، حشم الرمضان، حامی گورکھپوری، شاہین بدر، شہزاد منظر، وکیل اختر اور اویس احمد دوراں شامل ہیں۔ ان تمام قلم کاروں سے کم و بیش میرے تعلقات رہے۔ مشاعروں، ادبی نشستوں اور دوسری تقریبات میں بھی ایک ساتھ شریک ہوتے رہے۔ میرے ان معاصرین کی تعداد بھی کم نہیں، جن کا تخلیقی سفر میرے بعد شروع ہوا اور جو ابھی تازہ دم ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔

■

Dr. Masoom Sharqi, 63/2, Barai Para, P.O.: R.L.B Lane, 24 Pgs (N) - 743194

عبدالواسع

اردو اور ہندی
قربتیں اور فاصلے

ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جس حسین ترین لسانی تخلیق کو ہم اردو، ہندی اور ہندوستانی کے نام سے جانتے ہیں، وہ آج بھی جنوبی ایشیائی خطے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ رسم خط اور لفظیات کو بنیا دبنا کر اگرچہ اس زبان کی تقسیم برسوں پہلے ہندی اور اردو کے نام سے عمل میں آ چکی ہے اور آج دونوں زبانیں تحریری، ادبی اور تخلیقی لحاظ سے اپنا الگ وجود اور الگ شناخت رکھتی ہیں۔ لیکن عوامی سطح پر انہیں ایک ہی زبان کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کا عمل بھی اس تقسیم کے بلوجود جاری رہا ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس عمل کو گہرا دھکّا لگا اور دونوں زبانوں میں دوریاں تقریباً ہر سطح پر بڑھنے لگی تھیں لیکن جیسے جیسے فاصلوں کی گرد نیچے بیٹھتی گئی دونوں زبانوں کے بدلتے ہوئے خدو خال زیادہ بھتر طور سے ایک دوسرے پر واضح ہوتے گئے۔ اس دوران ان زبانوں نے تخلیقی رجحان اور بول چال کی سطحوں پر جو کچھ اخذ کیا تھا اسے ایک دوسرے سے بانٹنے کے عمل کی نہ صرف تجدید ہوئی بلکه نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور کمپیوٹرائزیشن کے زیر اثر نشرو اشاعت کی بھتر سھولتیں سامنے آنے سے اس عمل میں تیزی بھی آئی۔ لیکن اس میں کوئی شک نھیں که ملک میں اردو اور ہندی کو ایک بار پھر قریب لانے کے اس عمل میں سب سے اہم کردار اردو کے مشاعروں، غزل گائیکی کی محفلوں اور ٹیلی ویژن و ایف ایم ریڈیو نے ادا کیاہے۔ اس بار ہم کور اسٹوری میں اردو اور ہندی کے مضبوط مگر حساس اور نازک رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ جھاں اس میں لسانی معاملات میں دخل رکھنے والے قلم کار دونوں زبانوں کے ارتقائی رشتوں کو ٹٹول رہے ہیں وہیں عبدل بسم الله، سلام بن رزاق اور مشرف عالم ذوقی جیسے تخلیق کاروں نے ادبی اور تخلیقی سطح پر ان رشتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ادارہ

زبان ذریعہ اظہار ہے۔ گریرسن کے مطابق ہندوستان میں 179 زبانیں اور 544 بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے جہاں طرح طرح کی بولیاں اورقسم قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں وہ زبانیں بھی شامل ہیں جو کسی محدود علاقے میں بولی جاتی ہیں اور وہ بھی جو ملک کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک عرصے تک ہندوستان کی ادبی، ثقافتی اور مذہبی زبان سنسکرت تھی۔ اس میں مذہبیات، صنمیات اور ادبیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے مگر وہ زوال پذیر ہوگئی اور اس کی جگہ پالی پراکرتوں نے لے لی اور پالی پراکرتوں کی جگہ اَپ بھرنشوں نے لے لی۔ اپ بھرنشوں کے بطن سے متعدد ہند آریائی زبانیں وجود پذیر ہوئیں ۔ اردو اور ہندی زبانوں کے علاوہ باگھلی، چھتیس گڑھی، اودھی، بنگالی، آسامی، اڑیا، بھوجپوری، میتھلی، مگھی، بندیلی، برج، قنوجی، ہریانوی، پنجابی، گجراتی اور مراٹھی زبانیں فروغ پانے میں کامیاب ہوئیں۔ ان میں وہ زبانیں بھی شامل ہیں جو کسی محدود علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور وہ بھی جو ملک کے طول وعرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اردو اور ہندی ایسی ہی زبانیں ہیں جو ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

نہ صرف یہ کہ اردو اور ہندی زبانوں کا حلقہ اثر ایک ہے بلکہ ان کی آفرینش اور ترویج وترقی ایک ہی علاقے میں ہوئی ہے۔ اس وجہ سے یہ زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ کرتی رہی ہیں۔ ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے اور ایک دوسرے سے متاثر ہوئی ہیں۔ ان میں ملنے والی مماثلتوں کے پیش نظر انھیں سگی بہنیں بھی قرار دیا جاتا رہا ہے بلکہ سرسید نے تو انھیں ایک حسین دوشیزہ کی دوخوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ ہندی کی ترقی میں اردو کی ترقی مضمر ہے۔ مگر تقسیم وطن کے بعد کے تیس چالیس برس اردو کے لیے بہت مشکل کے تھے۔ بعض ریاستوں کے اسکول کے نصاب سے اردو کو نکال دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں کی اردو بولنے والی دو نسلیں اردو رسم الخط سے نابلد رہ گئیں۔ وہ لوگ کاروبار زندگی تو اردو زبان میں کرتے تھے مگر لکھنے کی بات آتی تو اردو رسم الخط سے ناآشنا ہونے کا رونا روتے

تھے۔ خیر ادبار کا وہ موسم گزر گیا اور اردو اپنی تمام تر دلکشی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے بولنے والوں کے دل پر راج کر رہی ہے۔

زبان کی سیاست کرنے والوں نے اردو اور ہندی زبانوں میں دوری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہتوں نے اس کو غیرملکی زبان قرار دیا اور تقسیم ملک کے اسباب میں ایک سبب بتایا مگر لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی نہ صرف یہ کہ ایک خاندان کی زبانیں ہیں بلکہ ان میں بہت مماثلتیں ہیں۔ رسم الخط کے فرق کو نظرانداز کردیں تو دونوں زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ ان کا آغاز، ان کی پرورش و پرداخت سب ایک سرزمین، ایک ماحول اور ایک فضا میں ہوئی ہے۔ ہردو زبانوں کی تاریخ دراصل ہندوستان کے ہزار سالہ دور کی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ ہے۔ اسی وجہ سے عام بول چال میں یہ زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں اور ہندوی، ہندی اور ہندوستانی کے ناموں سے جانی جاتی تھیں۔ ہندی، ہندوی اور ہندوستانی جیسی اصطلاحوں میں دراصل اردو اور ہندی زبانوں کے لسانی ارتقا کی تاریخ پوشیدہ ہے اور یہ ایک الگ مبحث ہے۔ فی الوقت میں اردو اور ہندی زبانوں کے روزمرہ، محاوروں اور گرامر کے پس منظر میں دونوں زبانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان زبانوں میں پائی جانے والی مماثلتوں اور مغائرتوں کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں اور یہ تجزیہ خالص لسانی بنیادوں پر کرنا چاہتا ہوں اس لیے اس مبحث سے قطع نظر کرتا ہوں:

زبان کی سیاست کرنے والوں نے اردو اور ہندی زبانوں میں دوری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہتوں نے اس کو غیرملکی زبان قرار دیا اور تقسیم ملک کے اسباب میں ایک سبب بتایا مگر لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی نہ صرف یہ کہ ایک خاندان کی زبانیں ہیں بلکہ ان میں بہت مماثلتیں ہیں۔ رسم الخط کے فرق کو نظرانداز کردیں تو دونوں زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں۔ ان کا آغاز، ان کی پرورش و پرداخت سب ایک سرزمین، ایک ماحول اور ایک فضا میں ہوئی ہے۔ ہردو زبانوں کی تاریخ دراصل ہندوستان کے ہزار سالہ دور کی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ ہے۔ اسی وجہ سے عام بول چال میں یہ زبانیں ایک جیسی لگتی ہیں اور ہندوی، ہندی اور ہندوستانی کے ناموں سے جانی جاتی تھیں۔ ہندی، ہندوی اور ہندوستانی جیسی اصطلاحوں میں دراصل اردو اور ہندی زبانوں کے لسانی ارتقا کی تاریخ پوشیدہ ہے اور یہ ایک الگ مبحث ہے

(1) **مماثلتیں**: (i) ہندی اور اردو زبانوں کے مصمتے، مصوتے، حروف، افعال، ضمائر، جمع بنانے کا قاعدہ، علامت فاعلی اور مفعولی، الفاظ، محاورے، ضرب الامثال (بڑی تعداد میں) ایک ہیں۔ میں نے سامنے پڑے فیروزاللغات میں 'س اور الف' سے تشکیل پانے والے الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس مد میں کل 520 الفاظ ہیں جن میں انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہیں مگر ہندی کی مد سے وضع ہونے والے الفاظ کی تعداد 225 ہے گویا آدھے الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال ہندی الاصل ہیں مثلاً سات، سات پھیرے، سات سمندر، ساتھ دینا، ساتھ چھوٹنا، ساٹھا پاٹھا، سارا گھر سر پر اٹھا لینا، ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف، ساڑھو، ساس چھوٹی بہو بڑی وغیرہ۔

(ii) اردو نے ہندی کی چودہ آوازوں ٹ، ڈ، ڑ، پھ، بھ، تھ، دھ، ڈھ، ٹھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ڑھ، کو من و عن اپنا لیا ہے۔ ان کے علاوہ سھ، مھ، نھ، اور رھ بھی ہیں جن کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

(iii) اردو کے تمام ضمائر (غائب، حاضر، متکلم) سنسکرت اور پراکرت سے ماخوذ ہیں اور ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مقبول ہیں۔ مثلاً تم، وہ، میں وغیرہ۔

(iv) ضمائر کی طرح اردو کے تمام افعال ہندی الاصل ہیں۔ مثلاً آنا، جانا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، دوڑنا، بھاگنا وغیرہ۔

(v) حروف۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بہت سے حروف ایک ہیں۔ مثلاً کو، تک، پر، میں، گر، مگر، کیونکہ، لیکن وغیرہ۔

(vi) اردو میں جمع بنانے کا وہی قاعدہ ہے جو ہندی میں ہے یعنی مفرد الفاظ کے آخر میں 'وں' یا 'ی ں' جوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً مردوں، لڑکوں، عورتیں، عورتوں، لڑکیوں، چڑیوں وغیرہ۔

(vii) اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں علامت فاعلی 'نے' یکساں طور پر استعمال میں ہے۔

(viii) اردو میں عربی و فارسی الفاظ میں ہندی سابقے جوڑ کر مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں جن کا استعمال اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً گھوس خور، چور دروازہ، چورتالہ، ست خصمی، ست منزلہ، گھوڑسوار، دھوکے باز وغیرہ۔

(ix) اردو میں عربی و فارسی الفاظ پر ہندی لاحقے لگا کر مرکب الفاظ بنا لیتے ہیں اور ہندی و اردو دونوں زبانوں میں مقبول و مستعمل ہیں۔ مثلاً پاسبان، نگہبان، گلاب جامن، سبزی منڈی وغیرہ۔

(x) اردو اور ہندی زبانوں میں بہت سے کلمے، فقرے، ترکیبیں، عام استعمال میں ہیں اور بغیر کسی پس و پیش کے دونوں زبانوں میں مروج و مقبول خاص و عام ہیں جن کی طرف اشارہ ابتدا میں کیا گیا ہے۔

(2) **مغائرتیں**: اردو اور ہندی زبانوں میں بعض مغائرتیں بھی ہیں جو ایک کو دوسری سے جدا کرتی ہیں۔ بول چال اور عام استعمال میں یہ زبانیں اگرچہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں مگر ادبی سطح پر ان کے چولے بدلنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو عربی، فارسی الفاظ، مصطلحات، تراکیب، محاوروں اور تشبیہات سے مزین ہونے لگتی ہے جب کہ ہندی ان کاموں کے لیے سنسکرت سے اخذ و استفادہ کرتی ہے اور اس سے عربی فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے تت سم الفاظ کا استعمال ہونے لگتا ہے اور دونوں زبانوں میں ایک وسیع خلیج حائل ہوجاتی ہے جس کے ایک کنارے پر اردو ہے اور دوسرے کنارے پر ہندی۔ یہی وہ مقام ہے جب زبانوں کی سیاست کرنے والے اپنے فائدے کے لیے ان کے مابین دوری کی خلیج کو وسیع تر کرنے میں سرگرم ہوجاتے ہیں:

(i) اردو اور ہندی زبانوں میں سب سے بنیادی فرق یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط فارسی سے ماخوذ ہے البتہ اردو نے فارسی اور عربی زبانوں میں ملنے والی آوازوں پر ہندی

زبان کی چودہ آوازوں کو اپنا لیا ہے مگر رسم الخط کا فرق بنیادی ہے اور اسی وجہ سے اردو کے مخالفین اس پر غیر ملکی زبان ہونے کا الزام تراشتے رہتے ہیں جب کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس نے ہندوستان میں آنکھیں کھولی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اوقات اردو کے شعرا و ادبا بھی اردو کے رسم الخط کے بدلنے کی وکالت کرتے رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں فراق گورکھپوری جیسا بڑا شاعر جو ساری زندگی اردو کے حق میں جنگ کرتے رہے تھے آخر کے دنوں میں اردو رسم الخط کے بدلنے کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اردو میں املا اور تلفظ کی پیچیدگیاں بہت ہیں۔ اسی لیے بعض اردو کے حامی بھی اس کو سہل کرنے کی سفارش کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک آواز کے لیے کئی کئی آوازیں ہیں اور ان کے املا نیز تلفظ میں نمایاں فرق ہے۔ اردو سیکھنے والا اس کو اپنے لیے بہت کٹھن خیال کرتا ہے۔ لیکن غور کرنے والی بات یہ ہے کہ رسم الخط لباس نہیں ہے۔ جو آسانی سے بدل دیں۔

یہاں یہ بات عرض کرنی بھی ضروری ہے کہ ایک عرصہ دراز سے اردو کو ہندی زبان کی شیلی کہنے پر اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ اجودھیا پرساد کھتری نے ہندی کے کئی شیلیوں کا ذکر کیا ہے اور اردو کو انھیں میں ایک شیلی قرار دیا ہے۔ دراصل اجودھیا پرساد کھتری ہندی کو سارے ہندوستان کی زبان بنانے پر تلے تھے۔ اس لیے وہ میتھلی، بھوجپوری وغیرہ کو ہندی کی شیلی قرار دے کر ان زبانوں کو ہندی میں ضم کرنا چاہتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ آج بھوجپوری اور میتھلی زبانیں الگ زبانوں کا درجہ پانے کی کوشش میں لگی ہیں۔ یہ بات بھی بے محل نہیں ہے کہ آج ہندی لکھنے والے اردو کے بیشتر الفاظ کو اپنا رہے ہیں اور ان کا استعمال دھڑلے سے کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہندی سے الگ اردو کی شناخت صرف اور صرف اس کے رسم الخط سے ہے۔ اس لیے اردو زبان جس رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے وہی بھلی ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی اس کے مزاج اور اس کے بنت کو نیست و نابود کر کے چھوڑے گی۔

(ii) اردو میں ہندی الاصل آوازوں کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں کی آوازیں بھی ہیں۔ ان کی تعداد چھ ہے یعنی خ، ز، ژ، غ، ف، ق۔ ان کے علاوہ ض، ظ، ذ، ث، ص ح، ھ اور ط کی آوازیں الگ ہیں جنھیں پروفیسر مسعود حسن خاں زائد حروف کا نام دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ آوازیں مردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسم خط نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔

(iii) ہندی کے علاوہ اردو زبان عربی اور فارسی زبانوں سے بہت متاثر رہی ہے اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں عربی، فارسی زبانوں یا ان کے اشتراک سے تشکیل پانے والے الفاظ کی ایک کثیر تعداد اردو میں ہے پھر بھی یہ ہندی الاصل الفاظ کے مقابلے میں کم ہے۔ اردو میں مستعمل عربی اور فارسی زبانوں کے مفید الفاظ کی بڑی تعداد 'اسما' پر مشتمل ہے۔ یہ الفاظ مذہب، ملکی نظم اور نسق، جنگ و حرب، کھانے پینے کی چیزیں، ملبوسات، اعضائے بدن، امراض اور علاج معالجہ، فنون لطیفہ، ادبیات اور جمالیات سے متعلق ہیں جو ہندی میں ناپید ہیں۔ اگر ہیں بھی تو دال میں نمک کے برابر ہیں۔ مثلاً خدا، رسول، حاکم، عدالت، انصاف، فرمان، تخت، تاج، وزیر، سلطنت، سزا، قید، امیر، حرم، لشکر، یورش، تیر، تفنگ، آب، گندم، نان، شکر وغیرہ۔

(iv) ہندی قاعدے سے جمع بنانے کے علاوہ اردو میں عربی و فارسی قاعدے سے بھی جمع بناتے ہیں۔ جیسے کتاب سے کتب، علم سے علوم، صنف سے اصناف، مذہب سے مذاہب، نبی سے انبیا، ترکیب سے تراکیب، تاجر سے تجار، صفت سے صفات، عیب سے عیوب، حد سے حدود، کتب سے کتابہا، در سے درہا، صد سے صدہا، شجر سے شجرہا، مگر ہندی میں یہ صورت مفقود ہے۔

(v) اردو میں عربی و فارسی حروف ربط کا استعمال ہوتا ہے جب کہ ہندی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اردو میں ملنے والے عربی و فارسی زبانوں کے حروف ربط ہیں از، تا، بر، عند، بہ، در، زیر، پس، اندرون، علیٰ، فی، من (من حیث القوم) وغیرہ ان حروف ربط سے بے شمار الفاظ بنائے جاتے ہیں۔

(vi) کلمے، فقرے، محاورے، ترکیبیں اور ضرب الامثال: اردو میں عربی اور فارسی زبانوں کے بے شمار کلمے، فقرے، محاورے، ترکیبیں اور ضرب الامثال عام استعمال میں ہیں۔ مثلاً آب آید تیمم برخاست، آزمودہ را آزمودن جہل است۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ آمدم برسر مطلب۔ استغفراللہ، اظہر من الشّمس، الحمدللہ، ان شاء اللہ، بارک اللہ، بسم اللہ، فبہا، سبحان اللہ، ماشاء اللہ وغیرہ۔ ان کے استعمال سے اردو کی خوبصورتی میں چار چاند لگتے ہیں اور کبھی بہت سی باتیں جن کو بیان کرنے کے لیے بہت زیادہ شرح و بسط کی ضرورت ہوتی۔ ان کلموں، محاوروں، ترکیبوں اور ضرب الامثال کی مدد سے مختصراً بیان کر دیے جاتے ہیں مگر یہ سہولت ہندی زبان میں نہیں ہے۔ ان دنوں جب ہندی زبان میں بیش از بیش اردو الفاظ کو سمونے کی کوشش ہو رہی ہے تو آئندہ ان کا استعمال ہندی میں ہونے لگے تو ہونے لگے مگر وہ اپنی اصلی شکل اور معنی میں مستعمل ہوں گے کہنا مشکل ہے۔

(vii) ہندی زبان میں عربی اور فارسی زبانوں کے جو الفاظ داخل ہو گئے ہیں یا داخل کیے جا رہے ہیں ان کا تلفظ بدل جاتا ہے۔ اکثر حالتوں میں ز، ذ، ظ کی آوازوں کو ج کی آواز میں بدل دیتے ہیں یا پھر اس کے برعکس ج کی آواز کی جگہ ز یا ذ کی آواز نکالتے ہیں۔ مثلاً مزاج کے بدلے مجاج، مزار کے بدلے مجار اور جلیل کی جگہ ذلیل بولتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت مضحکہ خیز صورت پیدا ہوتی ہے۔ میرے ایک بزرگ استاد جو ہندی کے پروفیسر تھے۔ پدم شری کے اعزاز سے نوازے گئے تھے اور وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے اکثر اردو الفاظ کا استعمال کرنا چاہتے تھے اور کوا پیڑ پر بیٹھا ہے' بولنے کے بجائے' 'قوا پیڑ پر بیٹھا' ہے بولا کرتے تھے۔

(viii) ہندی میں بہت سے عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ کا استعمال ان معنوں میں نہیں کیا جاتا جن معنوں میں وہ الفاظ اردو میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً 'خلافت' کو 'مخالفت' کے معنی میں بولتے ہیں۔ اسی طرح 'بغلگیر' کا مطلب 'پڑوسی' بتاتے ہیں۔

اردو اور ہندی زبانوں کا لسانیاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ پیش کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر دو زبانیں اَپ بھرنشوں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ ان کا آغاز اور ارتقا ایک ہی مٹی اور آب و ہوا میں ہوا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتی رہی ہیں اور آپس میں بیر نہیں رکھتیں۔ سارے ہندوستان میں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور اپنا دامن کشادہ رکھتی ہیں۔ دوسری زبانوں، ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ و اصطلاحات کو اپنے اندر جذب کرنے میں پیچھے نہیں ہٹتی ہیں مگر زبان کی سیاست کرنے والوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا ہے اور اس طرح ان زبانوں کی نشو و نما اور ترقی و ترویج میں مشکلات کھڑی کر رہے ہیں۔ اگر سیاست سے الگ ہو کر دونوں زبانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے تو ان میں بہت قوت نمو ہے اور ان میں شعر و ادب، علم و فن اور فکر و فلسفہ کے نئے نئے شگوفے پھوٹ سکتے ہیں۔ اس لیے زبان کی سیاست کرنے والوں سے میری گزارش ہے کہ انھیں قدرتی ماحول میں پروان چڑھنے کا موقع دیں اور ان کی راہوں میں کانٹے نہ بچھائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

■

Prof. Abdul Wasey, Karar ki Bari, Chandwara,
At Z.P.O. Muzaffarpur - 842001 (Bihar)

عبدالحی

اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ

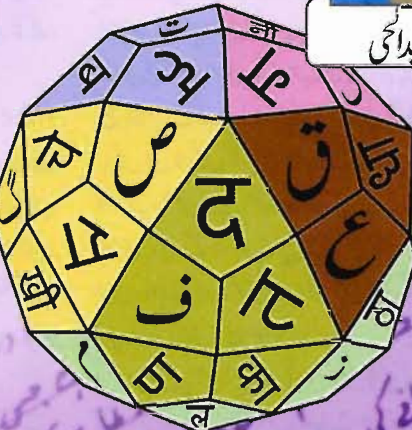

اردو اور ہندی میں آغاز سے ہی ایک ایسا لسانی رشتہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے بنی اور ایک دوسرے کی مدد سے ہی پھلی پھولی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو زبان کا آغاز ہندی والوں کے ذریعے ہوا تھا۔ لیکن جدید لسانی مطالعات میں اسے ایک کلیہ نہیں مانا گیا ہے۔

ماہرین لسانیات کے مطابق ہندوستان میں عہد قدیم میں جب آریاؤں کا آنا ہوا تو اس وقت یہاں سنسکرت کا بول بالا تھا لیکن بعد میں سنسکرت اور دیگر زبانوں کے اختلاط سے پراکرت کا جنم ہوا جسے یہاں کے لوگ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک بولتے رہے۔ راجا بکرماجیت نے سنسکرت کو دوبارہ سرکاری زبان بنایا لیکن عوام الناس کی زبان پراکرت ہی رہی۔ اپ بھرنش پراکرت زبانوں کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے جو بعد میں برج بھاشا کہلائی۔

محققین کے مطابق مغلوں کے زمانے میں پہلی دفعہ اردو کا لفظ رائج ہوا۔ بابر نے اپنی فوج کے لیے بھی لفظ اردو کا استعمال کیا تھا۔

جارج گریرسن نے اپنی کتاب 'لسانیاتی جائزہ ہند' میں یہ بات واضح طور پر کہی ہے کہ کھڑی بولی کے دو روپ ہیں، ایک میں عربی فارسی زبان کا اثر ہے تو دوسرے میں سنسکرت کا اثر ہے۔ پہلے روپ کو اردو سے جانا جاتا ہے اور دوسرے کو ہندی سے۔ ان دونوں کو ملا کر ایک نام ہندوستانی دیا گیا۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد دونوں کے لسانی اختلاط سے زبان کا ارتقا ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں عام طور سے فارسی، عربی اور بھاشا جان گئیں۔ بھاشا سے مراد وہ زبان ہے جس پر فارسی عربی یا کسی غیر ملکی زبان کا اثر نہیں کے برابر تھا۔ ہندوؤں نے فارسی میں اور مسلمانوں نے ہندی میں کتابیں لکھیں اور وہ آج تک محفوظ ہیں۔ گرونانک صاحب، گروکبیر داس کے کلام آج بھی محفوظ ہیں۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں، ملک محمد جائسی، غواصی، وغیرہ کی تصنیفات اس بات کی گواہ ہیں۔ آگے چل کر یہی ملی جلی زبان دو حصوں اردو اور ہندی میں تقسیم ہوگئی۔ آج لوگ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور اس بات پر تعجب ہے کہ اس زبان کی اصل تو وہی بھاشا ہے جس سے اردو اور ہندی کا جنم ہوا تھا۔ امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بھاشا میں کلام تصنیف فرمایا۔ امیر خسرو کے بعد ملک محمد جائسی قابل اور صوفی شاعر تھے۔ ان کی بے نظیر تصنیف 'پدماوت' اب تک موجود ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ایک شاعر شیخ شاہ محمد بلگرامی تھے۔ ان کا ایک شعر پیش ہے:

کم درگ دھری سنار من آیو بھایو نہیں

''کیوں تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی ہے اے نازنیں۔
کیا میرا آنا پسند نہیں ہوا۔''

عہدِ جہانگیری میں راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار جہانگیری میں پیش کیا جس نے اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی۔ جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا اور پھر ان اشعار کا ترجمہ فارسی میں کیا گیا تھا۔ ہندی زبان سے مسلمانوں کو اس قدر پیار تھا کہ بعض کو کئی کتابیں حفظ تھیں۔ مولانا سید نظام الدین بلگرامی سنسکرت اور بھاشا کے بہت بڑے عالم تھے۔ غرض یہ کہ اردو اور ہندی مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان تھی اور عہدِ قدیم میں جو شاعری ہوئی تھی وہ زبان بھاشا تھی اور وہی زبان آگے چل کر اردو کہلائی۔

ولی کا دیوان جب شمالی ہندوستان میں پہنچا تھا تو لوگوں میں جیسے حشر برپا ہوگیا تھا اور ایک نئی زبان کا آغاز شمالی ہندوستان میں بھی ہونے لگا تھا اس سے پہلے دکن میں قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، سراج، مصحفی وغیر قابل ذکر ہیں جن کے اشعار اور جن کی تصنیفات آج بھی اردو زبان وادب کا قیمتی خزانہ ہیں اور ان تصنیفات میں ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ قدیم اردو اور ہندی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھیں۔ ان شعرا کی شاعری میں ہندی الفاظ کی بھرمار ہے۔ مثال کے طور پر قلی قطب شاہ کا یہ شعر:

پیاری نہ کرنوں سجن مسوں ستم
جو جاگی جوانی تو پھر ہوگی خم

اسی طرح سے سراج کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

سب جگت ڈھونڈ پھرا یار پایا لیکن
دل کے گوشہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

اس سے پہلے ولی نے تو ہندی کے بہت زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جیسے کہاں ہے گلبدن موہن پیارا۔

اس وقت کی نثر کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ نثر میں بھی

یسے ہی الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ اس دور کی ملا وجہی کی کتاب 'سب رس' میں بھی ایسے ہی ملے جلے اسلوب کا استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب میں داتا، سوگنوا، نیہں، راگ وغیرہ الفاظ ملتے ہیں جو کہ اردو میں بھی استعمال ہونے لگے تھے۔

جب ملک تقسیم ہوا تو اردو اور ہندی کے اختلاط پر بھی ضرب پڑی۔ ڈاکٹر اودے نرائن تیواری کے مطابق گریرسن کی ہندوستانی کوئی زبان نہیں بلکہ یہ آسان اور سہل ہندی ہے۔ وہ کھڑی بولی کو بھی ناگری ہندی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق کھڑی بولی شورسینی اَپ بھرنش سے ارتقا پاتی ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق شورسینی اپ بھرنش (وہ اپ بھرنش جو دہلی، پنجاب اور شمالی ہند کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی تھی) بعد میں اس اپ بھرنش سے کھڑی بولی کی پیدائش ہوتی ہے جو اردو اور ہندی کا مخرج کہلائی۔ شورسینی اپ بھرنش سے ہی ہریانوی، قنوجی، بندیلی اور برج بھاشا زبانیں نکلتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ہندی بولیوں میں برج بھاشا کو ادبی زبان کی حیثیت حاصل تھی اور کھڑی بولی کو اس لائق نہیں سمجھا جاتا تھا مگر اس کا وجود بہر حال تھا۔

مذکورہ تحقیقات کے مطابق کھڑی بولی کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور انیسویں صدی سے پہلے ہندی میں کھڑی بولی کے نمونے نہایت کم ہیں جب کہ اردو میں کافی بڑا ذخیرہ تھا۔ گیان چند جین کے مطابق اردو اور کھڑی بولی کے دو روپ ہیں جن کا اختلاف رسم الخط کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی کی تفریق تحریر میں کی جاسکتی ہے۔ فرہنگ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ 18 ویں صدی تک اردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ولی نے ہندی الفاظ کو ہٹانے کی کوشش کی۔ بعد میں یہی کام ناسخ نے کیا، تب بھی کافی شعرا ہندی کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اردو رسم الخط میں ہندی کی کچھ آوازیں لی گئیں۔ ٹ، ڈ، ڑ۔

ہندی سے اردو میں دس ہکاری بھی لی گئیں۔ کھ گھ، جھ چھ ٹھ، ڈھ، تھ، دھ، پھ، بھ۔

کچھ الفاظ اردو سے ہندی میں گئے ہیں جیسے: تقاضا جس کا بگڑا روپ تگادا ہے۔ نظارہ جس کا روپ نگاڑہ ہے نقد جس کا روپ نگد ہے، کاغذ جس کا بگڑا روپ کاگج یا کاگد ہے۔

اردو نے عربی و فارسی کے ذریعے اپنے لسانی سرمایے میں کافی اضافہ کیا ہے۔ ایسے متعدد مرکبات جن کا ایک جز فارسی یا عربی کا ہے اور دوسرا ہندی کا ہے جیسے گلاب جامن، گھڑسوار، سبزی منڈی وغیرہ۔

کھڑی بولی کی تشکیل کرنے میں اردو کا جو ہاتھ رہا وہ ظاہر ہے۔ ہندی زبان نے اردو زبان سے کافی کچھ لیا ہے۔ فارسی کے سابقے لگے الفاظ بھی ہندی میں شمار ہوتے ہیں جیسے بیراہا، چوراہا، چوپایہ وغیرہ اور ناسمجھ، بدچلن وغیرہ۔

ان ساری باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو الزام اردو زبان پر آتا ہے کہ اس کے الفاظ عربی و فارسی کے زیادہ ہیں تو یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے بلکہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بھی الفاظ شامل ہیں۔ دوسری طرف ہندی زبان میں کافی الفاظ سنسکرت کے شامل ہیں۔ عربی یا فارسی الفاظ کی ملاوٹ تو اردو زبان کی سرشت میں شامل ہے۔

> **جو الزام اردو زبان پر آتا ہے کہ اس کے الفاظ عربی و فارسی کے زیادہ ہیں تو یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے بلکہ اردو زبان میں عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بھی الفاظ شامل ہیں۔ دوسری طرف ہندی زبان میں کافی الفاظ سنسکرت کے شامل ہیں۔ عربی یا فارسی الفاظ کی ملاوٹ تو اردو زبان کی سرشت میں شامل ہے**

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو جو بھی آسان سے الفاظ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں تو وہ الفاظ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں اگر اُن الفاظ کو لکھنا پڑا تو صرف رسم الخط بدل جائے گا ورنہ وہ الفاظ، وہ جملے ویسے ہی رہیں گے۔ اگر ہم ادب کی طرف دیکھیں تو مرزا عطا حسین تحسین کی 'نوطرز مرصع' ہو یا شاہ عبدالقادر کا 'ترجمہ قرآن' دونوں عربی اور فارسی سے لبریز نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ قدیم اردو کی بات ہے۔ جیسے جیسے یہ زبان عام لوگوں کے رابطے کی زبان بنتی ہے اس میں کافی تبدیلیاں آتی ہیں۔ بہت سارے فارسی اور عربی کے الفاظ اردو زبان میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ قبول کر لیے جاتے ہیں۔ چاہے وہ تبدیلی تلفظ کی ہو یا رسم خط کی۔

موجودہ دور میں ہندی اور اردو کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں مگر پھر بھی ابھی ان دونوں زبانوں میں کافی مماثلت ہے اور یہ زبانیں کبھی ایک دوسرے سے الگ ہو ہی نہیں سکتیں۔ ہندی کے علمبردار ہندی کی ترقی اور اصلاح کے لیے جس قدر کوشاں ہیں وہیں اردو کے لیے ایسی کوششیں کم ہورہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر بچے کو اردو زبان کی تعلیم دلانے کا معقول انتظام کرایا جائے۔ پرائمری سطحوں پر اردو کو ضروری قرار دے کر اس کی تعلیم عام کی جائے تب کہیں اردو زبان کو اس کا صحیح مقام ملے گا۔ اردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں ہیں ہی نہیں لیکن عملی حیثیت سے انھیں دو زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ کھڑی بولی کی پیدائش ہندی روایات اور ناگری رسم الخط میں ہوئی لیکن اس کا روپ اردو کے ذریعے سنوارا گیا ہے۔

یہاں پر میں ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا چاہوں گا کہ اگر چھوٹے بچے کو ہم یہ سکھاتے ہیں کہ بیٹا Love کے معنی پریم ہوتے ہیں اگر بچہ نہ سمجھے تو کہیں گے کہ بیٹا پریم کے معنی محبت۔ اسی طرح Mother کے معنی ماتا کے ہوتے ہیں۔ مگر ہم سمجھانے کے لیے اسے ماں، اماں، امی کہہ کر بتائیں گے۔ یہاں پر میں نے چھوٹی سی مثال دے کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی ہندی زبان بھی سیکھتا ہے تو میرے خیال میں اس کا سیکھنا اردو کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمیں نہیں چاہتے ہوئے بھی اردو کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اسی طرح اردو سیکھنے کے لیے ہمیں ہندی کا سہارا لینا پڑے گا کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مشترک ہیں اور ان دونوں کے بیچ کبھی نہ ختم ہونے والا لسانی رشتہ ہے۔ دونوں زبانوں کے درمیان ایک ایسا بندھن ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ ہندی اور اردو زبانیں ایک دوسرے سے بنی ہیں، ایک دوسرے کے لیے بنی ہیں اور ان کا رشتہ ہمیشہ قائم ودائم رہے گا۔

کتابیات:

1. نصیر احمد خاں: اردو ساخت کے بنیادی عناصر، عذرا پبلی کیشنز، نئی دہلی 1994 اور کلاس لکچرز
2. سنیتی کمار چٹرجی: ہند آریائی اور ہندی، نئی دہلی 1989
3. محی الدین قادری زور: ہندوستانی لسانیات، حیدرآباد 1936
4. مولوی عبدالحق: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ، انجمن ترقی اردو ہند 1983
5. پروفیسر نورالحسن نقوی: تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1997
6. مسعود حسین خاں: مقدمہ تاریخ زبان اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1988

■

عبدل بسم اللہ

اردو ادب میں رحیم اور کبیر کو جگہ ملنی چاہیے تھی!

ہندی اور اردو کا رشتہ جتنا سیدھا ہے اتنا ہی پیچیدہ اور نازک بھی ہے۔ ایک ہی ملک، ایک ہی طرح کے علاقوں اور ان میں رہنے والے عام لوگوں کی بول چال سے جنم لینے والی یہ دونوں زبانیں کیسے ایک ساتھ وجود میں آئیں، کس طرح الگ ہوئیں اس کی طویل داستان سے ایک سوال یہ بھی جڑا ہوا ہے کہ اردو والوں نے کبیر، رحیم، رسکھان اور دوسرے عوامی شاعروں اور تخلیق کاروں کو اپنے ادب میں کیوں جگہ نہیں دی جن کا اردو زبان کا خمیر اٹھانے میں اتنا ہی بڑا حصہ تھا جتنا ان سے پہلے حضرت امیر خسرو اور ان کے بعد چندربھان برہمن جیسی شخصیتوں کا مانا جاتا ہے۔ اس سوال کے مختلف پہلوؤں اور عوامل و عواقب کا جائزہ لینے کے لیے ہم نے ہندی کے معتبر ادیب، نقاد اور مفکر پروفیسر عبدل بسم اللہ سے رجوع کیا جو تخلیق و تنقید کے علاوہ لسانیات کے شعبے پر گہری نظر رکھتے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی سے وابستہ ہیں۔ پیش ہیں ڈاکٹر محمد ہادی رہبر سے اس موضوع پر ہونے والی ان کی گفتگو کے اقتباسات جن میں کہی گئی سبھی باتوں سے مکمل اتفاق کرنا شاید آج مشکل ہو لیکن ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (ادارہ)

سوال: رحیم اور کبیر جیسے شاعروں کو اردو والوں نے کیوں نہیں اپنایا

جواب: دیکھیے ہم لوگ یہ مان کر چلتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کا ارتقا ساتھ ساتھ ہوا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اردو زبان جس وقت آئی ہے، اس وقت تک ہندی کی شکل بدل چکی ہوتی ہے جس کو ہم اردو اور ہندی کہتے ہیں۔ ان دونوں زبانوں کی جو پیدائش ہے وہ کھڑی بولی سے ہوئی ہے۔ کبیر اور رحیم پرانے زمانے کے شاعر ہیں ایک چودہویں صدی کا ہے دوسرا سولہویں صدی کا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں اردو زبان جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کوئی چیز تھی ہی نہیں، حالانکہ اسکرپٹ تھی جو رسم الخط ہے، چونکہ فارسی داں لوگ تھے جو آئے تھے جتنے بھی باہر سے آئے وہ سب فارسی جانتے تھے، عربی جانتے تھے۔ تو ان سب کی اسکرپٹ تو تھی لیکن زبان نہیں تھی اور جہاں تک کبیر کا معاملہ ہے کبیر تو پڑھے لکھے بھی نہیں تھے جو کچھ بھی ان کے حوالے سے ملتا ہے ساکھیاں ملتی ہیں وہ سب بولے گئے ہیں وہ سناتے تھے اور ان کے شاگرد اس کو یاد کرلیتے تھے۔ لکھنا تو بعد میں ہوا ہوگا جب پوتھی وغیرہ انھوں نے لکھی ہے، رحیم کے زمانے تک حالات بدل گئے تھے رحیم کا جو زمانہ ہے وہ وہی زمانہ ہے جو تلسی داس کا زمانہ ہے۔ رحیم کا معاملہ تو یہ تھا کہ رحیم خود فارسی داں تھے لیکن ان کی جو شاعری ہے وہ اس میں ہندوستان کی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس پورے میڈیول پیریڈ یعنی عہدِ وسطیٰ کو دیکھیں تو اس میں جو شاعری کی زبان تھی وہ یا تو برج تھی یا پھر اودھی تھی۔ لیکن کبیر کی زبان کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی زبان کو کیا نام دیا جائے یہ ابھی تک طے نہیں ہوا۔ ہندی کے جو بہت بڑے نقاد تھے اور انھوں نے ہسٹری آف ہندی لٹریچر، ہندی ساہتیہ کا اتہاس کے نام سے لکھا آچاریہ رام چندر شکل۔ انھوں نے کبیر کی جو زبان ہے اس کو دو نام دیے تھے ایک تو کہا تھا کہ یہ سدھکڑی زبان ہے اور دوسرا جو نام دیا انھوں نے وہ کہ یہ پنچ میل کھچڑی ہے۔ یعنی کبیر کی شاعری کی جو زبان ہے وہ ملی جلی زبان ہے تمام زبانوں کے الفاظ ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے، چونکہ ایک طرح سے ان کی شاعری زبانی شاعری تھی لکھی ہوئی شاعری نہیں تھی پورے ہندوستان بھر میں جو عوام ہیں اس کی زبان پہ ان کی شاعری چڑھی ہوئی ہے تو جس خطے کے لوگ ان کی شاعری کو سناتے رہے ہوں گے یا لکھا ہوگا انھوں نے اپنے خطے کی زبان ڈال دی اس میں، اس لیے کبیر کی ایک زبان بن نہیں پائی حالانکہ کبیر رہنے والے بنارس کے تھے، پھر مگہر چلے گئے تھے جو پاس ہی میں ہے مگہر تو وہاں جو زبان بولی جاتی ہے آج کی زبان میں اس کو بھوجپوری کہتے ہیں، لیکن بنارس کی جو زبان ہے اسے اس زمانے میں لوگ بھوجپوری نہیں کہتے تھے کاشیکا کہتے تھے، کاشی کی زبان۔ جہاں تک رحیم کی جو زبان ہے وہ اودھی ہے کہیں کہیں برج بھی ہے۔ یہ سب جو زبانیں تھیں اودھی، برج، بھوجپوری، میتھلی، چھتیس گڑھی، یہ زبانیں نہیں تھی ڈائلکٹ تھیں اور جب ہم بات کرتے ہیں

اردو کی تو اردو ایک ایسی زبان ہے جس کی کوئی ڈائلکٹ نہیں۔ جب کہ ہندی میں ڈائلکٹ بھی ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ جو خاص وجہ رہی ہے ان کو شامل نہ کرنے کی اردو شاعری میں یا اردو شاعری کی تاریخ لکھنے میں اس کے پیچھے جو ہے وہ رسم الخط کا مسئلہ نہیں ہے مسئلہ ہے ڈائلکٹ کا کیوں کہ اردو میں ڈائلکٹ ہے نہیں اور ان سب کی جو زبان ہے وہ ڈائلکٹ میں ہے۔ لیکن ڈائلکٹ میں ہونے کے باوجود چونکہ ان کی شاعری میں بھی ہندوستان کی زمین ہے اور خاص طور سے آپ کبیر کو دیکھیں تو کبیر کے یہاں تصوف کا اثر بھی ملتا ہے اور یہ صوفی شاعری تو ایران کی بڑی مشہور رہی اور پھر ہندوستان میں بھی آئی۔ وہ جو زبان کے بھیتر کی تھیم ہے یا جو ان کی اسٹائل ہے ان کا فلسفہ ہے اس فلسفے کو اگر آپ دیکھیں تو اس میں ہندی اردو کا بٹوارہ کہیں نظر آتا نہیں۔ فرق صرف جو ہے وہ یہی ہے کہ ایک زبان ہے اردو اور ان کی شاعری جو ہے وہ ڈائلکٹ ہے اب ایسے تو میں بتاؤں آپ کو کہ پورے عہد وسطیٰ کی جو بھی شاعری ہے اور جو ان کی مینواسکرپٹ وغیرہ ہیں تو زیادہ تر جو رسم الخط اپنایا ہے ان لوگوں نے وہ عربی ہے۔ فارسی رسم الخط جو لوگ کہتے ہیں غلط کہتے ہیں۔ رسم الخط عربی ہے اسی کو اپنایا فارسی والوں نے اسی کو ترکی زبان نے اپنایا وہی اردو میں آئی ہے تو بنیاد جو ہے وہ عربک ہے۔ اچھا کبیر اور رحیم کو چھوڑیے یہ تو ٹھیک ہے بھئی ڈائلکٹ والی شاعری کرتے تھے جو دکنی شاعر ہیں ان تک کو اردو والوں نے بہت اہمیت نہیں دی چاہے وہ ولی دکنی ہوں یا قلی قطب شاہ ہوں، ابراہیم عادل شاہ ہوں یہ دکنی زبان کی شاعری کرتے تھے۔ اس میں بھی ملی جلی زبان ہے لیکن اس میں ہندوستانی کے الفاظ بھی ہیں اور عربی فارسی کے الفاظ بھی ہیں۔ دکنی کو بہت بعد میں جاکر اردو والوں نے اپنایا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس پر اردو والوں کی نظر تب پڑی جب ان کو ہندی کا شاعر بتایا جانے لگا۔ راہل سانسکر یتائن بہت بڑے اسکالر تھے انھوں نے ایک collection چھاپا تھا دکنی شاعری کا جس کو انھوں نے دکنی ہندی کہا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ انھوں نے کہا کہ یہ ہندی ہے دکنی ہندی تب جاکر یہ اردو والے چونکے کہ بھئی یہ قلی قطب شاہ، ولی دکنی کو ہندی کا مان رہے ہیں۔ ہندی والوں نے ان کو اپنایا تب جاکے اردو والوں کو ہوش آیا، ورنہ ایک لمبے عرصے تک ان کو بھی نہیں اپنایا گیا تھا۔ اردو شاعری میں جگہ نہیں تھی ان کی۔ تو اس طرح کی بہت سی وجوہات رہی ہیں۔

سوال: کیا محض لسانیاتی Prejudices اس کا سبب تھے؟

جواب: لسانیات تو ہے ہی اور کہیں نہ کہیں مجھے لگتا ہے کہ اس میں مذہب بھی آڑے آرہا ہوگا کیونکہ کبیر تو ڈنکے کی چوٹ پر ہندوؤں کی بھی تنقید کرتے ہیں اور مسلمانوں کی بھی اور خود کو عاشق مانتے ہیں اچھا یہ دیکھیے کہ صوفی ازم کی یہ چیز جو عشق ہے کبیر کا وہ رام کے ساتھ ہے اور یہ رام وہ نہیں ہیں جو راجہ دشرتھ کے بیٹے ہیں۔ کبیر کہتے ہیں کہ:

دشرتھ سکھ تہولوک بکھانا

दशरथ सुख तिहुलोक बखाना

رام نام کا مرم ہے آنا

राम नाम का मरम है आना

مطلب یہ کہ دشرتھ کے بیٹے کا جو بکھان ہے وہ تینوں لوک میں ہے، لیکن میں جس رام کی بات کر رہا ہوں وہ یہ رام نہیں ہیں یہاں سیدھا سیدھا اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف، دشرتھ کے بیٹے رام کی بات نہیں کر رہا ہوں جب یہ کہہ دیا انھوں نے پھر بھی رام ان کی شاعری میں اتنا بھرا ہوا ہے اسی کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ اردو والوں نے شاید اس لیے بھی پرہیز کیا ہو۔ کبیر اپنی شاعری میں کہتے ہیں کہ رام میرے شوہر ہیں اور میں بیوی۔ اور یہ شوہر بیوی کا جو معاملہ ہے وہ صوفی ازم کا ہے ان کا یہ عشق کیا ہے وہ عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی میں کنورٹ ہوتا ہے بات تو وہ عشق کی کر رہے ہیں لیکن چونکہ رام ہے وہاں پر اس لیے مجھے لگتا ہے کہ گڑبڑ ہوا ہوگا۔ لوگوں کو اعتراض ہوگا کہ بھئی یہ اردو کے شاعر تو ہو نہیں سکتے۔ پھر بھی بڑی وجہ وہی ڈائلکٹ والی ہے کیوں کہ اردو ڈائلکٹ ہے ہی نہیں۔ اردو شرفا کی زبان ہے اور ڈائلکٹ جو ہے وہ عوام کی زبان ہے حالانکہ شروعاتی دور میں اردو شرفا کی زبان نہیں تھی فارسی تھی۔ وہ تو بعد میں جب ہندی اردو کا جھگڑا شروع ہوتا ہے تب یہ کہا جانے لگا نہیں صاحب اردو تو شرفا کی زبان ہے۔ یہ اردو زبان جو ہے اس کا مرکز کئی جگہ ہے ایک تو بازار ہے دوسرا دربار ہے۔ اردو کا ارتقا جو ہو رہا ہے وہ دربار میں ہو رہا ہے کیونکہ دربار میں ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے جو کہ منصب دار وغیرہ ہوتے تھے۔ بازار یعنی مارکیٹ میں جہاں تجارت اور خرید و فروخت کے لیے جاتے ہیں تو وہاں اپنی زبان وہ بولے گا تو دکان دار ہندی بول رہا ہے خریدار جو ہے وہ فارسی بول رہا ہے۔ تو فارسی اور ہندی وغیرہ سب مل کر اردو بن گئی ایک تو دربار ہے ایک بازار ہے ایک فوج ہے چونکہ راجہ تو مسلمان ہے فارسی داں ہے بلکہ فارسی داں بھی نہیں جو ان کی زبان ترکی ہے بابر وغیرہ کی جو زبان تھی وہ ترکی تھی۔ بابر جو ہے سینٹرل ایشیا سے آیا تھا یہ فرغانہ کا تھا اور فرغانہ تو ازبیکستان میں ہے اس طرح آپ غور کیجیے تو یہ لوگ سنٹرل ایشین جو تھے ان کی زبانیں بھی ڈائلیکٹ جیسے تھی اس لیے شرفا جو تھے یا بادشاہ جو تھے وہ اس زبان کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ ٹرکش بولتے تھے کیونکہ ترکی زبان جو ہے وہ شرفا کی زبان ہے اور ازبیک وغیرہ جو زبانیں تھیں وہ ڈائلکٹ تھیں۔ جب ہندوستان آتے ہیں یہ تو ترکی کے ساتھ فارسی بھی بولنے لگتے ہیں۔ اچھا تاجک ہے سنٹرل ایشیا میں تاجکستان ہے اور تاجک جو زبان ہے وہ ایک دم فارسی ہے۔ اگر دو لوگ آپس میں بیٹھے ہوں ایک تاجک بولے اور ایک فارسی بولے تو اس کو دونوں سمجھتے ہیں۔ بالکل اردو ہندی کی طرح سے تاجک اور پرشین ایک جیسی زبانیں ہیں بس فرق یہ ہے کہ تاجک میں 'آ' کی جگہ 'او' بولتے ہیں جیسے بنگلہ میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً رُبندرنوتھ بولیں گے رَویندر ناتھ نہیں بولیں گے۔ اسی طرح سے چاند کے لیے ماہ ہے لیکن تاجک 'موہ' بولے گا 'ماہ' نہیں بولے گا حالانکہ فارسی میں بھی موہ ہی ہے لیکن یہ ہندوستان میں آکر ماہ ہوگیا۔ تو مذہب وذہب کچھ نہیں بلکہ آپ شروع کو دیکھیں انیسویں صدی کے بالکل شروع میں Prose آرہا ہے اور فورٹ ولیم سے جس کا آغاز ہوتا ہے تو وہاں پر میر امن جیسا آدمی یہ کہتا ہے باغ و بہار کے دیباچے میں کہ میں اس میں جو زبان استعمال کر رہا ہوں وہ عوام کی ہے جو لڑکے بالے بوڑھے خاص عام سب بولتے ہیں ان کی زبان ہے یہ۔ میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں اس کا مطلب یہ کہ باغ و بہار کی زبان شرفا کی زبان نہیں ہے وہ عوام کی زبان میں لکھی گئی ہے اور کہیں کہیں تو پڑھنے پر لگتا ہے کہ یہ شاید ہی اردو ہو ایسا لگتا ہے کہ یہ ہندی ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔ درویش جب اپنے بہن کے یہاں جاکے رہنے لگتا ہے، بہنوئی اس کو پسند نہیں کرتا ایک جگہ پہ کہیں یہ ہے میں نے ترجمہ کیا ہے باغ و بہار کا اس لیے مجھے یاد ہے اس میں ایک ڈائیلاک ہے جو بہن اپنے بھائی سے کہتی ہے ''اے مورے بیرن میرا بس چلتا تو میں اپنی چمڑی کی جوتی پہنا کر تجھے پہناتی۔'' اب یہ جملہ اردو کہاں سے ہے بھائی آپ ہی بتایئے صاحب ''اے مورے بیرن'' یہ بالکل نہیں لگتا کہ یہ کوئی الگ زبان ہے۔ ایک دم عام آدمی کی زبان ہے جسے آپ چاہیں تو ہندی کہہ لیں یا اردو کہہ لیں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ تو شروعاتی دور میں جو زبان تھی اس میں ہندی اور اردو میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا یہ جو جھگڑا شروع ہوتا تب جب Identity کرائسس

شروع ہوتا ہے، پہچان کی بات ہوتی ہے، کہنے کو تو صاحب یہ 1850 کے بعد آتا ہے کہ پہچان بنانی ہے اپنی الگ شناخت بنانی ہے تو زبان کو الگ کرو تب جا کر اردو میں فارسی اور عربی لفظ داخل کیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو مشکل سے مشکل ہوتی چلی گئی ادھر ہندی والوں نے بھی ہندی میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنے شروع کردیے جس کی وجہ سے ہندی بھی مشکل زبان ہوتی چلی گئی۔ آپ دیکھیے اردو کی جو شاعری ہے اردو ناول یا فکشن اس میں گاؤں کہیں ہے کیا۔ یہ عجیب چیز ہے کہ اردو ناولوں میں گاؤں کہیں نہیں ملتا۔ ہاں اب تو لکھنے لگے ہیں لوگ کوئلہ کان کے مزدوروں پر الیاس احمد گدی نے ناول لکھ دیا 'فائر ایریا' قرۃ العین حیدر کو دیکھیے آپ عصمت چغتائی کو دیکھیے آپ یہاں تک راجندر سنگھ بیدی کو حالانکہ ان کے یہاں تھوڑا آتا ہے گاؤں پنجاب کا گاؤں، قاسمی کے یہاں آتے ہیں، بلونت سنگھ کے یہاں آتے ہیں، مگر پنجاب کے گاؤں۔ لیکن دلی، لکھنؤ سے جن کا تعلق ہے ان کے یہاں گاؤں بالکل نہیں آئے ان کے فکشن میں شہری زندگی ہے خالص شہری اور سب پڑھے لکھے ہیں ان کے یہاں گاؤں نہیں آرہا ہے صاحب کیوں کہ گاؤں لائیں گے تو ڈائلکٹ لانا پڑے گا کیونکہ ڈائلکٹ تو گاؤں میں ہے۔ ڈائلکٹ کی وجہ سے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں فائر ایریا بہت سے اردو جاننے والے بڑھ نہیں پائے کیوں کہ اس میں جو ڈائلکٹ ہے وہ وہاں کی زبان میں ہے۔ کئی اردو والوں نے مجھ سے کہا کہ صاحب پڑھا نہیں جاسکتا میں نے کہا کیسے پڑھا جائے گا آپ کو جب ڈائلکٹ کا پتہ ہی نہیں ہے۔ وہ بھی بہار کا۔ پوربی بہار کا کہاں سے آپ کو سمجھ میں آئے گا اسی طرح سے ممبئی کے گھریلو نوکروں کے موضوع پر لکھا گیا ناول 'تین بتی کے راما' آیا۔ علی امام نقوی کا اس میں جو ڈائیلاگ ہیں جو نوکر نوکرانیوں کے وہ بھی لوگوں کو کھٹکتے ہیں۔ راہی معصوم رضا تو اردو کے شاعر تھے اردو میں سب لکھتے تھے۔ آدھا گاؤں کو اردو والوں نے نکال دیا باہر کیا کہ اس میں گالیاں ہیں، میں کہتا ہوں کیا اردو والے گالیاں سنتے نہیں یا گالیاں دیتے نہیں۔ آپ بتائیے میرا ناول ہے وہ اردو میں جب چھپا 'جھینی جھینی بینی چدریا' تو گالیاں نکال دی گئیں۔ اس میں سے ایڈٹ کردی گئی، تو آپ یہ کچھ چیزیں ہیں تو Prejudices ہیں آپ ہندی میں تو چلا لیجیے لیکن اردو میں نہیں چلے گا۔ اردو ادب کو اس رجحان نے اتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے کہ میں کیا کہوں۔ خالص اردو لکھیے صاحب عربی فارسی کے لفظوں کے ساتھ عام زبان میں نہیں لکھیں گے۔ اس نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ عام زبان کا تھوڑا چھونک اگر کوئی دیتی ہیں تو وہ عصمت چغتائی دیتی ہیں۔ ورنہ وہ بچتے ہیں ان چیزوں سے تو یہ بہت بڑی وجہ رہی ہے۔

سوال: اگر اردو والوں نے شروع سے کبیر، رحیم اور قلی قطب کی تخلیقات کو اپنے ادب عالیہ میں جگہ دی ہوتی اس کے کیا کیا فائدے ہوسکتے تھے؟

جواب: اگر واقعی اردو والوں نے ان کو اہمیت دی ہوتی تو صورتِ حال دوسری ہوتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہندی اردو میں جو فرق بنا اور جو لڑائی ہوئی ہندی اردو میں یہ نہ ہوتا۔ کیوں کہ تب ہندی والے بھی کہتے کہ کبیر ہمارے ہیں اور اردو والے بھی کہتے کہ کبیر ہمارے ہیں پھر جھگڑا کہاں جیسے پریم چند کے تعلق سے ہوا بھی۔ پریم چند کا یہی معاملہ ہے وہ یہ کہ وہ ہندی میں بھی Accepted ہیں اور اردو میں بھی Accepted ہیں تو یہ سارے شاعر اگر ان کو جگہ دے دی گئی ہوتی تو یہ دونوں جگہ Accepted ہوجاتے۔ آج جو اردو جھیل رہی ہے ہندی کو تو نہیں جھیلنا پڑ رہا ہے اردو کو جھیلنا پڑ رہا ہے کیوں کہ اردو کے پاس ریڈر نہیں ہیں۔ ریڈر اردو سے غائب ہوگئے ہیں۔ میں یہ بتاؤں حالانکہ اس سے لوگ ناراض ہوتے ہیں دیکھیے آج بھی جتنے تراجم اردو کے ہندی میں ہوتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ہندی ادب کے تراجم اردو میں نہیں ہوئے۔ اس طرح نہیں ہوئے اتنی زیادہ۔ تھوڑا بہت ہوا ہے۔ لیکن صاحب میں تو کہتا ہوں کہ اردو کی جو شاعری ہے، زیادہ تر ناگری رسم الخط میں چھپ چکی ہے۔ اردو کا شعری ادب جتنا ہندی میں پڑھا جاتا ہے اردو میں نہیں پڑھا جاتا۔ میر و غالب، ہندی میں سب موجود ہے میر بھی موجود ہیں، غالب بھی موجود ہیں، فیض بھی موجود ہیں جتنے بڑے شاعر ہیں موجود ہیں سب جتنے ناول تھے اردو کے وہ زیادہ تر ہندی میں ہیں۔ 'آگ کا دریا' تک ہندی میں ہے۔ پاکستان تک کا ادب ہندی میں ہے۔ انتظار حسین کا 'بستی' ہندی میں ہے۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، احمد فراز وغیرہ اور بہت سے شاعر و ادیب ناگری رسم الخط میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن اردو نے ایسا نہیں کیا آپ مجھے بتائیں کہ کسی بھی ہندی کے بڑے شاعر و ادیب کو اردو والوں نے ترجمہ کرکے چھاپا۔ آخر کیوں ایسا ہوا۔ یہ بھی ایک بڑا نقصان ہے اردو کا۔

سوال: دیگر صوفی سنتوں مثلاً بابا فرید، بلھے شاہ اور سلطان باہو کی شاعری سے بھی کیا اردو والے خود کو جوڑ سکتے تھے؟

جواب: بالکل جوڑ سکتے تھے اور یہ زبان بابا فرید، بلھے شاہ اور سلطان باہو یہ تو پنجاب کے ہیں اور پنجاب میں تو اردو کا بہت ڈیولپمنٹ ہوا ہے پنجاب ہی سے اردو ڈیولپ ہوتے ہوئے آئی ہے۔ اس میں تو میں ایک چیز اور جوڑنا چاہتا ہوں کہ ہندی کی جو نارتھ انڈیا ہے یعنی جو صوفی شاعر ہوئے ہیں ان کو بھی اردو والوں نے نہیں اپنایا جیسے ملک محمد جائسی، قطبین، منجھن، یہ سب بلکہ ملا داؤد جو پہلے شاعر تھے چندائن جنھوں نے لکھی تھی مزے کی بات یہ کہ ان کی ساری کتابیں عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں اور اردو والوں نے اس کو اپنایا ہی نہیں وہ تو بھلا ہو رام چندر شکل جی کا کہ اردو جانتے تھے وہ ان کی وجہ سے ملک محمد جائسی وغیرہ کا پدماوت وغیرہ منظر عام پر آیا کیوں ناگری اسکرپٹ میں اس کو پہلے ٹرانسفر کیا اور اس کے بعد چھپوالیا تو پنجاب کو چھوڑ دیجیے آپ نارتھ انڈیا کو دیکھ لیجیے آپ جہاں اتنا بڑا خزانہ ہے اور تصوف کے لحاظ سے دیکھ لیجیے تو تصوف بھی اس میں خوب ہے اور تصوف تو عرب سے آیا ہے اور اس کا ڈیولپمنٹ جا کر ایران میں ہوتا ہے اور وہ ہندوستان آتا ہے سنٹرل ایشیا کے ذریعے تو اس کے جو خیالات ہیں اس کی روشنی میں دیکھیں اگر صوفی شاعری ہے جو صوفیوں کی بہت ہی مقبول شاعری ہے لیکن اردو والوں نے اسے اپنایا ہی نہیں جب کہ یہاں تو رسم الخط بھی وہی ہے۔ بس وہی ایک وجہ کہ جو زبان تھی وہاں یہ جتنے صوفی شاعر ہیں نارتھ انڈیا کے ان کی زبان جو ہے وہ اودھی ہے اور اودھی جو ہے وہ ڈائلکٹ ہے معاملہ دیکھیے لے دے کے وہی ڈائلکٹ پر آتا ہے۔ جب کہ دیکھیے یہ عجب چیز ہے کہ خود اردو کا ڈیولپمنٹ ڈائلکٹ سے ہوا ہے۔ کھڑی بولی، بولی اس کے ساتھ لگا ہوا ہے، بولی کا مطلب ہی ڈائلکٹ ہوتا ہے بولی لفظ کے معنی ہی ڈائلکٹ کے ہیں۔ تو کھڑی بولی بھی ڈائلکٹ ہے اور اسی سے دونوں زبانیں نکلیں ہیں۔ ہندی بھی اردو بھی، پہلے لوگ کہتے تھے کھڑی بولی اردو، کھڑی بولی ہندی، بعد میں کھڑی بولی نکل گئی ہٹ گئی اور اردو ہندی رہ گئی۔

سوال: نظیر اکبرآبادی تو اردو کے ہی شاعر تھے۔ انھیں ڈیڑھ صدی تک نظر انداز کرنے کی وجہ آپ کی نظر میں کیا رہی؟

جواب: جیسا کہ میں نے کہا کہ اردو دھیرے دھیرے شرفا کی زبان بن گئی اور اگر کوئی زبان شرفا سے منسوب ہوجائے تو اس کے جو Topics ہوں گے اس کا جو تھیم ہوگا وہ بھی شرفا کے ہونے چاہیے۔

نظیرا کبرآبادی کا گناہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے عوام کی شاعری کی ہے، ککڑی بیچنے والے، لڈو بیچنے والے، پتنگ اڑانے والے، یہ جو بازار ہے اس کے علاوہ میلے ٹھیلے ان کے یہاں ہے، مہادیو جی کا میلہ، شیو جی کا میلہ، کرشن پرانھوں نے نظم لکھی ہے 'کرشن کنہیا کا بالپن' تو یہ Topic جو اٹھائے ہیں نظیرا کبرآبادی نے وہ عوام کی، ہندوستانی عوام کی جو زندگی تھی جو ریلٹی تھی جو کچھ آس پاس وہ دیکھتے تھے، جو وہ بولتے تھے، اس کو ان ہی کی زبان میں لکھا ہے انھوں نے یہ بہت اہم وجہ رہی ہے، نظیرا کبرآبادی کو جس طرح سے نظرانداز کیا گیا کتنی بڑی زیادتی ہوئی ہے اور اگر نظیرا کبرآبادی وغیرہ کو Accept کرلیں تب تو پھر نظیرا کبرآبادی تو مجھے کہیں سے اردو کے شاعر لگتے نہیں۔ سو کالڈ اردو، جسے اردو لوگ کہتے ہیں وہ تو عوام کا شاعر ہے جناب اور صحیح معنوں میں گاندھی جی جس کو ہندوستانی کہتے تھے، اس زبان کا شاعر۔ گاندھی جی نے بہت کوشش کی کہ بھائی لڑو مت، نہ ہندی کہو، نہ اردو کہو، ایک زبان ہے ملی جلی جس کو ہندوستانی زبان کہو لیکن یہ بات کسی نے مانی نہیں۔ اگر یہ بات مان لی گئی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی، کیونکہ اب دیکھیے آپ کو بیسویں صدی کے شروعاتی دور میں ہندی بہت مشکل الفاظ استعمال کرتی تھی، لیکن آزادی کے بعد دیکھیے تو اردو زبان دھیرے دھیرے آسان ہوتی چلی گئی اور تعجب تو یہ ہے اور یہ بڑی عجیب بات ہے میرے لیے تو کہ ہندوستان میں جو اردو ادب لکھا جاتا ہے وہ بڑی دقیق اردو میں ہے۔ اس میں فارسی کے الفاظ ٹھنسے ہوئے ہیں لیکن جو پاکستان میں لکھا جارہا ہے۔ اس میں ہندی کے بہت الفاظ ملیں گے آپ کو زیادہ تر جو مہاجرین ہیں وہاں گئے ہیں۔ اب انتظار صاحب کی زبان دیکھ لیجیے آپ، یہاں تک کہ ان کی تھیم دیکھ لیجیے۔ جاتک کتھائیں، دیومالا، یہ سب وہ لکھتے ہیں صاحب، اور ان کو پاکستان میں اتنی اہمیت ملی کبھی کبھی میں یہ سوچ کے ڈر جاتا ہوں کہ اگر انتظار حسین یہاں ہوتے اور وہی سب لکھتے تو پتہ نہیں اردو والے ان کو اہمیت دیتے یا نہ دیتے آج میں سمجھتا ہوں آج وہ اکیلا رائٹر زندہ ہے جو اردو کا گریٹ ناول نگار ہے فکشن لکھنے والا ہے۔ اس سے بڑا تو کوئی نہیں، میری سمجھ سے زندہ لوگوں میں پوئٹری جو لکھی جارہی ہے۔ وہ دیکھیے آپ پروین شاکر کی شاعری دیکھیے آپ فہمیدہ ریاض کو دیکھیے آپ احمد ندیم قاسمی کو دیکھیے ان سب کو میں نے ترجمہ کیا ہے۔ تو آپ دیکھیے کہ وہاں کے جو لوگ ہیں اور جس طرح کی زبان لکھتے ہیں وہ تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان میں جیسی زبان ہونی چاہیے ویسی زبان اردو کی نہیں ہے۔ اردو کی شکل ہندوستان میں بالکل علیٰحدہ ہے اور وہاں بالکل علیحدہ ہے اور اب اردو والوں کو دھیرے دھیرے سمجھ میں آرہی ہے یہ بات۔ اردو میں یہ دقت بھی ہے کہ آپ کوئی کتاب تیار تو کرلیں گے چھپوانے کے لیے آپ کو اپنی جیب سے پیسہ لگانا پڑے گا۔ ہندی میں کم ازکم ابھی تک اتنی خراب نوبت نہیں آئی ہے۔ تھیسس وغیرہ چھپوانے کے لیے تو پیسہ دیتے ہیں لوگ، شاعری میں بھی کچھ پیسہ ویسہ دیتے ہیں لوگ بڑے شاعر تو نہیں دیتے۔ لیکن افسانہ اور ناول نگار سے کوئی پیسہ نہیں اردو کے جو افسانہ نگار ہیں ناول نگار، وہ اردو میں تو چھپواتے ہی ہیں ہندی میں بھی چھپواتے ہیں اپنی کتاب اور ہندی رسم الخط میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی کے ریڈر زیادہ ہیں۔ اردو کے ریڈر دھیرے دھیرے کم ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس پر اگر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا جائے گا تو ایک دن اردو پڑھنے والے رہ ہی نہیں جائیں گے، نئی نسل جو ہے بھائی صاحب وہ نہ تو ہندی جانتی ہے نہ اردو وہ تو انگریزی پڑھتی ہے۔ انگریزی جان رہی ہے، اردو کی اچھے رسالے بند ہوگئے۔ کتنے اچھے اچھے رسالے نکلتے تھے اردو کے یہ رسالے یا تو بند ہوگئے یا کبھی کبھی نکلتے ہیں۔ جو بڑے اخبار تھے ایک زمانے میں اردو کے وہ بند ہوگئے۔ نئے نئے اخبار چھوٹے موٹے شروع ہوئے ہیں حال میں ادھر پندرہ بیس سال میں اور وہ ایسی زبان لکھتے ہیں جو عوام کی زبان ہے اس میں اپنی News وغیرہ لکھتے ہیں اگر آپ کو اردو اسکرپٹ آتی ہے تو آپ پڑھ لیں گے اور سمجھ لیں گے تو ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن پر ہم لوگوں کو سوچنا چاہیے اور اس لیے ہمارا جو ڈپارٹمنٹ ہے ہندی ادب کا ڈپارٹمنٹ ہے لیکن ایک پیپر اردو ادب کا بھی ہمارے ہاں ہے۔ ہم نے اردو والوں سے کہا ہے کہ آپ ایک پیپر ہندی والوں کا بھی لگائیے کم ازکم ایک تو لگا دیجیے آپ، ٹھیک ہے۔ Medieval مت پڑھائیے Modern تو پڑھائیے پھر بھی میں نے کہا کہ اگر ہوسکے تو Medieval بھی پڑھائیے، کبیر رحیم، جائسی وغیرہ کو ان لوگوں نے Syllabus بنایا ہے میں نے دیکھا نہیں ہے ان کا ابھی Syllabus نیا نیا شروع ہوا ہے لیکن ایک دن آئے تھے اردو ڈپارٹمنٹ کے لوگ مشورہ کرنے مجھ سے میں نے کچھ چیزیں بتائیں کہ ان کی یہ شاعری لگا دیجیے ان کا یہ ناول لگا دیجیے اور یہ پڑھ لیں گے بچے ہندی تو سب ہی جانتے ہیں اردو سب نہیں جانتے۔ لیکن ہندی تو پڑھ ہی لیتے ہیں لوگ تو یہ سب اگر کیا جائے اور بھی آگے بڑھ کر میں تو سوچتا ہوں کہ ایک ہندی اردو کی مشترکہ تاریخ لکھی جانی چاہیے۔ ہسٹری آف اردو الگ لکھ رہے ہیں ہندی الگ لکھ رہے ہیں۔ ارے یار دونوں کو ملا کر ایک ساتھ لکھو نہ۔ دونوں کے Example دو، دونوں کی مثالیں دو صاف پتہ چلے گا کہ اس سنہ سے اس سنہ تک ایک جیسی زبان تھی، پھر بیچ کا ایک دور آتا ہے کہ دونوں زبانیں الگ ہوجاتی ہیں پھر اگلے Step میں جائیے پھر ایک جیسی ہورہی ہیں آج ہورہی ہیں تو اس کو کیسے سمجھیں گے اگر آپ ساتھ ساتھ نہیں لکھیں گے۔ اس پر ایک پروجیکٹ یو جی سی نے دیا تھا جے این یو اور کملیشور کی دیکھ ریکھ میں وہ کام ہونا تھا لیکن وہ نہیں ہوا کملیشور کا انتقال بھی ہوگیا۔ لیکن یہ کام ہونا چاہیے اور ابھی بھی مجھے سال میں دو مرتبہ تین مرتبہ حیدرآباد جانا پڑتا ہے مجھے وہاں کی یونیورسٹیز کا میں ممبر ہوں۔ دلی یونیورسٹی نے ایک پروجیکٹ لے رکھا ہے صاحب کہ ہندی ادب کا اتہاس نئے سرے سے لکھا جانا چاہیے تو میں اس کا ایڈوائزر تھا یو جی سی میں۔ میں نے ان کو صلاح دی کہ جب ہندی ادب کا اتہاس نئے سرے سے لکھ رہے ہیں تو اس میں اردو کو بھی شامل کرلیجیے خاص طور پر دکنی کو شامل کریے اور ابھی بھی سالار جنگ میوزیم جو وہاں حیدرآباد میں ہے اس میں ایسی ایسی مینو اسکرپٹ پڑی ہوئی ہیں اور موجود ہیں جو چھپ نہیں پائی ہیں۔ میں نے کہا انھیں بھی چھپوایئے ان کو لے آیئے ان کو ہندی رسم الخط میں پہلے ٹرانسفر کرایئے چاہے آپ اردو ڈپارٹمنٹ سے Help لے لیجیے۔ پیسہ مل رہا ہے خرچ کیجیے حیدرآباد ایک ٹیم بھیج دیجیے وہاں کے لوگوں کو ساتھ لے لیجیے بیٹھ کر لائبریری میں کیجیے کام۔ مجھے نہیں پتا کہ پھول بن چھپی ہے کہ نہیں چھپی ہے۔ اردو میں چھپی ہے، جب کہ 'سب رس' ہندی میں چھپا ہوا ہے۔ ایک شری رام شرما تھے وہاں پر وہ بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ انھوں نے بہت کام کیا ہے اور وہ جو مثنوی ہے 'پدم راؤ کدم راؤ' وہ بھی ہندی رسم الخط میں چھپی ہے۔ ایک طرح سے اردو کی ہندوستان میں لکھی جانے والی پہلی مثنوی ہے تو اس طرح کے کام اگر دونوں زبانوں میں ہوں کہ ہندی والے اردو لٹریچر سے واقف ہوسکیں اور اردو والے ہندی لٹریچر سے واقف ہوں دونوں میں کیا ایسی چیزیں ہیں جو برابر ہیں تب ہم صحیح ڈھنگ سے اپنی سوسائٹی کو سمجھ پائیں گے۔

■

Prof. Abdul Bismillah
Dept. of Hindi, JMI, New Delhi- 110025

Dr. Mohd. Hadi Rahbar
265, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi - 67

اردو ہندی افسانہ

سلام بن رزاق

کہانی کہنے کی روایت قدیم زمانے سے قائم ہے۔ ہندوستان میں وید، پران اور اُپنشدوں میں بے شمار کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ دراصل یہی ہماری کہانی کی ابتدائی شکل تھی۔ پھر رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں، نیز کتھاسرت ساگر، پنچ تنتر اور جاتک کتھاؤں تک آتے آتے کہانی نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔ آج جسے ہم مختصر افسانہ کہتے ہیں یوں تو اس کا موجودہ فارم ہم نے مغرب سے لیا ہے تاہم ہندوستانی افسانے کی جڑیں اُسی ابتدائی کہانی کی زمین سے پھوٹی ہیں جو ہزاروں برس پہلے سنسکرت اور پالی ادب میں جنم لے چکی تھیں۔ جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے اُس کے خمیر میں ان قدیم کہانیوں کے جُزوی عناصر ضرور شامل ہیں لیکن اُس کا اصل منبع اور مخرج وہ داستانیں ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں لکھی گئیں۔

اُسی زمانے میں ہندی میں بھی رتنا ولی، مدھوکر التی اور نل دمینتی جیسی کتھائیں لکھی جارہی تھیں۔ البتہ انشاء اللہ خاں انشاء اللہ کی 'رانی کیتکی کی کہانی' کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں طور پر پہلی 'کہانی' تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو میں یوں تو بعض محققین کے نزدیک سرسید احمد خاں کا 'گزرا ہوا زمانہ' پہلا طبع زاد افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض سجاد حیدر یلدرم کو اردو کے پہلے افسانہ نگار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ ہندی کہانی یا اردو افسانے کو تخیل سازی اور تحیر خیزی کے بھنور سے نکال کر اُسے زندگی آمیز بنانے کا سہرا پریم چند کے سر جاتا ہے۔ اُسی زمانے میں پریم چند کے حقیقت پسند افسانے کے متوازی اردو میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری افسانے کو ادب لطیف کا جامہ پہنا رہے تھے اور ہندی میں جے شنکر پرساد 'للت ساہتیہ' کے خدوخال سنوار رہے تھے لیکن پریم چند کے حقیقت پسند افسانے کے سامنے ادب لطیف کا رومانی افسانہ اور ہندی کے للت ساہتیہ کی پریم کہانی چراغوں کی روشنی رفتہ رفتہ ماند پڑتی جارہی تھی، لہٰذا آگے چل کر اردو یا ہندی افسانہ صرف پریم چند کے نام سے منسوب ہوگیا۔

اردو میں پریم چند کا ادبی سفر پورے شباب پر تھا کہ 1932 میں 'انگارے' کی اشاعت نے اردو افسانوی ادب میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانے کی جو بساط بچھنے والی تھی۔ 'انگارے' اُسی کا پیش خیمہ تھا۔

ہندی میں پریم چند کے بعد جے نیندر کمار نے ہندی کہانی کو ایک الگ ذائقے اور کیفیت سے روشناس کرایا۔ جے نیندر کمار کا اسلوب نگارش پریم چند ہی کی طرح سیدھا سادا اور عام فہم تھا مگر انھوں نے پہلی بار ہندی کہانی میں انسان کی نفسیاتی اور باطنی کیفیات کو داخل کرکے کہانی کو انسان کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندی افسانے کے قاری کو اپنے افسانوں کے حوالے سے وجودیت کے فلسفے سے بھی آگاہی بخشی۔ اسی لیے انھیں 'ویکتی وادی' (وجودیت پسند) کہانی کار بھی کہا جاتا ہے۔

اِدھر اُردو میں پریم چند کے ساتھ افسانہ نگاروں کا پورا قافلہ شریک سفر ہوگیا تھا۔ جن میں حیات اللہ انصاری احمد علی، محمد مجیب، سُدرشن، علی عباس حسینی، ڈاکٹر اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی اور عظیم بیگ چغتائی کے نام بہت اہم ہیں۔ 1936 میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کے فرائض پریم چند نے انجام دیے۔ پریم چند اب عینیت پرستی اور اصلاح پسندی کے دائرے سے نکل چکے تھے یا نکلنا چاہتے تھے۔ اُن کا آخری افسانہ 'کفن' اُن کے سابقہ اعتقادات کی نفی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ترقی پسند تحریک میں اُس زمانے کے نوجوان ادیبوں کا ایک بہت بڑا گروہ شامل ہوچکا تھا جن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی کے نام نمایاں ہیں۔

اُسی زمانے میں ہندی کہانی میں بھی اضطراب اور بے چینی کی لہریں محسوس کی جانے لگی تھیں۔ 'ادب برائے زندگی' کا جو تصور پریم چند نے دیا تھا اب ہندی افسانے میں پوری طرح اُجاگر ہوکر ایک نظریے کی صورت اختیار کرچکا تھا۔ اس نظریے یا رجحان کے نمائندہ کہانی کار یشپال، وشنو پربھاکر، بھگوتی چرن ورما، رانگے راگھو، امرت رائے، ناگارجن، شری لال شکل، بھیرو پرساد گپت، گووند ولبھ پنت وغیرہ مانے جاتے ہیں جنھوں نے پریم چند کی 'سماجی حقیقت نگاری' کی روایت کو بام عروج پر پہنچایا۔ یہ سارے افسانہ نگار مارکسی نظریے سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ البتہ اگیئے اور مکتی بودھ ہندی کے دو ایسے کہانی کار ہیں جو مارکسی نظریے کی بجائے کافکا، سارتر اور کامو سے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک اردو افسانے کا دامن ہیئت، تکنیک، مواد اور موضوع کے اعتبار سے کافی وسیع ہوچکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب میں بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ جنگ کے نتائج نے پوری انسانیت کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ انسانی قدروں کی بساط درہم برہم ہوچکی تھی۔ اقتصادی نابرابری اور طبقاتی کشمکش نے انسانی فکر واحساس میں زبردست تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ اُسی دوران 15 اگست 1947 کو تقسیم ملک کا تاریخی سانحہ رونما ہوا جس نے پورے صغیر میں انتشار واضطراب کی سی کیفیت پیدا کردی۔ تقسیم کے فوراً بعد فسادات کا ایسا بھیانک سلسلہ شروع ہوا کہ سارا نظام زندگی درہم برہم ہوگیا۔ افسانہ بالخصوص اردو افسانہ بھی تقسیم اور فسادات سے متاثر ہوا اور اردو میں تقسیم اور فسادات کو موضوع بنا کر بے شمار افسانے لکھے گئے۔ منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'موذیل'، 'کھول دو' اور 'یزید'، کرشن چندر کا 'پشاور ایکسپریس' اور 'ہم وحشی ہیں'، خواجہ احمد عباس کا 'اجنتا'، بیدی کا 'لاجونتی'، عصمت چغتائی کا 'جڑیں' اور حیات اللہ انصاری کا 'شکر گزار آنکھیں' فسادات کے

موضوع پر لکھے ہوئے وہ شاہکار افسانے ہیں جو موضوعی اور ہنگامی ہونے کے باوجود اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آگے چل کر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے بھی تقسیم کے المیے اور ہجرت کے موضوع پر نہایت خوبصورت افسانے لکھے۔

یوں تو ہندی میں بھی تقسیم کے موضوع پر کئی افسانے اور ناول لکھے گئے لیکن اردو کے افسانہ نگاروں نے اس وار کو اپنے سینے پر سہا تھا۔ لہٰذا تقسیم اور ہجرت کے موضوع پر جس اعلیٰ پیمانے کے افسانے اردو میں لکھے گئے ایسے کسی اور زبان میں کم ہی لکھے گئے۔ ویسے ہندی میں بھی بھیشم ساہنی کا 'امرت سر آ گیا'، بدیع الزماں کا 'پانی اور پل'، مہیپ سنگھ کا 'سہمے ہوئے' کرشنا سوبتی کا 'سکہ بدل گیا' وشنو پربھا کر کا 'میں زندہ ہوں' کملیشور کا 'بھٹکے ہوئے لوگ' اور موہن راکیش کا 'ملبے کا مالک' بھی تقسیم اور فسادات پر عمدہ کہانیاں ہیں۔

1955 کے آتے آتے ہندی میں 'نئی کہانی' کا آغاز ہو چکا تھا۔ 'نئی کہانی' کو ہندی کے نقادوں نے ہندی کہانی کا سنہرا دور کہا ہے۔ 'نئی کہانی' میں سماجی مسائل کے ساتھ انسان کی باطنی کش مکش اور اُس کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی کہانی کا موضوع بنایا گیا۔ یہی سبب ہے کہ 'نئی کہانی' میں زندگی اپنے پورے تضادات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جب قاری کہانی ختم کر لیتا ہے تو اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہانی خود اس کی ذات کا تجربہ بن گئی ہے۔

'نئی کہانی' کے کہانی کاروں میں موہن راکیش، کملیشور، راجندر یادو، شری کانت ورما، دھرم ویر بھارتی، سرویشور دیال سکسینہ، رگھوویر سہائے کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ہندی میں 'نئی کہانی' کے ساتھ ہی 'سچیتن کہانی'، اکہانی، سمانتر کہانی، سمکالین کہانی وغیرہ جیسی تحریکوں کے تحت بھی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں لیکن ان تحریکوں میں ناموں کے سوا نظریاتی سطح پر کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

70 کے بعد ایک اور تحریک وجود میں آئی جسے 'جنوادی کہانی' کا نام دیا گیا۔ جنوادی کہانی کا خاص مقصد (وِرودھ) احتجاج ہے۔ جنوادی کہانی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ 'جن وادی کہانی کار زبان و بیان اور اسلوب وغیرہ پر خاص توجہ نہیں دیتے، انتظامیہ کے خلاف بغاوت اور ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج ہی اُن کا بنیادی مقصد ہے۔ جنوادی کہانی کاروں نے نکسل وادی تحریک سے متاثر ہو کر بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ اگر ایسے ترقی پسند یا پرگتی شیل کہانی کا انتہا پسندانہ روپ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب اردو میں 'ترقی پسند تحریک' کی لے مدھم پڑھنے لگی تھی اور جدیدیت ایک طاقتور رجحان کی شکل میں اُبھر رہی تھی۔ اس عہد میں ہیئتی اور معنیاتی سطح پر بے شمار تجربے کیے گئے۔ ان تجربوں کی روشنی میں اردو افسانے نے مختلف جہتوں میں سفر کیا اور نئی زمینوں کو دریافت کیا مگر آگے چل کر ان تجربوں کی روح میں اُترنے کی بجائے ان کی ایسی اندھادھند تقلید کی گئی کہ افسانہ معنی کے اعتبار سے تو چیستاں بن گیا اور ہیئت کے اعتبار سے ایک ایسی ٹکسال جس میں افسانے سکوں کی طرح ڈھل کر نکلنے لگے۔ یک رنگ، یک خیال اور یک سُرے جن میں معنی کو کھوجنا گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ افسانے سے کردار، مکالمہ اور پلاٹ تو غائب ہو چکا تھا اب اُس سے اُس کی روح بھی چھین لی گئی یعنی افسانے سے اُس کا کہانی پن ہی غائب ہو گیا۔ تاہم اُس زمانے میں بھی چند یادگار افسانے لکھے گئے جو اردو افسانے کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ مثلاً سریندر پرکاش کا 'رونے کی آواز'، 'بجوکا' اور 'بازگوئی'، بلراج مینرا کا 'آخری کمپوزیشن'، غیاث احمد گدی کا 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی'، اقبال مجید کا 'دو بھیگے ہوئے لوگ'، رام لال کا 'چاپ'، جوگیندر پال کا 'بازیافت' وغیرہ۔

> منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'موذیل'، 'کھول دو' اور 'یزید'، کرشن چندر کا 'پشاور ایکسپریس' اور 'ہم وحشی ہیں'، خواجہ احمد عباس کا 'اجنتا'، بیدی کا 'لاجونتی'، عصمت چغتائی کا 'جڑیں' اور حیات اللہ انصاری کا 'شکر گزار آنکھیں' فسادات کے موضوع پر لکھے ہوئے وہ شاہکار افسانے ہیں جو موضوعی اور ہنگامی ہونے کے باوجود اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ہندی میں بھی 'اکہانی' کے نام پر چند تجریدی اور مبہم کہانیاں لکھی گئیں۔ دودھ ناتھ سنگھ، کرشن بلدیو وید، اور گیان رنجن وغیرہ اس رجحان کے نمائندے مانے جاتے ہیں۔

1970 کی دہائی تک آتے آتے لایعنی تجربات کا دور تمام ہوا اور اردو افسانے کے پاؤں دوبارہ حقیقت کی ٹھوس زمین پر جمنے لگے اور افسانہ ایک نئی توانائی اور نئے جذبے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اردو میں جدیدیت کے بعد کے عہد کو 'مابعد جدیدیت' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس نام کو ادب میں کلی طور پر قبول نہیں کیا گیا تاہم جدیدیت کے بعد اس کے سوا کوئی دوسرا نام اُبھر کر سامنے نہیں آیا لہٰذا 70ء اور 80ء کے بعد کے افسانے کو اگر 'مابعد جدید' افسانہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ ہندی میں بھی ستر کے بعد جن وادی تحریک کے سوا کوئی بڑی ادبی+ تحریک سامنے نہیں آئی۔ البتہ وہاں استری واد اور دلت چیتنا پر خوب کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ اردو میں بھی تانیثی ادب کے علاوہ فسادات، دہشت گردی، سیاسی جبر اور سماجی ناانصافی کے خلاف افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ 70 کے بعد خاص طور پر پاکستان سے بنگلہ دیش کی علاحدگی اور ایمرجنسی کے بعد ملک کے سیاسی اور سماجی منظرنامے میں زبردست تبدیلیاں آئیں۔ سقوط روس نے مارکسی نظریہ کی جڑ و بنیاد ہلادی اور بابری مسجد کے انہدام نے ہماری ایک ہزار سالہ مشترکہ تہذیب پر ایسی ضرب کاری لگائی کہ قومی سطح پر ہمارے باہمی اعتماد کی دھجیاں اڑ گئیں۔ زندگی روز بروز پیچیدہ اور زیادہ ہنگامہ خیز ہوتی جا رہی ہے۔ جدید ٹکنالوجی اور الکٹرانک میڈیا کی یلغار، صارفیت، پاپولر کلچر، اقتصادی بکھراؤ، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی قدروں کا زوال، ان سب نے ادب اور ادیب کو حاشیے پر ڈال دیا ہے۔ اب تو ادب کی ضرورت اور افادیت پر بھی سوال اٹھائے جانے لگے ہیں۔ آج ہندی کا کہانی کار اور اردو کا افسانہ نگار افسانہ نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں 70 اور 80 کے بعد کے لکھنے والوں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے لہٰذا ختم کلام کے طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ایسے پر آشوب حالات میں اردو اور ہندی کے جو افسانہ نگار اور کہانی کار لفظ و معنیٰ سے اپنا رشتہ استوار رکھے ہوئے ہیں وہ یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔

■

Mr. Salam Bin Razak, B-603, New Aakaar CHS, Opp. Haidary Masjid Naya Nagar, Mira Road (E), Dist. Thane - 401 107 (M.S)

مشرف عالم ذوقی

ہندی کہانیوں کا نیا منظرنامہ

آسمان میں بے شمار ستارے روشن ہیں لیکن ایک خورشید کا ظہور سب کی چمک کو ماند کر جاتا ہے۔ یہی مقام ہندستان میں بولی جانے والی بے شمار زبانوں کے درمیان اردو کو حاصل ہے۔ اس ملک کے وسیع وعریض دامن میں اردو اور ہندی کی پرورش دو بہنوں کی طرح ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ اردو زبان کو ہندی سے اور ہندی کو اردو زبان سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ اردو کا بڑا ادبی سرمایہ ہندی میں موجود ہے اور اسی طرح ہندی کے ادبی سرمائے کو اردو میں آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ آزادی کے بعد فرقہ پرست طاقتوں نے اردو کو حاشیے پر ڈالنا چاہا لیکن وہ اپنی کوششوں میں اس لیے بھی کامیاب نہ ہوسکے کہ یہ شیریں زبان غیروں سا سلوک ہونے کے باوجود اس سرزمین کے کروڑوں دلوں پر حکومت کررہی تھی اور آج بھی کررہی ہے۔ ادب کا رخ کیجیے تو ہندی زبان میں آج بھی غالب ومیر سے لے کر منٹو، عصمت چغتائی، بیدی، قرۃ العین حیدر کی حکومت برقرار ہے۔ اسی طرح پاکستان سے لے کر ہندستان تک یشپال، کملیشور، راجندر یادو، دشینت کمار کا مطالعہ کرنے والوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔

ہندی کہانیوں پر گفتگو کی شروعات ہو تو کچھ لوگ ہندی کہانیوں کا موازنہ اردو کہانیوں سے کرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کہانیاں، ہندی کہانیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو یہ کبھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اردو کہانیاں ہندی کہانیوں کے مقابلے کمزور ہیں۔ میں ایک مدت سے نہ صرف دونوں زبانوں میں لکھتا رہا ہوں بلکہ دونوں زبانوں کی کہانیاں میرے مطالعے کا حصہ رہی ہیں— اور یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں زبانوں کے اسلوب، آہنگ اور سمت جدا جدا ہیں۔ اس لیے دونوں زبانوں کے تقابلی جائزے میں ایک زبان کو ادب کی سطح پر آگے بڑھا دینا کوئی جائز فعل نہیں ہے۔ اردو کہانیوں نے آغاز سے ہی جدیدیت کی شمع روشن کی۔ یہ وہ عہد تھا جب گالزوردی، چیخوف، موپاساں، او ہنری اور ایڈگر ایلن پو کا جادو اردو والوں کے سر کر چڑھ بول رہا تھا۔ اس لیے شروعاتی دور میں ہی سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اپنا افسانوی سفر شروع کیا تو ان کہانیوں میں پو کا رنگ اور اثر غالب تھا۔ میں نے جدیدیت کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کہانیوں کو توجہ سے پڑھیے تو یہاں آپ کو روایتی رنگ وآہنگ نظر نہیں آئے گا۔ مثال کے لیے سجاد حیدر یلدرم کی ایک کہانی دوست کا خط میں ایک دوست اپنے دوسرے ساتھی کی اچھی باتوں کو یاد کرتے ہوئے اس فکر میں غلطاں ہے کہ اسے 100 میں کتنے نمبر دیے جانے چاہئیں۔ آپ غور کریں تو کم وبیش یہی رنگ ایڈگر ایلن پو کا رنگ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے کہانی کی بنت میں فنکارانہ طور پر جدیدیت کے رنگ کو بھی شامل کرلیا۔ اس لیے شروعاتی دور کے فنکاروں میں مجھے سجاد حیدر یلدرم اس لیے بھی پسند ہیں کہ یلدرم کی آنکھیں دور تک دیکھتی تھیں۔ دور تک نشانہ سادھتی تھیں— جیسے یلدرم کی ایک کہانی ہے۔ چڑیا چڑے کی کہانی سنہ اشاعت 1903-05 کے آس پاس۔ اسے بھی اردو کے شروعاتی افسانوں میں سے ایک تصور کرنا چاہیے۔ کیسی پیاری کہانی ہے۔ چڑے چڑیوں کا سنسار ہے، گھونسلہ ہے۔ اُنھی کی باتیں ہیں اور ہماری زندگی— اور حیران ہوئیے کہ یہ اردو کی شروعاتی کہانیوں میں سے ایک ہے— اور ایک صدی گزار کر ہمارے انتظار حسین جب 'ہم نوالہ' لکھتے ہیں تو بالکل چڑے چڑیوں کے انداز میں اڑ کر یلدرم کے گھونسلے تک جا پہنچتے ہیں۔ وہی انسان کی دردمندی— یہ کتھا، یلدرم کے خزانے میں ہے اور انتظار کے قصے میں بھی— دونوں طرف انسانیت کو چھو لینے کی خواہش ایک جیسی اور فرق صدیوں کا—

اس لیے یہ سمجھا جانا صحیح ہے کہ اردو افسانہ آغاز میں ہی مغرب کی پیروی کرتا ہوا اپنے نئے آسمانوں کی تلاش میں نکل گیا تھا۔

پریم چند کی بات کریں تو پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے امام ٹھہرے۔ لیکن ان کی اردو اور ہندی کہانیوں میں لہجہ زبان اور ڈکشن کے فرق کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی بارہ تیرہ برسوں میں نہ صرف یہ دنیا بدلی ہے بلکہ موضوعات کے لحاظ سے اردو فکشن کی دنیا بھی متاثر ہوئی ہے۔ شروعات میں ہندی ادب پر اردو کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے ہندی میں کملیشور، یشپال، راجندر یادو، منوہر شیام جوشی، کرشنا سوبتی، مارکنڈے جیسے تخلیق کار زیادہ کامیاب رہے جو اسلوبیات اور فکری سطح پر بھی اردو کے قریب تھے۔ 1980 کے بعد یہ دنیا تبدیل ہوئی۔ یہاں ایک بات اور بھی بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کو جہاں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی تحریکوں نے آگے بڑھایا، وہیں ہندی ادب میں اب تک کی تاریخ میں صرف ایک تحریک حاوی رہی ہے۔ جنوادی تحریک۔ یعنی 100 برسوں کے ہندی ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہندی ادب جنوادی ادب سے آگے نہیں بڑھا۔ اس لیے سنجیو ہوں یا شیومورتی، زیادہ تر فنکار صحافتی ادب کے شکار رہے یا ادب کو ترقی پسندی کے فارمولے یا پروپیگنڈا کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اور کم وبیش آج کا ہندی ادب بھی اسی جنواد کے راستے پر چل رہا ہے۔ ہندی فکشن میں نمایاں تبدیلیوں کو جگہ تب ملی جب راجندر یادو نے ہنس پتریکا کی دوبارہ اشاعت شروع کی۔ ہنس کے بانی پریم چند تھے اور پریم چند نے اس زمانے میں، ہنس میں ہندی کے تمام بڑے فنکاروں کو یکجا کردیا تھا۔ راجندر یادو نے ہنس کی نئی اشاعت کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا کہ نئے فنکاروں کی ایک بڑی دنیا آباد کی جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی فکشن بہت برے دور سے گزر رہا تھا۔ ساریکا اور دھرم یگ جیسے مشہور ہندی رسائل بند ہوچکے تھے۔ ہندی ادیب خود کو حاشیے پر محسوس کررہے تھے۔ راجندر یادو نے ہنس کی اشاعت

کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو ایک بڑا پلیٹ فارم دے دیا۔

ادئے پرکاش، سنجیو، پنکج بشٹ، للت کارتیکے، اکھلیش جیسے بڑے نام اسی رسالے کے ذریعے چمکے۔ ادئے پرکاش کا جھکاؤ فنتاسی اور طلسمی حقیقت نگاری کی طرف زیادہ تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندی کہانیوں نے کبھی بھی علامتی، تجریدی کہانیوں کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اردو میں جدیدیت کے ہنگامے سے ہندی میں 'اکہانی' کا رواج تو شروع ہوا لیکن ان کہانیوں کو خاطر خواہ مقبولیت کبھی نہیں ملی۔ اور یہ تحریک دم توڑ گئی۔ 80 کے بعد ادئے پرکاش جیسے دو چند لوگوں کی کہانیوں پر جدیدیت کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ 1960 سے 1980 کے درمیان اردو کہانیوں کا افق روشن تھا۔ اکرام باگ، قمر احسن جیسے ادیبوں سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس 25-20 برس کے عرصے میں اظہار وتخلیق کی اعلی سطحوں پر کئی ایسی کہانیاں سامنے آئیں جو بلا شک وشبہ اردو فکشن کے وقار میں اضافہ کرتی ہیں۔ بلراج مینرا، انتظار حسین، منشا یاد، فردوس حیدر، اقبال مجید (پیشاب گھر آگے ہے، جنگل کٹ رہے ہیں) سریندر پرکاش نے نئی دنیاؤں کے تعاقب سے زندگی کی لایعنیت کے فلسفے کو سامنے رکھا۔ قمر احسن نے اسپ کشت مات جیسی ناقابل فراموش کہانی لکھی— یہ وہی دور تھا جب سلام بن رزاق، علی امام نقوی، حسین الحق، شوکت حیات، عبد الصمد جیسے بڑے نام نئی کہانی اور نئے موضوعات کا احاطہ کر رہے تھے۔ اگر غور کیجیے تو 80 کے بعد ہندی تخلیق کاروں میں ادئے پرکاش جیسے لوگوں کے یہاں جو کہانیوں کی نئی فضا تھی وہ اردو کہانیوں سے مستعار تھی۔ اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی ہندی کہانی اردو کہانی کے مقابلے کم وبیش 20 سال پیچھے چل رہی تھی۔— ایک اہم بات اور بھی ہے کہ ہندی میں تجربے کم ہوئے ہیں۔ ادئے پرکاش سے نئے تخلیق کاروں تک کا جائزہ لیجیے تو تجربے کے میدان میں اردو کہانیاں ان سے آگے رہی ہیں۔ یہاں دونوں زبانوں کی کہانیوں کا تقابلی جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ دراصل یہ باتیں اس لیے زیر تحریر آئیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندی کہانیاں اردو کہانیوں کے مقابلے بہت آگے ہیں اور اردو کہانی جس کے روشن مستقبل کی داستان منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر نے تحریر کی تھی وہ زبان کہانیوں کے حوالے سے کہیں پیچھے رہ گئی ہے— اردو میں لکھنے والے کم ہیں لیکن گلوبلائزیشن اور بدلتی دنیا کے اثرات کو اردو کہانیوں میں آج بھی اسلوب، جدت اور فکری سطح پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈکشن اور فکر کی سطح پر ہندی کہانی کی ایک وسیع ترقی پسند دنیا ہے۔ سیاست، استحصال اور حقیقت نگاری کی بہتر مثالیں آپ کو ہندی کہانیوں میں نظر آئیں گی۔

کرشنا سوبتی، منوہر شیام جوشی اور نرمل ورما جیسے تخلیق کاروں نے ہندی افسانے کے افق کو روشن کیا۔ ادئے پرکاش نے انہی تخلیق کاروں کے درمیان سے اپنا راستہ بنایا۔ نرمل ورما کی کہانیوں میں فنتاسی اور طلسمی حقیقت نگاری کی چمک محسوس کی جاسکتی ہے۔ 1980 تک کئی ایسے نام سامنے آئے جنھوں نے ہندی کہانیوں کو اعتبار بخشا— سنجیو، شیومورتی، پریود، الکا سراوگی— یہ فہرست کافی لمبی ہے۔ 1980 کے آتے آتے تقسیم اور غلامی کی کہانیاں سوگئی تھیں۔ ایک ہندستان سامنے تھا۔ آزادی کو 33 سال گزر چکے تھے۔ اس درمیان فرقہ واریت کا ایک نیا چہرہ سامنے آیا تھا۔ ملک خانہ جنگی کا شکار تھا۔ رتھ یاترائیں نفرت کو فروغ دے رہی تھیں۔ رام جنم بھومی اور بابری مسجد کو لے کر ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ادھر کشمیر اور پاکستان کا معاملہ بھی گرم تھا— 80 کے بعد کئی لہولہان کہانیاں بھی ہندستان کے مقدر میں لکھ دی گئیں۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل، ہندو سکھ فسادات۔ اڈوانی کی رتھ یاتراؤں سے بدتر ہوتا ہوا ماحول اور 1992 میں بابری مسجد کا المیہ، واقعات و حادثات کی ان نئی دستکوں نے اردو کہانیوں کو بھی جدیدیت سے بغاوت کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا— اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ 80 کے بعد اردو میں بیانیہ کی واپسی ہوئی— (جس کا کچھ لوگ یہ کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں کہ بیانیہ نہ ہوا پرندہ ہوا۔ کہاں گیا تھا بھائی، واپس کیسے آیا)— اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت کا طلسم اس لیے ٹوٹا کہ مسلسل نئے نئے حادثوں نے اردو کہانیوں کو زخمی کر دیا تھا۔ افسانہ نویسوں کے لیے اب اشاروں کنایوں اور علامتوں میں باتیں کرنا گوارہ نہ تھا۔ اس لیے بھی انھیں بیانیہ کا سہارا لینا پڑا۔ ہندی افسانہ بھی ان سرد و گرم حالات سے نئے موضوعات تک آنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں سنجیو نے اپرادھ جیسی ناقابل فراموش کہانی لکھی۔ ہندی میں اس کہانی کی دھوم مچ گئی۔

اپرادھ میں سماج اور سیاست کا خوفناک چہرہ پہلی بار سامنے آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کہانی پر گفتگو اور مکالموں کے دروازے کھل گئے۔ اور اس کہانی کا ناقابل فراموش اختتام ایک عرصے تک لوگوں کی زبان پر رہا۔

''سنگھ مترا کو مارا گیا۔ اس کے گپتانگ میں رول گھسا کر۔ متھ کر مارا گیا۔''

ہندی کہانی میں اب اسٹیبلشمنٹ یا انتظامیہ کو لے کر ایک بڑی جنگ کی شروعات ہوگئی تھی۔ شیومورتی نے قصائی واڑہ لکھا۔ اسی زمانے میں ساریکا میں ادئے پرکاش کی کہانی ٹیپچو شائع ہوئی۔ ٹیپچو، ترچھ اور باون تولے کا کمر بند جیسی کہانیوں نے امکانات کے نئے دروازے کھولے۔ نقاد متوجہ ہوئے اور نئی کہانی کے حوالے سے گفتگو میں تیزی آگئی۔ ارون پرکاش نے پنجاب کے سلگتے موضوع کو لے کر بھیا ایکسپریس لکھی اور ہندی کہانی کا ایک اہم نام بن گئے۔ شیومورتی کی تریاچرتر اور سرنجے کی اور کامریڈ کے کوٹ نے قارئین کو متوجہ کیا۔ اکھلیش نے نوجوان نسل کی بے روزگاری کو لے کر چٹھی لکھی اور اس کہانی کے ساتھ اکھلیش بھی ہندی کے اہم کہانی کاروں کے قافلے میں شامل ہوگئے۔ سوئم پرکاش نے پارٹیشن لکھ کر تقسیم کے دنوں کی یاد تازہ کرادی۔

''بات بس اتنی بچی ہے کہ اس دن دوپہر میں جب آزاد چوک سے گزر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں۔ قربان بھائی کی دکان کے سامنے لطیف بھائی کھڑے ہیں۔ قربان بھائی تالہ لگا رہے ہیں انھوں نے ٹوپی پہن رکھی ہے۔''

اشتراکی نظریے کے حامی قربان بھائی کا ٹوپی پہننا اس خطرے کی علامت ہے جس سے اس وقت یہ ملک دوچار تھا۔ فرقہ وارانہ دنگوں کی آگ روشن تھی۔ اور ترقی پسند نوجوانوں کے لیے قربان بھائی کی دکان ایک ایسا ٹھکانہ تھی جہاں نکسل مومنٹ سے لے کر کمیونسٹ مینی فیسٹو تک کی باتیں ہوتی تھیں لیکن نامساعد حالات میں قربان بھائی بھی بدل گئے— ان کہانیوں کے علاوہ کچھ اور کہانیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ہنسو ہیما ہنسو، ڈیلٹا (رمیش اپادھیائے)، یہ دیہہ کس کی ہے (گری راج کشور) کرونچ ودھ (رتا شکل) اپنا (شیلیش ٹیانی) سوکھا (نرمل ورما) نورنگی بیمار ہے (شیکھر جوشی)—

سنہ 2013 تک ہندی کہانی میں نئی نسل کا دھماکہ ہوا اور ایک ساتھ اتنی بڑی تعداد سامنے آئی، جس کی گنتی ناممکن تھی۔ ہندی کے بڑے بڑے پبلشرز نے اعلان کے ساتھ نئی نسل کے فنکاروں کو خوش آمدید کہا۔ گیان پیٹھ اور ہندی رسالہ پری کتھا نے 5-4 برس کے اندر ہندی کی نئی نسل کو لے کر دس سے زیادہ خصوصی نمبر شائع کیے۔ جیوتی کماری کی کتاب دستخط ہندی کی بیسٹ سیلر بک میں شامل ہوئی۔ اور نئی نسل کو بڑا پلیٹ فارم دینے کے لیے پبلشر اور مدیر حضرات دونوں مل کر کام کرنے لگے—

آج کی تاریخ میں ہندی زبان میں بڑی بھاری تعداد میں نئی نسل سامنے آچکی ہے اور اردو کا المیہ یہ ہے کہ دور دور تک نئی نسل کے نام پر خاموشی دکھائی دیتی ہے۔ اردو میں فکر کا مقام یہ ہے کہ سلام بن رزاق سے صدیق عالم تک کی نسل کھوگئی تو اردو ادب کے مستقبل کا کیا ہوگا—؟ اور ہندی زبان میں یہ عالم کہ آپ کس کو پڑھیں اور کس کو خارج کریں۔ وانی پرکاش، راجکمل، گیان پیٹھ اور پنگوئن تک نے 20 سے 30 سال کی نسل کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور اس عمر کے فنکار اردو میں تلاش کرنے پر بھی نظر نہیں آتے۔ المیہ یہ ہے کہ نئی نسل کی سطح پر ایک طرف جہاں اردو میں سناٹا ہے، وہیں ہندی کا مستقبل روشن— ایک زبان روزگار سے الگ ہونے کے بعد زندہ رہنے کی جنگ لڑ رہی ہے تو دوسری زبان نئی نسل کی آمد سے پرامید کہ ہندی ادب کا مستقبل تابناک ہے۔

ہندی فکشن اور نئی نسل

''ان میں جوش ہے، امنگ ہے/ ان کا مطالعہ وسیع ہے
اور وہ فتح کے ارادے سے نکلے ہیں...... /

ہندی ادب آج نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ فکشن کی دنیا ہو یا کویتاؤں کی دنیا۔ یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ ایک دنیا انھیں تسلیم کرچکی ہے۔ وہ لکھنے کی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے دنیا بھر کا ادب پڑھ رکھا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ نقاد بھی ہیں۔ کہانیوں میں ان کا کوئی آئیڈیل نہیں۔ وہ اپنے آئیڈیل خود ہیں۔ لکھنے سے قبل وہ ہوم ورک کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو نوجوان ہوتے ہوئے خود کو نوجوان کہلانا پسند نہیں کرتے۔ ان کی تخلیقات میں شمشیر کی دھار اور کاٹ ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کنال سے لے کر چندن سنگھ اور پنکھڑی سنہا، سونالی تک نئی دنیاؤں کا تعاقب جاری ہے۔ یہاں فنتاسی بھی ہے۔ طلسمی حقیقت نگاری پر گرفت بھی۔ یہ اردو سے بھی محبت کرتے ہیں۔ مثال کے لیے سونالی سنگھ قرۃ العین حیدر کی بہت بڑی فین ہیں۔ اور ان کی بیشتر کہانیوں میں قرۃ العین حیدر کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ ہندی ادب میں اس سے قبل نئی نسل کی یہ 'سونامی' نہیں آئی تھی۔ ان میں زیادہ تر ایسے نوجوان ہیں جن کے پاس زبان بھی ہے اور کہنے کے لیے مضبوط لہجہ بھی۔ اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جو بلا مبالغہ نئی کہانیوں کے موجد کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی اپنی دنیائیں آباد ہیں اور ان دنیاؤں کی اپنی فنتاسی ہے اور کبھی کبھی حقیقت اور فنتاسی کے میل سے جو کولاژ بنتا ہے، وہ اتنا بھیانک ہوتا ہے کہ آپ خوف کے شکار ہوجاتے ہیں۔

'باہر جو کچھ ہو رہا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ سب کچھ نیند میں ہو رہا ہے'

چھاؤنی میں بے گھر (الپنا مصر)

یہ الپنا مصر کی کہانی ہے۔ یہ ان فوجیوں اور فوج کی سیاست کی کہانی ہے جہاں چھاؤنی میں رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی فوجی بے گھر ہوجاتے ہیں— پھر ایک لمبی گہری نیند ہوتی ہے۔ اور سب کچھ اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ سونالی سنگھ اپنی کہانی کٹھ پتلی میں عشق اور سماج کے تعلق سے ایک ایسا موضوع اٹھاتی ہیں جہاں انسان کی فطری شاعری کھوگئی ہے اور کٹھ پتلی کی دنیا جاگ اٹھی ہے۔ اکانشا پارے کی کہانی نجات میں دو محبت کرنے والوں کو شہر خموشاں کی تنہائی سکون دیتی ہے اور اس سے بہتر جگہ انھیں میسر نہیں آتی۔ 2013 تک آتے آتے اطلاعاتی نظام نے اس دنیا کو بدل ڈالا ہے۔ ہرمن ہیسے کے الفاظ میں کہا جائے تو پرانی دنیا کا زوال آچکا ہے اور نئی دنیا سامنے آرہی ہے— گلوبل گاؤں میں زندگی اور محبت کی تصویریں بدل چکی ہیں۔ شرمیلا بہرا جالان کی کہانی 'کارن سوپ' رشید جہاں کی کہانی دلی کی سیر کی یاد تازہ کراتی ہے۔ رشتے بدل چکے ہیں۔ یہاں سب اپنی اپنی شناخت کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ 25 برس کی شلپی کی کہانیاں زندگی اور فنتاسی کے میل سے حقیقت نگاری کی طرف جست لگاتی ہے۔ ان کی ایک مشہور کہانی ہے۔ جہاز دیکھا کیا؟ جہاز کہانی کی ہیروئن کے لیے فنتاسی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے پاپا چیختے ہیں۔

> ہندی کہانیوں پر گفتگو کی شروعات ہوتو کچھ لوگ ہندی کہانیوں کا موازنہ اردو کہانیوں سے کرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کہانیاں، ہندی کہانیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو یہ کبھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اردو کہانیاں ہندی کہانیوں کے مقابلے کمزور ہیں۔

'جو جہاز نہیں دیکھتے، کیا وہ نہیں جیتے۔ سمجھاؤ اسے کہ لڑکیاں جہاز نہیں، زمین دیکھتی ہوئی اچھی لگتی ہیں'

اور ایک دن وہ لڑکی بھی گم ہوجاتی ہے، جہاز بھی۔ بس ایک ڈائری رہ جاتی ہے۔

'یہ ڈائری بھی عجیب ہے۔ اس میں جو کچھ تحریر ہے، اس سے کہیں زیادہ اہم وہ ہے، جو نہیں لکھا گیا'

اور شلپی کی یہ کہانی اس نئے موڑ پر ختم ہوتی ہے۔

'وہ دیکھیے۔ میرا محبوب...... وہ جہاز...... آسمان میں لکیریں کھینچتا اڑتا ہوا...... یہ آج بھی مجھ سے پہلے نکل گیا— اب نئی شروعات کا وقت ہے'

دراصل یہ نوجوان نسل اپنے آپ کو نئے انداز اور نئے اسلوب میں ڈسکور کررہی ہے۔ نئی صدی کے 13 برسوں میں یہ ہندی کہانی کا پہلا چہرہ ہے جو نئی تبدیلی کی داستان سنا رہا ہے۔ ادئے پرکاش، الکا سراوگی سے نیلاکشی، کنال، سونالی سنگھ، سونی سنگھ تک آتے آتے کہانی اور محاوروں کی دنیا تک تبدیل ہوچکی ہے۔ سونی سنگھ اپنا کمرہ میں ورجینا ولف سے الگ اپنی تنہائیوں سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ ساری دنیا اس نسل کے لیے ایک کہانی ہے، یہاں جو کچھ وقوع ہو رہا ہے، وہ اسے سمجھنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔ سماج اور سیاست کے ہر شعبے پر ان کی نظر ہے۔ ان کی دنیا اور خیالوں کی زمین وسیع ہے۔ ان کا جھکاؤ نئے الفاظ اور نئی کہانیوں کی طرف ہے۔ یہ نئی نسل پوری طرح سے پریم چند، کملیشور اور راجندر یادو کی کہانیوں کی دنیا کو پلٹ کر اپنے نئے تیور اور انداز کو ایجاد کررہی ہے۔ ان کا احتجاج یہ ہے کہ آپ انھیں نئی نسل کیوں کہتے ہیں، آپ انھیں ادیب کہیے۔ وہ اس بات پر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تیرہ برسوں میں ہندی کہانی کی مکمل دنیا تبدیل ہوچکی ہے۔ یہ دنیا اس نئی نسل کے پاس ہے۔ یہ نسل نہ تعریف سے خوش ہوتی ہے نہ تنقید سے خائف۔ یہ نسل ہر بار نیا اور بہتر لکھنے کے راستے پر چل پڑی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اردو میں ان تیرہ برسوں میں ایسی کوئی نسل پیدا نہ ہوسکی۔ اردو میں اچھا لکھنے والے آج بھی موجود ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ایسے فنکار ہیں جو ایک بڑی عمر ادب میں گزار چکے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے......

■

Musharraf Alam Zauqui
D-304 Taj Enclave , Geeta colony, Delhi-110031

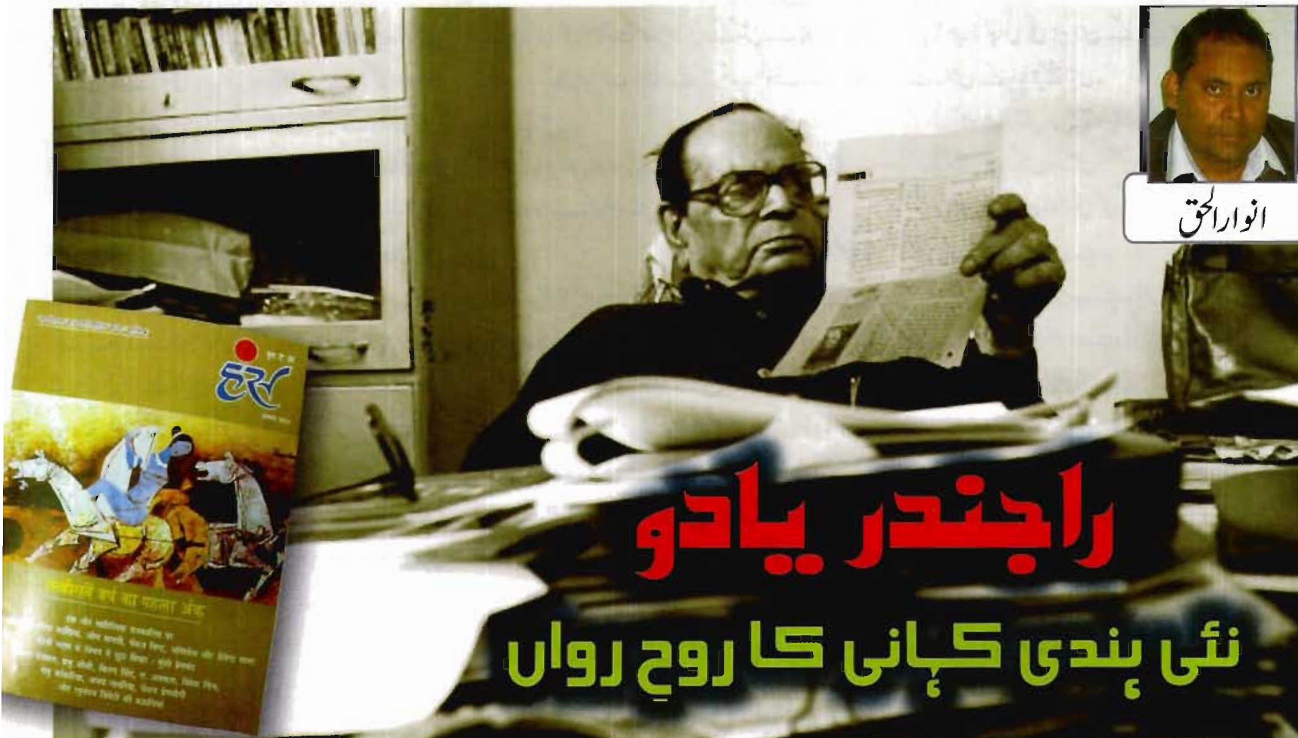

انوار الحق

راجندر یادو

نئی ہندی کہانی کا روحِ رواں

یقین نہیں آتا کہ راجندر یادو اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ راجندر جی کو محض ہندی کا ادیب کہنا قطعی مناسب نہیں وہ پورے ہندوستانی ادب کے نمائندہ تھے۔ ان کا ناول سارا آکاش اکیلے ہی ان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ پریم چند کے مشن کو آگے بڑھانے میں سب سے اہم رول ادا کرنے والے راجندر یادو کے انتقال کی خبر جب ادبی دنیا کو ہوئی تو اس ناقابل تلافی نقصان کو پورے ہندوستان نے محسوس کیا۔ وہ ادب کے سچے خادم تھے ایمانداری اور اخلاق کا مرقع تھے۔ وہ روایتوں پر آنکھ بند کر کے چلنے، روایت کو بغیر سوچے سمجھے برقرار رکھنے اور قدامت پسندی کے سخت مخالف تھے۔ ادب میں نئے تجربوں کی اکثر پذیرائی کیا کرتے تھے۔ ان کی طنز آمیز گفتگو کا ایک الگ مزہ تھا۔ وہ گفتگو کا فن جانتے تھے۔ جو بھی ان سے ایک دفعہ بات کر لے ان کا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ جب میں ان سے ملنے پہلی دفعہ ہنس کے دفتر گیا تو مجھے اس شخص کے اندر دو بڑی اہم خصوصیات نظر آئیں ایک تو یہ کہ ان کو اس بات کا علم بخوبی تھا کہ کس سے کتنی اور کس تعلق سے باتیں کرنی چاہیے۔ ان کو پڑھنا اور ان کو سننا بالکل ایک جیسا تھا۔ جو ان کا انداز تحریر ہے وہی ان کا اندازِ بیان بھی تھا۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ جب بھی بات کرتے سامنے والا ان کی قابلیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ بیمار چل رہے تھے۔

راجندر یادو کی شخصیت ہمہ جہت تھی وہ شاعر بھی تھے افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے۔ ماہنامہ 'ہنس' جس کی شروعات پریم چند نے 1930 میں کی تھی جو 1953 میں بند ہو گیا تھا اور اس کو راجندر یادو نے 31 جولائی 1986 میں دوبارہ زندہ کیا اور اپنی آخری سانس تک اس میگزن کو ایک تحریک کی طرح چلاتے رہے۔ ہنس کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے صحافت کی دنیا میں جو پہچان بنائی وہ لازوال ہے۔ ہندی میں ادبی میگزین کی کوئی کمی نہیں اس بھیڑ میں کسی میگزین کی شناخت اس طرح سے قائم کر دینا کہ وہ ہندوستانی ادب کی پہچان بن جائے کوئی آسان کام نہیں۔ راجندر یادو اکثر اپنے بیانوں کی وجہ سے میڈیا میں اختلافات کا موضوع بنے رہتے۔ آخری سانس تک انھوں نے فرقہ واریت سے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ عام روش یہ ہوتی ہے کہ لوگ وقتی فائدے کے لیے اپنے قلم کے ساتھ کیسے کیسے سمجھوتے کر لیتے ہیں۔ ہنس کے اداریے میں ان کا قلم فرقہ واریت کے خلاف ہمیشہ شعلے اگلتا رہا۔

یادو جی کی پیدائش 28 اگست 1929 کو آگرہ میں ہوئی۔ انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے 1951 میں ایم اے ہندی میں کیا۔ ان کی شائع شدہ تخلیقات میں ان کے افسانوی مجموعے دیوتاؤں کی مورتیاں، کھیل کھلونے، جہاں لکشمی قید ہے، ابھیمنیو کی آتم ہتیا، چھوٹے چھوٹے تاج محل، کنارے سے کنارے تک، ٹوٹنا، چوکھٹے توڑتے تریکون، شریشٹھ کہانیاں، پریے کہانیاں، پریم کہانیاں، چرچت کہانیاں، میری پچیس کہانیاں، اب تک کی سمگر کہانیاں۔ یہاں تک: پہلا پڑاؤ دوسرا پڑاؤ، وہاں تک پہنچنے کی دوڑ، حاصل اور دوسری کہانیاں، ناولوں میں سارا آکاش، اکھڑے ہوئے لوگ، کلٹا، شہ اور مات، ان دیکھے انجانے پل، ایک اِنچ مسکان، منترا ویدھ اور ایک تھا شیلیندر وغیرہ۔ ایک شعری مجموعہ آواز تیری ہے اور روسی کہانیوں کے ہندی تراجم کا ایک مجموعہ نرک لے جانے والی لِفٹ وغیرہ ہندی ادب میں ان کے بیش بہا تخلیقی و علمی کارنامے ہیں۔

چونکہ راجندر جی نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی ہنس کی ادارت میں گزاری اس لیے یہاں ہنس کے متعلق بات کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ہنس کو پریم چند نے قائم کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امرت رائے نے ہنس کے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی جو خود بھی ایک اچھے کہانی کار تھے۔ بنیادی طور پر افسانوں کا یہ پرچہ خواص میں بے حد مقبول ہوا۔ لوگوں نے اس میں شائع ہونے والی کہانیوں کو ہندی کہانی کے لیے سند تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ اس کے سرورق میں یہ خاص بات ہے کہ ملک و بیرون ملک کے بڑے بڑے معروف پینٹروں اور آرٹسٹوں کے فن پارے کی زینت بنتے رہے۔ ان کے اداریے بے باک آرا کے لیے بے حد مقبول ہوئے۔ ان کی ادارت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بڑی تعداد قارئین کی ایسی تھی جس کو ہندی

ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہونے کے باوجود ہنس کے پرچے کا انتظار صرف اداریہ پڑھنے کے لیے رہتا تھا۔

زندگی کی رنگینیوں کے عاشق اور بہت شوقین مزاج انسان تھے۔ عمر کے آخری وقت میں بھی تصویر کھچوانے کے لیے ہاتھ میں پائپ لے کر پوز دیتے تھے۔ ہاتھ میں پائپ کچھ اس انداز سے ہوا کرتا جیسے ستر اور اسی کی دہائی کے مقبول اداکار راج کمار کا فیشن تھا۔ زندگی کے ایک حادثے نے ان کو پیر سے معزور بنا دیا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کی کہانیوں میں معزور کردار جن کا تعلق اوسط طبقہ سے ہوتا ہے شاید اسی وجہ سے بہت مضبوطی سے سامنے آتے ہیں۔ نوجوان اور جوشیلے لڑکے لڑکیوں کا کردار ان کے یہاں بہت مؤثر انداز سے سامنے آتا ہے۔ انھیں ہندوستان اور ہندی سے محبت تھی۔ انھیں اوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے سماج کی فکر تھی۔ پریم چند کی نئی کہانی کی مہم کی روح بھی یہی تھی کہ کہانیاں صرف حویلیوں کے ارد گرد چکر نہ لگائیں۔ بدلتی ہوئی اس دنیا کے مطابق ادب کا معیار بھی بدلنا چاہیے۔ پریم چند کا مشہور قول کہ اب حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ راجندر یادو کی پوری ادبی زندگی پریم چند کے اسی قول کی تشریح معلوم ہوتی ہے۔ اندھی سماجی اور تہذیبی روایتوں کے خلاف بولتے وقت نہ ان کی زبان میں کبھی لکنت ہوئی اور نہ ہی ان کا قلم کبھی جھجکا۔ انھوں نے اپنے میگزین کے ذریعے ہمیشہ نوجوان قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ عورتوں اور دلتوں کے استحصال کے خلاف بلند اور بے باک آواز ان کی تخلیقات کی روح ہے۔

ادیب کا فرض منصبی کیا ہونا چاہیے۔ ادب کی سمت کیا ہونی چاہیے؟ ایک ادیب کو کس حد تک سماج کی پروا کرنی چاہیے؟ ان سب سوالوں کا جوابات راجندر یادو کی تخلیقات میں موجود ہیں۔ اپنی بے باک اور بے لاگ تبصروں کے لیے مشہور رہے اور ہمیشہ سرخیوں میں بھی رہے۔ یار باش طبیعت کے مالک تھے خواہ مخواہ کی روایت کی پیروی کبھی نہیں کرتے تھے۔ راجندر یادو کے والد متھرا میں ڈسٹرکٹ بورڈ میں ڈاکٹر تھے۔ لکھنے کی تحریک ان کو کہاں سے ملی اس تعلق سے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کے پیر کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا اس نے انھیں لکھنے کی طرف راغب کیا۔ قریب چودہ سال کی عمر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہاکی کھیلتے ہوئے لڑائی جھگڑے میں ان کے پیر میں چوٹ آئی اور اس کا علاج نہیں ہو سکا ان کی بچپن کی تعلیم اردو میں ہوئی۔ انھوں نے عالم اور فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں ان کے والد بچپن میں انھیں داستانِ امیر حمزہ اور حاتم طائی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ راجندر یادو نے بہت کم عمری اردو کی کلاسک کہانیاں پڑھ لی تھیں۔ والد صاحب ڈاکٹر ہونے کے باوجود ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ دس بھائی بہنوں میں عمر میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے ذمے داری کا احساس بھی یادو جی کو زیادہ تھا۔

جس وقت اور جس زمانے میں راجندر یادو لکھ رہے تھے اس وقت پرگتی شیل لیکھک سنگھ ہندوستان میں عروج پر تھا۔ اسی زمانے میں ان کا معاشقہ بھی ہوا۔ عشق کے متعلق راجندر جی کچھ چھپاتے نہیں انھوں نے جس سے محبت کی اس سے ان کی شادی نہیں ہو پائی اور جس سے شادی کی وہ بھی ایک مشہور کہانی کار تھیں۔ منو بھنڈاری ان کا نام تھا۔ ان کی شادی کامیاب نہیں رہی۔ وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ان کی بیوی کے ان کی زندگی میں آنے سے پہلے سے ان کا رشتہ کسی اور سے تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے لکھتی تھیں جس سے وہ بہت متاثر تھے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اپنے معاشقے کے تعلق سے انھوں نے اپنی بیوی سے کبھی کچھ نہیں چھپایا اور ان سے شادی کرنے سے پہلے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ انھوں نے منو بھنڈاری سے شادی تب کی جب ان کی محبوبہ نے ان سے شادی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ راجندر جی کی دوست بن کر تو رہ سکتی ہے لیکن ان کی بیوی بن کر نہیں تب انھوں نے منو بھنڈاری سے شادی کی۔

سنہ 1980 میں ایک وقت ایسا آیا جب راجندر یادو کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ان کے اندر کہنے کو کہانی نہیں رہی۔ ان کے اندر کا تخلیق کار اب مر چکا ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے ہنس کی ادارت شروع کی تو اس کے بعد انھوں نے کہانیاں یا ناول نہیں لکھے اور بطور ایک نظریہ ساز کے اختلافی مسائل کو ہوا دینے کے لیے ہمیشہ سرخیوں میں رہے۔ وہ خود کہتے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں کو زبان دی جن کی باتیں سنی نہیں جاتی تھیں۔ دلت ،عورتیں، اقلیت اور آدیباسیوں کے حقوق کی آواز اٹھانا ان کو بہت محبوب تھا۔ پچھلے پچیس سالوں میں کہانیوں میں جو تبدیلیاں آئیں اس کے متعلق راجندر جی کا یہ خیال تھا کہ اب جو کہانی کار ہیں وہ کہانی کو کچے مال کی طرح بچھا دیتے ہیں۔ آج کی کہانیوں میں تفصیلات زیادہ ہوتی ہیں جو کہانی پن کو زخمی کر دیتی ہیں اور یہ کہانیوں کے لیے بہت نیک فال نہیں۔ ان کے مطابق شخصیت کی تعمیر سماج کا انکار کرنے اور سماجی روایات کی نفی کرنے سے ہوتی ہے اور یہ باتیں اب ختم ہو رہی ہیں اس لیے کہانی مجروح ہو رہی ہے۔

نئی کہانی کے بدلتے رنگ اور اقدار پر گفتگو کرتے ہوئے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو کے دوران راجندر جی نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے یہ باتیں کہی تھیں۔ ہندی میں نئی کہانی کو جلا بخشنے والے ایسے سب سے بڑے ادیب جنھوں نے نئی کہانی کی شروعات سے لے کر اکیسویں صدی کے تیرہ سال تک ہندی کتھا کا سفر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں بلکہ زمانے کے بدلتے رنگ کے ساتھ کہانی کا بدلتا رنگ بھی دیکھا اور اس کی ترقی میں خود بھی لاثانی کردار ادا کیا۔

ظاہر ہے کہانی بدلی ہے۔ لیکن اس میں خوبیوں نے جگہ لیا ہے یا خامیوں نے۔ کہانیوں کی رفتار تیز ہوئی ہے یا مدھم۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کہانیوں کی خوبی یا خامی کی بات ہی نہیں بلکہ پرانی نسل اور نئی نسل کے اقداری افتراق کی وجہ سے پرانے لوگوں کی نظر میں نئی کہانی زوال پذیر لگ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اچھے برے کا وہ پیمانہ ہی اب بدل گیا جس پر فکشن کی خوبیاں اور خامیاں طے کی جاتی تھیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ کہانیوں کا بدلنا فطری عمل ہے۔ مگر سوال عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں آیا مثبت ہیں یا منفی۔ اگر مثبت ہیں تو کہانی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور اگر منفی ہیں تو ظاہر ہے کہانیاں رو بہ زوال ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ پرانی نسل کا انسان اپنی پرانی اقدار کی پابندی میں نئی نسل کے محسوسات کو اس طرح سے کبھی نہیں سمجھ سکتا ہے جس طرح نئی نسل کے لوگ نئی نسل کو سمجھتے ہیں۔ راجندر یادو کہانیوں کے معاملے میں ان اقدار کے پاسدار تھے جن کی بنا پریم چند نے بیسویں صدی کے اوائل میں ڈالی تھی یا جن روایتوں کے امین ٹیگور تھے۔ اب وقت بدل رہا ہے کہانیاں بدل رہی ہیں اقدار بدل رہے ہیں نئی نسل کی سوچ بدل رہی ہے تو ایسے حالات میں نئی نسل کی کہانیاں ہو بہ ہو پرانی نسل کی تکنیک میں نہیں کہی جا سکتیں، تکنیک بھی بدلے گی۔ مثال کے طور پر پرانے نسل کے لوگ اپنے بزرگوں کے سامنے اپنی باتیں بلا واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ سیدھے سیدھے اپنی باتیں کہنے کے بجائے تمہید، اشاروں اور کنایوں میں اپنی باتیں کہنا اور ان کو سمجھنا علمِ بیان کا حسن ہوا کرتا تھا۔ اب وقت بدل گیا نئی نسل روایتوں کی امین نہیں، نا ہی تمہید اور اشاروں کنایوں میں باتیں کرتی ہے، تو کہانیوں پر اس نئی تہذیب کا اثر فطری ہے۔ چونکہ راجندر یادو اس وچار دھارا کو آگے بڑھا رہے تھے جو پریم چند نے شروع کیا تھا اور بدلتے ہوئے زمانے کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اس طرح سے ان کی شخصیت اس لحاظ سے بہت قیمتی تھی کہ

انھوں نے کہانیوں کے بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر اکیسویں صدی کے اوائل تک کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔

آج کا فنکار ان روایتوں کی پاسداری کرنا تو چاہتا ہے مگر اس کے سامنے حالات اور ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کے مطابق نئی نسل کے تقاضے اور ہیں۔ آج حقیقت نگاری سے آگے کی دنیا ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری (Magic Realism) اور موہوم حقیقت نگاری (Hallucinatory Realism) کی دنیا میں نئی نسل کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ نئی نسل کے ساتھ ساتھ نئی کہانیوں کی بھی راہیں کسی اور منزل کی طرف گامزن ہیں۔ کہانیوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان میں پوشیدہ حسن کے معیار کی پرکھ کرنے کے پیمانے بھی اب بدل چکے ہیں۔ اور آج کے تنقیدی پیمانے ظاہر ہے پرانے پیمانوں سے مختلف ہیں اور ایسا ہونا کچھ عجیب نہیں۔ چونکہ نئی کہانی کی بنیاد پڑتے ہی فکشن کی تنقید کا معیار بدل گیا تھا۔ اس زمانے میں بھی نئی کہانیوں کی سمت و رفتار پر تنقیدیں ہوئی تھیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو زمان و مکان کے حدود سے باہر تمام تنقیدی پیمانوں پر کھری اترتی ہیں۔ ٹیگور کی کہانیاں آج بھی relevant محض اسی وجہ سے ہیں کہ وہ ہر زمانے کے تنقیدی پیمانوں پر کھری اترتی ہیں۔ اس طرح کی کہانیاں ہر زمانے میں لکھی گئی ہیں جن میں مندرجہ بالا کسی بھی حقیقت نگاری کے پیمانے پر ان کی تنقید کی جائے وہ ہمیشہ اولیت رکھتی ہیں۔

بلاشبہ راجندر یادو نے کچھ ایسی کہانیاں لکھیں جو all time hit کے درجے میں شمار کی جاسکتی ہیں اور کسی بھی تنقیدی آلے کو بروئے کار لاکر ان کہانیوں کو پرکھا جاسکتا ہے۔ 1999 سے 2001 تک راجندر یادو پرسار بھارتی بورڈ کے ممبر رہے۔ اس درمیان NDA کی حکومت تھی۔ یادو جی کا نظریاتی تعلق بائیں بازو سے تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کبھی بائیں بازو کی کسی سیاسی پارٹی کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کے انھوں نے اپنے نظریے کو ادب تک محدود رکھا۔ ان کے ادبی نظریے کی کڑی اس سماجی نظریے سے ملتی ہے جس کی بنیاد پریم چند نے ڈالی تھی۔ راجندر یادو کی سب سے بڑی خوبی سیکولرزم کے لیے ان کی شدت پسندی تھی۔ وہ اس قدر ششدر تھے کہ کبھی کبھی تو خود کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ انھوں نے اپنے میگزین ہنس میں مسلمانوں، دلتوں، عورتوں اور آدیواسیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ جس زمانے میں راجندر یادو لکھ رہے تھے اس زمانے میں ان کو ایسے قلمکاروں کا ساتھ ملا جن کو ادب اور فکشن پر پورا بھروسہ تھا۔ موہن راکیش، کملیشور، دھرم ویر بھارتی، نامور سنگھ اور منو بھنڈاری، نرمل ورما، بھیشم ساہنی وغیرہ اس زمانے کے مشہور قلمکار تھے جنھوں نے راجندر یادو جی کے ساتھ مل کر نئی کہانی کی تحریک کو آگے بڑھایا اور ادب میں خود بھی بڑا مقام پیدا کیا۔

کملیشور کی تخلیق 'کتنے پاکستان' کی شہرت سے ادب سے سروکار رکھنے والا شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو واقف نہ ہو۔ پدم بھوشن کملیشور کے علاوہ ان تمام لوگوں کی ایک خاص بات تھی کہ یہ سب لوگ بڑے تخلیق کار تھے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی اخبار یا میگزین کی ادارت سے بھی وابستہ رہے لہٰذا انھیں نئی کہانی کے لیے کام کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ ایک اہم بات یہ کہ راجندر یادو کا قد شاید بحیثیت فکشن نگار اپنے ان مذکورہ بالا معاصر فکشن نگاروں سے اونچا بھلے ہی نہ رہا ہو، کیوں کہ انھوں نے فکشن کی تخلیق کو 1980 ہی میں الوداع کہہ دیا تھا، مگر انھوں نے نظریاتی سطح پر نئی کہانی کی مہم کو جس طرح آگے بڑھایا وہ مثالی تھا۔ ان کی کاوشوں نے نئی کہانی کو اکیسوی صدی کی دہلیز تک لا چھوڑا جہاں نئی نسل کے نوجوان اس تحریک کو نئے تقاضوں کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے کھڑے ہیں۔ ان سب کے باوجود راجندر جی کا اس طرح اس دنیا سے گزر جانا ذرا عجیب لگتا ہے۔ مذہبی شدت پسندی کی عار میں اپنی سیاسی روٹیاں سینکنے والوں کو دھول چٹانے والا اب راجندر یادو جیسی کوئی بیباک شخصیت ادب کی دنیا میں باقی نہیں۔ بیباک، مصلحت سے عاری، کھری کھری باتیں اب کون کرے گا۔ اپنے اداریے میں تمام سیاسی چالوں کی قلعی اب کون کھولے گا۔

> **ادیب کا فرض منصبی کیا ہونا چاہیے۔ ادب کی سمت کیا ہونی چاہیے؟ ایک ادیب کو کس حد تک سماج کی پروا کرنی چاہیے؟ ان سب سوالوں کا جوابات راجندر یادو کی تخلیقات میں موجود ھیں۔ اپنی بے باک اور بے لاگ تبصروں کے لیے مشھور رھے اور ھمیشه سرخیوں میں بھی رھے۔ یارباش طبیعت کے مالک تھے خواہ مخواہ کی روایت کی پیروی کبھی نھیں کرتے تھے۔ راجندر یادو کے والد متھرا میں ڈسٹرکٹ بورڈ میں ڈاکٹر تھے۔**

سیاسی مفاد کے لیے قلم کا سودا کرنے والے ہی کیا اب ادب کے نصیب میں رہ گئے ہیں یا اب کوئی ادب کا بے لوث خادم ہماری نسل سے بھی اٹھے گا جو راجندر یادو کی طرح بے خوف ہو کر بولے گا۔ یہ تو اب وقت ہی بتائے گا راجندر یادو کی موت پر پورے ہندوستانی ادب کے قافلہ سالاروں، قلمکاروں، تحقیق کاروں، شاعروں اور فکشن نگاروں کی آنکھیں نم ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ اب اس طرح کا جنون رکھنے والے کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔

راجندر یادو جس کو سچ سمجھتے تھے لکھتے اور بولتے تھے۔ ادبی اعزاز و اکرام کا کوئی لالچ ان کو کبھی نہیں تھا۔ ہنس کی ادارت کے قریب قریب پچیس سالوں میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی کہ انھوں نے کسی سیاسی یا سماجی فائدے کے لیے کسی کی بے جا تعریف یا چاپلوسی کی ہو۔ انھوں نے جب بھی قلم اٹھایا سچ لکھنے اور سماج کی بہتی ہوا کے خلاف چلنے کے لیے اپنے قلم کا استعمال کیا۔ کسی کی ہاں میں ہاں ملانا انھیں بے حد ناگوار تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے بندشوں یا سیماؤں میں بندھے رہنا بالکل پسند نہیں میں سماج کے رتی رواجوں میں بندھ کر نہیں رہ سکتا۔ سماج کی بندشیں ہماری پرواز کو روکنے کے لیے بنائی جاتی ہیں ہمارا کام ہے کہ ہم ان بندشوں کو توڑ کر آگے نکلیں۔ وہ کسی چاپلوس ذہن کے شخص کو جس کی اپنی کوئی سوچ نہ ہو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ یار باش اور مجلسی تھے ہمیشہ دوستوں کے بیچ رہنا انھیں پسند تھا، اس کے باوجود بھی وہ ہاں میں ہاں ملانے والے لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ بھلے ہی ان کی آئیڈیولوجی سے کوئی اتفاق نہ کرے وہ ان کی نظر میں عزیز ہوا کرتا تھا بہ نسبت اس کے کہ کوئی ایسا شخص جس کا اپنا کوئی ویژن نہیں۔

ہندوستانی کہانیوں کی تاریخ میں ہنس کا سفر بے حد اہم سفر ثابت ہوگا۔ ہنس کی ہندی خدمات پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔ ہنس کے اب تک کے اداریے کتابی صورت میں لانے کی ضرورت ہے۔ نئی کہانی کے اس سپاہی کو اگر ہم سچا خراجِ عقیدت دینا چاہیں تو ہمیں ہنس کی خدمات کا اعتراف کرنا ہوگا۔

راجندر یادو کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان کے چاہنے والے صرف ہندی زبان کے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے ادیب اور ادب فہم حضرات تھے۔ راجندر یادو کو ہمیشہ ان کی ادبی خدمات کے لیے یاد رکھا جائے گا۔

■

Dr. Anwarul Haque
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

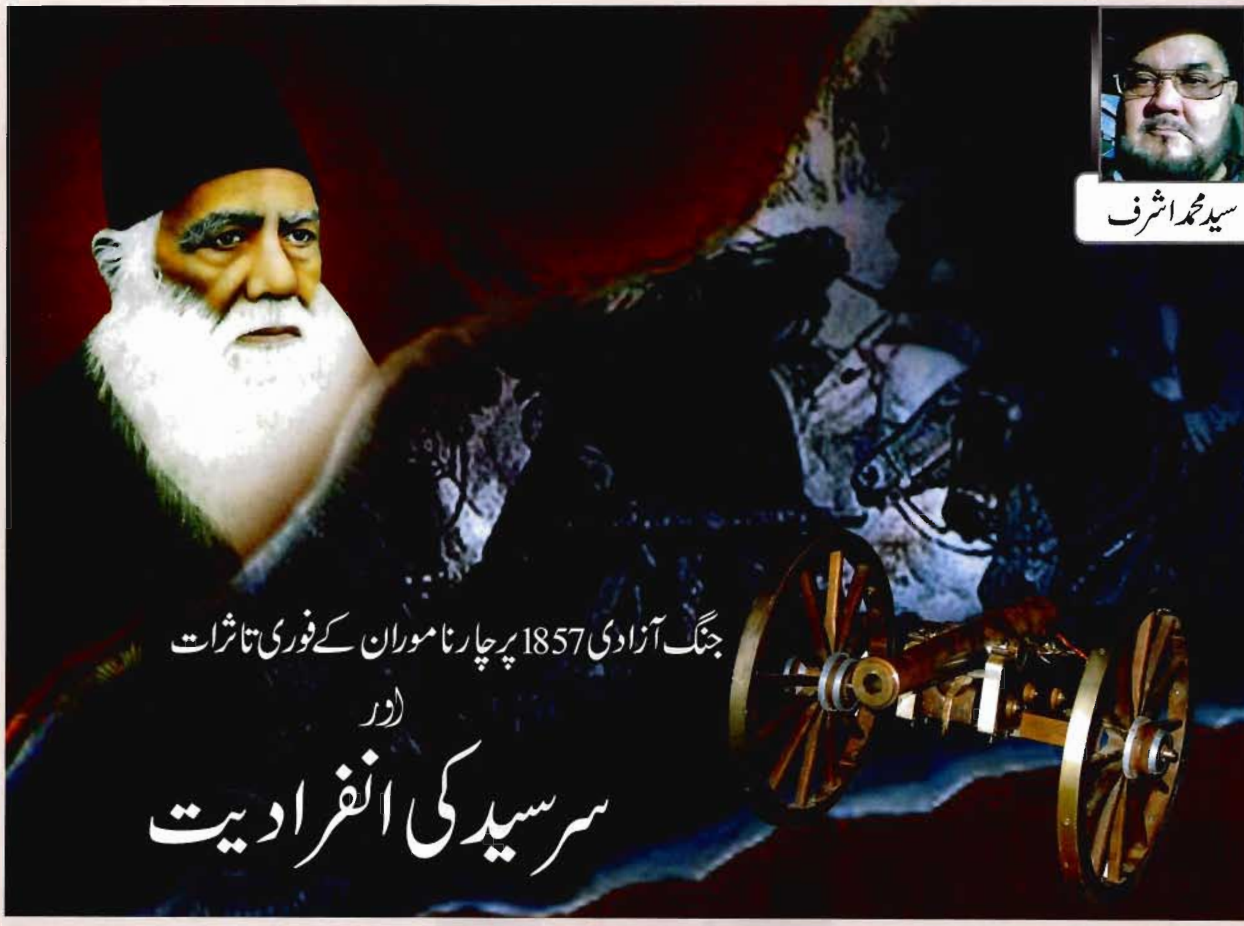

سید محمد اشرف

جنگ آزادی 1857 پر چار ناموران کے فوری تاثرات
اور
سرسید کی انفرادیت

سرسید کے ماہِ پیدائش کے پہلے دن سرسید میموریل لیکچر کے واسطے دانش گاہِ علی گڑھ کے اس ادنیٰ طالب علم کو ہدایت دینے کا مقصد غالباً یہی ہوگا کہ دیکھا جائے کہ 40 برس پہلے جو سبق پڑھایا تھا وہ اب یاد ہے کہ بھول گیا۔ صاحبو! آموختہ دہرانے حاضر ہوگیا ہوں اس گزارش کے ساتھ کہ اگر الفاظ بدلے ہوئے نظر آئیں تو یادداشت کی کوتاہی پر محمول کر کے صرفِ نظر کیجیے گا۔ کچھ فرق اس لیے بھی ہوگا کہ علی گڑھ میں رہ کر علی گڑھ کو دیکھنے اور باہر سے علی گڑھ کو دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بقول شاعر— آنکھ جو قریب اور دور سب دیکھ لیتی ہے لیکن خود اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتی جب تک کہ آئینہ سامنے نہ ہو—. شعر کے مفہوم میں آئینے کے حوالے سے تعلّی کا جو مفہوم در آیا ہے وہ ہرگز مطلوب و مقصود نہیں کہ علی گڑھ کے حوالے سے میرا آئینہ تو ہمیشہ سے خود علی گڑھ ہی رہا ہے۔ علی گڑھ ہمارا آئینہ بھی ہے، آئینہ گر بھی ہے اور آئینہ خانہ بھی۔ خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے— مجھے جو موضوع بتایا گیا ہے وہ ہے سرسید— حالات و افکار کی روشنی میں۔ یہ موضوع تو علم دریاؤ ہے۔ خدشہ اس میں صرف یہ ہے کہ غواصی کی زیادہ کوشش کی تو ڈوب جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔ حالانکہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب اس موضوع کی گہرائیوں میں ڈوب جائیں:

فیصلہ کر کم و بیشِ تہِ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے، ابھر آنے کا نہیں

جب علی گڑھ کے لیے عازمِ سفر ہوتا ہوں تو چھوٹی بڑی بہت سی خواہشیں دل گدگداتی ہیں۔ سوچتا ہوا اس بار علی گڑھ پہنچ کر:

1. میکڈانل ہاسٹل کے فوارے کی فصیل پر کچھ دیر بیٹھوں گا اور ممکن ہوا تو لان میں والی بال بھی کھیلوں گا۔
2. ہاکی گراؤنڈ کی باؤنڈری کے پاس کھڑے ہو کر دیکھوں گا کہ اسٹک اور گیند میں کیسی چشمک ہو رہی ہے۔
3. کرکٹ پویلین میں بیٹھ کر کسی کو چھکا لگاتے دیکھوں گا کہ اولڈ بوائز لاج کی سائڈ سے بیٹس مین لانگ آف پر جب چھکا لگاتا تھا تو گیند کی اٹھان ایسی نظر آتی تھی گویا ایک سرخ پرندہ جامع مسجد کے بلند مینار پر بیٹھنے کے لیے محوِ پرواز ہے۔
4. یا جامع مسجد اور اسٹریچی ہال کے درمیان کھڑے ہو کر دائیں بائیں ششدر ہو کر دیکھوں گا کہ اس مردِ جلیل سرسید نے کیسی جلالت مآب عمارتیں تعمیر کرائی تھیں کہ جلال و جمال، نفاست و ضرورت، آرائش و زیبائش، دلربائی اور رعنائی آپس میں شیر و شکر ہو کر اینٹ اور گارے کا غازہ مستقل بن گئے ہیں۔
5. یا دانش گاہ کی شاہ راہِ خاص پر کھڑے ہو کر اسٹاف کلب کی چھت پر رکھی تین بڑی کتابوں کو بغور دیکھوں گا کہ اساتذہ کے ذریعے اُن پر لکھے نادیدہ الفاظ پڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے یا اسے صرف چھت کی ڈیزائن سمجھ کر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر نکل لیا جاتا ہے۔
6. یا منٹوئی کے قبرستان میں جا کر فاتحہ پڑھوں گا اور پوچھوں گا:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اور برابر کی ایک قبر سے آواز آئے گی: ''اے ہمارے ہم جماعت دوست سید شاہ آلِ عبا آوارہ کے پوتے! ہمیں بتاؤ کیا اب بھی علی گڑھ کے طلبا پر پروفیسروں کا اور پروفیسروں پر طلبا کا دھوکہ ہوتا ہے اور میں رشید احمد صدیقی کی قبر کے پاس شرمندہ کھڑا رہ جاؤں گا۔

برابر کی قبر سے آواز آئے گی۔'' اماں اشرف! اب کے بہت دن بعد آئے۔ دیکھو فلاں فلاں ہاسٹل کے کچھ

لڑکوں کی فیس ابھی تک ادا نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے حساب میں تم ادا کر دو جب یہاں آؤ گے تو ہم تمھارے گاما بھائی عالم بالا میں تمھارا سب قرض ادا کر دیں گے۔

7. جی چاہتا ہے کہ شام ڈھلے کینیڈی ہاؤس جا کر دیکھیں کہ وہاں داستان و افسانہ، شعر و نغمہ، اسکٹ و ڈرامہ، تقریر و بیت بازی کی محفلیں اسی زمانے کی طرح گرم ہیں کہ نہیں کہ جس زمانے کو یاد کر کے اکثر یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

غلط کہا تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے
اچھا! میرا عہدِ جوانی کوئی ذرا دہرائے تو

جی چاہتا ہے کہ اسد یار خاں کے ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مکتبہ جامعہ پر اُسی طرح گھنٹوں کھڑا ہوا جائے جیسے 41برس پہلے کھڑے ہوتے تھے اور پھر اسی طرح کچھ کتابیں نقد اور کچھ کتابیں اُدھار خریدی جائیں۔

لیکن کیا کروں شوقِ جاناں نے تمنائیں کثیر اور غم روزگار نے وقت مختصر کر دیا ہے۔ دل مارنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا—

مندرجہ بالا تحریر سے شاید کچھ اندازہ ہوتا ہو کہ آج سے چار دہے پہلے کے علی گڑھ میں شوق و ذوق کی شوخیِ رفتار کا عالم کیا تھا۔

حاضرین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس تفصیل میں کلاس روم غائب ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس بندۂ خاکی کو کلاس روم سے ذرا عار تھا۔ کلاس روم سے نظر بچا کر نکل جانے میں مجھے وہ یدطولیٰ حاصل تھا کہ اکثر اساتذہ اسے میری خاندانی کرامتوں کی توسیع سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی نوجوان استاد راستہ روک کر پوچھ بیٹھتا تھا کہ کیوں اشرف صاحب! آپ کو آخری بار کب دیکھا تھا؟ میں عرض کرتا، ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد نہیں نمائش میں جھولے والی گلی میں ہم دونوں نے ایک ساتھ موت کے کنویں کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اس قسم کی برجستہ یاددہانی پر ہمارے استاد معاملہ وہیں رفع دفع کر دیتے تھے۔

جب بی اے اور ایم اے میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ دو گولڈ میڈل بھی ملے تو لینے کو تو لے لیے لیکن راتوں کو اٹھ اٹھ کر مارک شیٹ نکال کر بار بار دیکھتا تھا کہ ان پر مجھ سے ملتا جلتا نام کس طرح لکھ دیا گیا۔

ابھی چند برس پہلے کوئی ایک مارک شیٹ سامان میں غتربود ہوگئی۔ مجھے تلاش میں سرگرداں دیکھا تو اہلیہ نے دلدہی کے لہجے میں کہا، ''آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ رجسٹرار آفس میں درخواست دے کر کاپی نکلوالیں۔'' میں نے عرض کیا، ''نیک بخت! ویسی مارک شیٹ نکلنا مشکل ہے، کمپیوٹر ہر دفعہ یکساں غلطی نہیں کر سکتا۔''

آیئے پھر سرسید کی طرف رجوع ہو جائیں۔

کسی شخص کی عظمت امتیاز کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

امتیاز انفرادیت پیدا کرتا ہے اور اسی انفرادیت سے انسان کو وہ اعتماد ملتا ہے کہ اسے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانا سہل لگنے لگتا ہے۔ امتیاز اور انفرادیت اگر اپنے سے کم صلاحیت والوں کے مقابلے ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لطف تو جب آتا ہے جب پنجہ پنجۂ خورشید میں ڈالا جائے۔ اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ میرا مختصر مطالعہ مجھے اس نتیجے کی طرف راغب کرتا ہے کہ بغاوت 1857 کے معاصرین میں، اس جنگ آزادی کے تعلق سے— غالب، کارل مارکس، سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کے فوری تاثرات کا انداز جدا جدا ہے۔ تاثر شخصیت اور ذات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا جدا جدا ہونا

عین فطری تھا لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ فوری تاثر کے جداگانہ رنگ میں جو انفرادیت سرسید احمد خاں کو حاصل تھی اور اس انفرادیت کی تکمیل و توسیع سے انھوں نے جس طرح ذات کے غم کو کائنات کا غم سمجھا اور اس کا مداوا جس نہج پر کیا وہ ان کا ایسا امتیاز ہے جس میں ان کا کوئی معاصر ان کا ثانی نہیں۔ نذیر احمد تو خیر قد میں بہت چھوٹے تھے، مارکس اور غالب جیسے دنیاوی وجاہت کے حامل افراد بھی سرسید احمد خاں کی طرح غدر کے ردعمل سے پیدا شدہ حالات میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے وہ نسخۂ کیمیا نہیں تجویز کر سکے جسے سرسید نے نہ صرف تجویز کیا تھا بلکہ اس نسخے کے اجزا کے ساتھ اپنی ذات اور شخصیت کو بھی کھرل میں ڈال پیس دیا تھا، یکجان کر دیا تھا۔

آیئے سب سے پہلے دیکھیں کہ مارکس اور اینگلس کے تاثرات کے بارے میں ڈاکٹر ارجمند آرا کیا لکھتی ہیں:

''دراصل 1850 کے اوائل ہی سے یہ دونوں مفکرین سرمایہ دار ممالک کی نوآبادیاتی پالیسی اور محکوم قوموں کی تحریکاتِ آزادی میں خصوصی دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ایشیائی ممالک، خصوصاً برصغیر، انگریزوں کے سفاکانہ منصوبوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں مارکس اور اینگلس یہاں سے پہنچنے والی ہر طرح کی خبروں کا بصیرت افروز تجزیہ کر رہے تھے۔ پرولتاری نقطۂ نظر سے مارکس کو ان تحریکات کے تاریخی انجام سے خصوصی دل چسپی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ کے تمام اہم واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے بغاوت کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی ناکامی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی۔'' (1857 پر ادب ساز میں دہلی کا خاص نمبر، 2007)

مارکس نے ان واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''انگریز جسے فوجی بغاوت کا نام دے رہے ہیں وہ فوجی بغاوت نہیں بلکہ ایک قومی بغاوت ہے۔ بغاوت کے ابتدائی دنوں میں جب انگریز قوم تک بھی اس وہم کا شکار تھی کہ یہ محض ایک فوجی بغاوت ہے جس کا دائرہ اثر کلکتہ پریزیڈنسی سے باہر نہیں ہے۔ مارکس کی یہ تیز نگہی ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ انھیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ ایک قومی بغاوت ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے میں مارکس نے ہندوستان کے اقتصادی اور سماجی حالات کا اور انگریزوں کی متعارف کرائی ہوئی پالیسیوں کا مشاہدہ بھی کیا اور سرمایہ داری کے طریق واردات کے اصولوں کو ذہن میں رکھ کر نتائج اخذ کیے اور یہ اندازہ کر لیا کہ ہندوستان میں عوام کس ذہنی، سماجی اور اقتصادی دور سے گزر رہے ہیں اور آئندہ زمانے میں حالات کون سا رُخ اختیار کریں گے۔'' (ایضاً)

مارکس کے مطابق جنگ آزادی نے نہ صرف مختلف مذہبوں (ہندو اور مسلمان) اور ذات برادریوں کے لوگوں کو (برہمن، راجپوت) بلکہ مختلف سماجی طبقات کے لوگوں کو بھی متحد کر دیا تھا۔ مارکس نے ایک مضمون میں لکھا:

''ایسا پہلی بار ہوا جب سپاہیوں کی رجمنٹوں نے اپنے افسروں کو قتل کر ڈالا ہے، جب باہمی نفرتوں کو بھول کر مسلمان اور ہندو اپنے مشترکہ آقاؤں کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ جب ہندوؤں کی شروع کی ہوئی بغاوت نے دلّی کے راج سنگھاسن پر بالآخر ایک مسلمان بادشاہ کو بٹھا دیا ہے۔'' (ایضاً)

مارکس کے مطابق بغاوت کے اسباب یہ تھے:

''ہندوستان کا جاگیرداری نظام، مذہب اور ذات پات پر مبنی معاشرہ اور اس کے تضادات اور بغاوت کی

سید محمد اشرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سر سید میموریل لیکچر دیتے ہوئے

سربراہی کرنے والے جاگیرداروں کی غداری وغیرہ ایسے اسباب بن گئے جن سے یہ بغاوت ناکام ہوگئی۔ ان کے نزدیک مرکزی قیادت کا فقدان اور متحدہ فوجی کمان کا نہ ہونا اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب تھا۔'' (ایضاً)

یہ بات مدنظر رہنا چاہیے کہ مارکس کی تحریریں عین جنگ آزادی کے زمانے کی ہیں یعنی 1857 اور 1858۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے واقعے کو اتنی دور سے مشاہدہ کرنے والے مارکس نے اُسی وقت وہ تجزیہ کیا تھا جو حقیقت کے قریب ترین ہے۔

سیاسی، فوجی، سماجی اور معاشی تناظر میں لکھے گئے مارکس کے مضمون اور اینگلس کے نام کے خطوط پہلی جنگ آزادی کے بارے میں ایسی معاصر دستاویز ہیں، جن میں مندرج حقائق بالکل سچائی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اپنے پرولتاری فلسفے کے پیش نظر مارکس اور ان کے ساتھی اینگلس ہندوستانی عوام کے بہی خواہ نظر آتے ہیں لیکن ان بیانات میں کسی شخصی یا قومی تعلق کی رمق تک نہیں ہے اور ہمیں اس کی امید بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مارکس کے فوری تاثرات ایک ماہر علم سماجیات اور اقتصادیات کے زاویے سے دیکھے جانے چاہئیں۔

کسی شخصی تعلق کا بیان دیکھنا ہو بلکہ کسی ذات کے زخموں کا تماشہ کرنا ہو تو آیئے غالب کے خطوط کے چند اقتباسات پڑھیں۔ ڈاکٹر جاوید رحمانی نے سجاد باقر رضوی کے حوالے سے لکھا ہے:

''غالب برصغیر کی تقریباً ہزار سالہ مسلم تہذیب کا استعارہ ہیں، ایسا ہی استعارہ جیسا کہ امیر خسرو تھے۔ امیر خسرو کا تعلق دورِ عروج سے تھا۔ مرزا غالب کا دورِ زوال ہے۔''

عروج وزوال کا یہ تماشہ دلی کی بساط پر کھیلا گیا، اس لیے اس پوری کہانی کے نشیب وفراز کو دلی کے حوالے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے اور غالب کی ذات اس دلی کا ایسا اہم حصہ تھی کہ حالی نے اس کے مرنے کو دلی کے مرنے سے تعبیر کیا ہے۔

سید ضمیر حسن دہلوی نے صحیح لکھا ہے کہ:

''اس زمانے کی دلی کا یہ عالم تھا کہ سلطنت کو گھن لگ چکا تھا، ''اکبر شاہ ثانی چولھے آگ نہ گھڑے پانی'' بچے بچے کی زبان پر تھا، مگر اگلی دولت کی فراوانی نے بزم آرائی کے خط وخال میں نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی، وہ البتہ ضرور قائم تھی... مذہبی رسوم موسمی تہواروں اور شادی وغمی کو تقریبات کا بہانہ بنالیا گیا تھا۔''

اور مغل تہذیب تو یوں بھی نفاست ونزاکت اور حسن وجمال کی تہذیب تھی۔ جب اس سے جلال رخصت ہوا تو ساری توجہ جمال پر مرکوز ہونی ہی تھی۔ چنانچہ مرزا کے عہد میں ایسا ہی ہوا اور لال قلعے کی مرکزیت یوں تو پارہ پارہ ہوچکی تھی لیکن ایک ادبی وتہذیبی ادارے کی حیثیت اُسے اب بھی حاصل تھی۔ اگر چہ کتنی دیر؟ یہ کہنا مشکل تھا۔ قاضی عبدالجمیل کو غالب نے لکھا کہ ''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہوکر کچھ غزل خوانی کرلیتے ہیں، وہاں کے مصرعۂ طرح کو کیا کیجیے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا، میں بھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں کیا معلوم ابھی نہ ہو، اب کی ہو تو آئندہ نہ ہو۔''

دلی کو یاد کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں ''بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلم رو ہند میں اس نام کا تھا۔ تو بیک وقت ہمارا ذہن دلی کے شاندار ماضی اور عبرت ناک حال کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔''

ان پانچوں باتوں سے محروم دلی کا غم غالب کا ذاتی غم بن جاتا ہے۔ اس میں قوم کے رنج کا شائبہ بھی تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ غالب نے دستنبو کے نام سے جو روزنامچہ لکھا اس کی حقیقت کا اندازہ اس خط سے کیا جاسکتا ہے جو تفتہ کے نام ہے:

''چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی؟ اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نہ مطبوع ہوگا؟''

اتنا ہی نہیں مجروح کے نام اکتوبر 1858 کا ایک خط ہے جس میں غالب بتاتے ہیں کہ:

''صاحب مطبع نے... آگرہ کے حکام کو دکھایا، اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔''

پروفیسر کبیر احمد جائسی نے غالباً بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے:

''غالب نے یہ کتاب صرف اس لیے تصنیف کی ہے کہ باغیوں کی مذمت اور انگریز مقتولوں پر نوحہ خوانی کرکے وہ خود کو انگریزوں کے بہی خواہوں میں شمار کرالیں تاکہ ان کو وہ موروثی جائداد واپس مل سکے، جس کو وہ مدتوں پہلے روپیٹ کر صبر کرچکے تھے اور اس کے علاوہ حکامِ اعلیٰ تک ان کی رسائی ہوجائے تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں بھی دہلی میں ویسے ہی معزز رہیں جیسے مغلیہ عہدِ حکومت میں تھے۔ لیکن اگر اس کتاب میں وہ صرف انگریز مقتولوں کی نوحہ گری تک ہی خود کو محدود کردیتے تو اس کا اثر رائے عامہ پر اچھا نہ پڑتا اور حکام کی دوستی کے باوجود اہلِ دہلی کی نظروں سے وہ اتر جاتے، اس لیے انھوں نے جستہ جستہ بربادیِ دہلی کا بھی تذکرہ کردیا ہے تاکہ وہ الزام سے بچ سکیں کہ یہ کتاب انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔''

غالب نے اس کتاب میں بے حد مختلف اور مشکل فارسی لکھی ہے، جس میں کئی طرح کے اہتمامات کیے ہیں۔ اس کا سبب بتاتے ہوئے سید معین الرحمٰن بتاتے ہیں:

''غالب نے یہ سرگزشت متعارف اور مروّجہ فارسی میں

لکھنے کے بجائے فارسی قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیِ قدیم کہ جس کا ہندوستان تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تا کہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لیے سربستہ راز رہیں۔"

غدر سے متعلق لکھتے وقت خطوط میں غالب نے اپنی ذات اور کائنات کو مکتوب الیہ کے سامنے رکھ دیا ہے لیکن اس کائنات کے صدر نشین خود غالب ہیں۔

مرزا کہیں کہیں اپنی صفائی بھی دیتے نظر آتے ہیں:

"کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں: انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں میرا اُمیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اُس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

اس خط میں چھپے رنج اور اس رنج کا اظہار کرنے والی ادبیت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن مرزا کا ماتم بہت ذاتی نوعیت کا ہے۔ خصوصاً "جب میں مروں گا تو کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"

انقلاب 1857 کی مرکزی شخصیت بہادر شاہ ظفر کے انتقال پر غالب نے میر مہدی مجروح کو جو خط لکھا وہ لوہے کی طرح ٹھنڈا اور جذبوں سے عاری ہے۔ وہ بادشاہ جو خود بھی شاعر تھا، دلِ دردمند کا مالک تھا، مظلوم تھا اور پردیس میں اپنے وطن کو یاد کرکے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی، جس نے غالب کو فکر معاش سے کسی قدر آزاد کردیا تھا۔ جس کے بیٹے نے باپ کی موجودگی میں غالب کا سالانہ وظیفہ باندھا تھا۔ جس نے غالب کو دبیر الملک نجم الدولہ کا خطاب دیا تھا، جس کے بارے میں غالب نے طویل قصیدے لکھے تھے۔ اس کے مرنے کی اطلاع دینے والے الفاظ پر ذرا غور فرمایئے:

"7 نومبر، 14 جمادی الاوّل سالِ حال جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ اور قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

غالب بنیادی طور پر اپنی تباہی کے نوحہ خواں نظر آتے ہیں۔ مرزا ایک خط میں دوسروں کی موت سے رنجیدہ بھی نظر آتے ہیں لیکن غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی موت کا رنج بھی اس لیے تھا کہ ان کی موتوں نے مرزا کو اکیلا کردیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"پوچھو اور کیا غم ہے۔ غم مرگ، غم فراق۔ غم رزق، غم عزت، غم مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔"

ہم دیکھتے ہیں جس قلعے میں جانا غالب اپنی عزت سمجھتے تھے، اُسے آج 'قلعہ نامبارک' کہہ رہے ہیں۔ جن لوگوں کا ماتم کررہے ہیں وہ ان کے اپنے لوگ ہیں۔ عزیز، دوست، احباب— ہزاروں عوام کٹ گئے، جل گئے، سولیاں کھا گئے، بھوکے مرگئے۔ ہمارا یہ عظیم شاعر ان کے ذکر سے کف لسان کرتا ہے۔ ممکن ہے غالب کی خاموشی یا اُن کی تحریر میں عوام کی بربادی کے ذکر سے احتیاط کا سبب یہ مجبوری ہو کہ وہ انگریزوں کے خوف یا لالچ میں ان کے وفادار رہنا چاہتے ہوں۔ ہم نے مان لیا

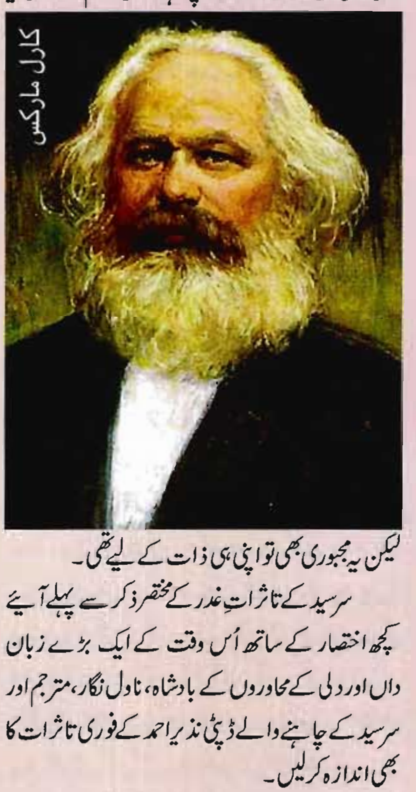

لیکن یہ مجبوری بھی تو اپنی ہی ذات کے لیے تھی۔

سرسید کے تاثراتِ غدر کے مختصر ذکر سے پہلے آیئے کچھ اختصار کے ساتھ اُس وقت کے ایک بڑے زبان داں اور دلی کے محاوروں کے بادشاہ، ناول نگار، مترجم اور سرسید کے چاہنے والے ڈپٹی نذیر احمد کے فوری تاثرات کا بھی اندازہ کرلیں۔

ڈپٹی نذیر احمد غدر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بارے تقدیر میں تو انگریزی عمل داری کی ہر بات سے متمتع ہونا لکھا تھا۔ ہم مولویوں کے خاندان سے ایک بڑی دھڑلے کی خیر خواہی بن پڑی۔ باغیوں نے انگریز یوریشین عیسائی قیدیوں کو جمع کرکے میگزین کے میدان میں باڑھ ماری۔ ان میں مسز لیسن (Mr. Leison) بھی تھیں۔ یہ بھی زخمی ہوئیں، مری نہیں۔ ان کو مولویوں نے اپنے یہاں رکھ کر مرہم پٹی کی۔ توانا، تندرست ہوئیں۔ میں بھی ان کی جان بچانے میں شریک و معین رہا۔ دہلی کی فتح سے پہلے ان کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔

اس کے بعد نذیر احمد بتاتے ہیں کہ ان کو اس خیر خواہی سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹے جنرل بخت خاں باغی نے مولویوں سے جہاد کے فتوے پر زبردستی مہریں کروائیں۔

متن کی خبر سے زیادہ الفاظ کے در و بست پر نظر کیجیے۔ 'دھڑلے' کا لفظ کس خوبی سے استعمال کیا ہے، گویا ڈپٹی نذیر کی مستقبل کی تمام خواہشات آئینہ ہوگئی ہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے دھڑلے کا لفظ بس منٹو ہی استعمال کرتے تھے۔ اب پتہ چلا کہ ڈپٹی صاحب تو اس کے چلن کا ڈول سو برس پہلے ڈال گئے ہیں۔ حیرت ہوتی تھی کہ منٹو نے دھڑلے جیسا مردانہ لفظ صرف عورت کے لیے کیوں استعمال کیا ہے۔ اب حیرت نہیں ہوتی کہ نذیر احمد بھی اس کا استعمال 'خیر خواہی' جیسی مونث کے لیے کرچکے ہیں۔

آگے لکھتے ہیں:

"میں نے غدر کی حکایت اس لیے بیان کی کہ مجھ کو جتنا کچھ بھی اس خیر خواہی میں دخل یا اس سے تعلق تھا وہ کالج کی صحبت کا اثر تھا۔"

ڈپٹی نذیر احمد نے غدر کے ذکر میں کہیں یہ نہیں چھپایا کہ وہ انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور خیر خواہ رہے۔ نذیر احمد کی یہ تحریر پڑھتے چلے جایئے۔ آپ کہیں نہیں پائیں گے کہ جنگ آزادی سے انھیں رتی برابر بھی دلچسپی رہی ہو۔ اس کا برعکس البتہ جگہ جگہ تحریر سے چھلک پڑتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے زیادہ تر مندرجات ان کی ذاتی زندگی اور اقتباسات سے متعلق ہیں۔ انھوں نے اپنی ڈپٹی کلکٹری، اپنے ناول، اپنے ترجمۂ قرآن، خطبات و انعامات اور اپنے تموّل کا ذکر کیا ہے۔ کسی ایک مقام پر اس تحریر میں ہندوستانی رعایا کے دکھوں کا ذکر نہیں ہے، نہ ان ظلموں کا جو دلی اور اہلِ دلی پر روا رکھے گئے۔

ہاں! اس گروہ میں ایک ذات ایسی نظر آتی ہے جو اپنی تحریر، تقریر اور عمل سے قدم قدم پر ظاہر کرتی ہے کہ اس کے دل میں قوم کا کیا درد تھا۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ سرسید کو بھی قلعے اور بہادر شاہ سے کوئی بہت دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی بادشاہ کی ملازمت نہیں کی۔ انھوں نے جاگیر لینا بھی قبول نہیں کیا۔ وہ انگریزوں کے اخلاق، تہذیب، علم اور جدیدیت سے بے حد متاثر تھے۔ لیکن فی نفسہٖ وہ ان تمام خوبیوں کو اپنی قوم کے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

اپنی سوانح کا بیان کرتے ہوئے جب غدر کے موضوع پر لکھنا شروع کرتے ہیں تو پہلا ہی پیراگراف

جذبوں سے مملو ہے اور جذباتیت سے بالکل عاری—

''غدر میں جو حال ان کے (انگریزوں کے) بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد اور تباہ ہوئے، ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنے لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب تلف ہونے کا اور جو کچھ رنج تھا وہ اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔'' (رسالہ 'نقوش'، لاہور، 1964)

اپنی قوم کی بربادی کا ذکر انھوں نے واضح اور برملا الفاظ میں کیا ہے— غالب اور نذیر احمد کی طرح صرفِ نظر نہیں کیا ہے، نہ بات کو چبا چبا کر بیان کیا ہے۔

سرسید اپنی قوم کی ہر طرح سے ترقی چاہتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ یہ ترقی تب تک ممکن نہیں ہے جب تک انگریزوں اور ان کی حکومت کی خیرخواہی نہ کی جائے۔ وہ اپنے طور پر بہت دیانت داری کے ساتھ سوچتے تھے کہ انگریزی حکومت سے ٹکر لے کر قوم کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ رنج اس بات کا ہوتا ہے کہ اتنی خیرخواہی کے بعد بھی سرسید کی والدہ کو ایامِ بغاوت میں انگریزی سپاہ کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ انھیں تکالیف سے میری والدہ کی طبیعت جادہ اعتدال سے منحرف ہوگئی اور یکم ربیع الثانی 1274ھ مطابق 1857 کو انھوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا:

''جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہوگیا۔ سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے مگر وہ اور ان کی ایک بہن جو نابینا تھیں، اس یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستاتے، اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا اور ایسی نیک بی بی کو آخیر عمر میں تکلیف پہنچی۔ جب دلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا، وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اس کوٹھری میں چلی آئیں، جس میں زیبالا وارث بڑھیا رہتی تھی۔ آٹھ دس دن اُنھوں نے نہایت تکلیف سے بسر کیے۔ اس عرصہ میں راقم جو میرٹھ میں آ گیا تھا، میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ مل گیا، اسی پر بسر تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ ''ہیں! تم یہاں کیوں آگئے۔ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ، ہم پر جو گزرے گی، گزرے گی۔''

اُس مردِ باہمت کو سلام ہے جس نے بغاوت کے ایک برس کے اندر اندر جب کہ مظالم اور شک و شبہات کا سلسلہ دراز تھا، اپنی کتاب 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھی۔ یہی مختصر لیکن تاریخ ساز کتاب سرسید کا بغاوت 1857 کے ردِعمل میں سب سے پہلا اور کارگر تاثر ہے۔ اس کتاب کو لکھتے وقت سرسید پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی اس کا آج کی تاریخ میں بس اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ دلی کو دوبارہ حاصل کرنے کے بعد انگریزی فوج نے دلی اور دلی والوں کے ساتھ اور مختلف ہندوستانی علاقوں میں جو کیا وہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ گھروں کو لوٹنا، مال و املاک کو لوٹنا، عمارتوں کو ڈھانا، ذرا سے شبہے پر قتل کر دینا، قطار میں کھڑا کر کے اس طرح سولی دینا کہ ایک شخص پھانسی کھا رہا ہے اور اس کے عزیز برابر میں کھڑے ہوئے اپنی پھانسی کا

انتظار کر رہے ہیں۔ راتوں کو دبش دے کر تھانوں میں بلانا اور گرفتار کر کے یا تو قید میں رکھنا یا قیدِ زندگی سے آزاد کر دینا۔ یہ اس وقت کے معمولات تھے۔ 'اسبابِ بغاوت ہند' کو لکھتے وقت اس کے اسلوبِ بیان کے بارے میں سرسید نے بارہا سوچا ہوگا کہ وہ کیا طریقِ تحریر ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ واقعہ سخت تھا اور جان عزیز۔ لیکن سرسید نے جان جیسی شے کو بھی عزیز نہیں رکھا۔ ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی یعنی اس وقت کے مراد آباد کے منصف رائے شنکر داس نے سرسید سے کہا تھا کہ ان کتابوں کو جلا دو اور اپنی جان کو ہرگز خطرے میں نہ ڈالو۔ جب سرسید نے ان کی بات نہ مانی تو وہ سرسید کی موت کا خیال کر کے روئے اور خاموش ہوگئے۔

حاضرین! یہ مدنظر رہے کہ بغاوت کے بعد مولوی باقر علی مدیر 'دلی اردو اخبار' یعنی مولانا محمد حسین آزاد کے والد تک کو برسرِ عام قتل کر دیا گیا تھا یعنی اُس وقت جاہل، عالم، غریب، امیر، نچلے طبقے والے یا شرفا کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ 1858 میں 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھ کر شائع کرنا سرسید کی شجاعتِ مردانہ کا وہ کارنامہ ہے جس کی مثال سے خاصان ادیب کے خزانے خالی ہیں۔ صرف ایک استثنا کے ساتھ کہ جب 1739 میں محمد شاہ اور نادر شاہ ابدالی کی موجودگی میں بوڑھے محمد خان بنگش والیِ فرخ آباد نے زمین پر پڑی قالین کو تلوار سے چیر کر کہا تھا کہ نادر! اگر تو خود کو بہت بہادر سمجھتا ہے تو قالین کی اس لکیر کو دریائے راوی سمجھ اور اُس پار سے اِس پار آ کر دکھا دے۔ لیکن اس مثال میں بنگش سردار کی بہادری کا مطلوب و مقصود اپنے بادشاہ کی وفاداری کا اظہار اور ذاتی فخر تھا جب کہ سرسید کی شجاعت کا مقصود مظلوم مسلمانوں کو اور ہندوستانی قوم کو تنزلی کے اس گڑھے سے نکالنا تھا جس میں تقدیر نے انھیں اوندھے منھ گرا دیا تھا۔ اس کتاب کو لکھتے وقت وہ ایک عجیب عالم سے گزرے ہوں گے۔ ان کا مقصد تھا کہ انگریز بغاوت کے اسباب کو ٹھیک طرح سے جان لیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب کو دلجمعی کے ساتھ پڑھیں۔ سرسید انسانی نفسیات سے کماحقہٗ واقف تھے۔ انھوں نے انگریز حکومت اور ان کے اخلاق و آداب کی مبالغے کے ساتھ تعریف کی تا کہ انگریز کتاب کو شروع کرتے ہی سمجھ جائیں کہ یہ ایک دوست کی تحریر ہے دشمن کی نہیں۔ سرسید جو چیز انگریزوں کو پلانا چاہ رہے تھے وہ انگریزوں کے لیے بہت تلخ تھی، لیکن اس تلخ شے کے پلانے کا جو گلاس سرسید نے بنایا وہ خالص شکر کا تھا یعنی ساغرِ قند۔ صرف ایک مثال سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ 55 صفحے کی اس کتاب میں سرسید نے تقریباً 60 جگہ ''ہماری گورنمنٹ'' کا فقرہ استعمال کیا ہے یعنی ساٹھ مقامات پر بار بار انگریز سے کہا کہ صرف میں نہیں بلکہ ہم سب آپ کی حکومت کو 'ہماری گورنمنٹ' جانتے ہیں۔ صیغہ جمع کا استعمال اور وہ بھی 'گورنمنٹ' کے لیے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ 'انگریز بہادر' کو کتنا پسند آیا ہوگا۔ انگریز، بہادر شاہ سے نفرت کرتے تھے۔ سرسید بادشاہِ ہندوستان کو (جیسا بھی وہ تھا) اور تو کیا کہتے لیکن اتنا تو کہہ ہی دیا کہ بہادر شاہ مالیخولیا کا شکار ہوگئے تھے۔ ہندو مسلمان سپاہیوں کو جگہ جگہ جاہل، لالچی، گنوار، احمق وغیرہ کے خطابات سے نوازا— یہ سب وہ سرسید لکھ رہے ہیں جنھوں نے چند روز قبل اپنی شفیق اور مظلوم ماں کو انگریزوں کے ستانے سے موت کو گلے لگاتے دیکھا تھا جنھوں نے بلاشبہ ہزاروں ہندو مسلمانوں کو انگریزوں

کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ سرسید کے کچھ ناقدین اس کتاب کے مصنف کو انگریزوں کا خوشامدی کہتے تھے۔ کچھ جو ذرا رعایت کرتے ہیں وہ اسے سرسید کی مصلحت کہتے ہیں۔ حق پوچھیے تو یہ سرسید کی مومنانہ فراست تھی جو انھوں نے کتاب کے لہجے کو اتنا ملائم اور انگریز دوست رکھا کہ کم ازکم انگریز کتاب تو پوری پڑھ جائے تبھی تو بغاوت کے اصل اسباب جان سکے گا۔

سرسید نے بتایا کہ بغاوت کے اصل اسباب یہ تھے:

1. ہندوستانیوں کا قانون ساز اداروں میں شامل نہ کرنا۔
2. مذہب کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت۔
3. حکومت کے انگریز عمال کا مشنری پادریوں کے تبلیغی کاموں میں ساتھ دینا۔
4. مشنری اسکولوں کا قیام اور اس سے ہندوستانیوں میں روحانی اذیت پیدا ہونا۔
5. دیہی علاقے کے اسکولوں میں صرف انگریزی اور اردو پڑھانا جس سے مسلمان یہ سمجھے کہ ان کے قدیم و مذہبی علوم کی زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے ساتھ تعصب ہو رہا ہے (جیسا کہ آج بھی عربی اور فارسی کو UPSC کے امتحانات سے خارج کرنے پر تعلیم یافتہ طبقے میں ناراضگی ہے)
6. بڑے کالجوں میں تعلیم کا طریقہ اس طرح بدلنا کہ اس سے قدیم اور مذہبی علوم کی یکسر نفی ہوگی۔
7. نوکریوں کے لیے انگریزی کی لیاقت کا ضروری قرار دینا۔
8. سرکاری ملازمین کے پاس اس مضمون کا خط آنا کہ تم لوگ عیسائی مذہب اختیار کرلو۔
9. مندروں کے مذہبی رسوم اور ترکے کے معاملات میں قانون بنانا۔
10. زمین داری کے نیلام ہونے کا قانون بنانا۔
11. مال گزاری کا غیر حقیقی بندوبست اور وصولیابی میں سختی کا زیادہ ہونا۔
12. گورنمنٹ کا رعایا کے حال سے ناواقف ہونا۔
13. حکام اضلاع کا رعایا کے حالات سے مطلق ناواقف ہونا۔
14. مفلسی کے سبب سے رعایا کا حکومت میں تبدیلی چاہنا۔
15. حکومت کا رعایا سے محبت واتحاد نہ رکھنا۔
16. ہندوستانیوں کی بات بات پر بے عزتی کرنا۔
17. حکام کی بدمزاجی اور بدزبانی
18. فوج کی بدنظمی
19. ہندوستانی فوج کا نہایت مغرور ہونا

اس کے علاوہ بھی سرسید نے دیگر اسباب لکھے تھے۔ لیکن یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سرسید نے زبان اور لہجہ تو دل داری کا رکھا لیکن حق بات کہنے میں کمی کوئی نہیں کی۔ اس وقت ان مندرجات پر مشتمل کتاب لکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

اس کتاب کے مفید نتائج برآمد ہوئے اور انگریز حکومت نے کئی باتوں پر فوری توجہ کرکے تدارک کیا۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ کانگریس بننے اور قانون سازی میں ہندوستانیوں کی شرکت کا مطالبہ کرنے سے کئی دہے پہلے سرسید اس معاملے کو شد و مد سے اٹھا چکے تھے۔ کانگریس کے بانی ہیوم نے صاحب زادہ آفتاب احمد خان سے لندن میں اس بات کا اقرار کیا کہ سب سے پہلی چیز جس نے نیشنل کانگریس جیسی کسی تحریک کے جاری کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا کیا وہ خود سرسید کی کتاب

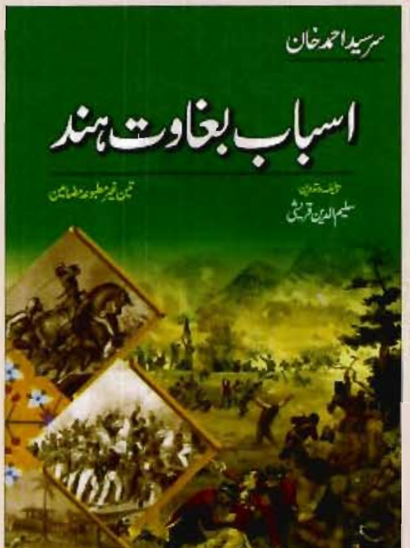

'اسبابِ بغاوت ہند' تھی۔

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ غدر کے فوری ردِ عمل میں سرسید نے جس فراست، ہمت، بصیرت، صداقت اور تجزیے کی قوت کا ثبوت دیا وہ ان کے جید معاصرین سے بالکل مختلف و منفرد تھا اور ان بدلے ہوئے حالات میں جدید تعلیم کے پس منظر میں، قوم کے مفادات کے تحفظ کا جو احساس تھا، ان کے دوسرے ساتھی ان کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچتے۔

اس مادرِ درسگاہ کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے تعلق سے مجھے بھی یہاں کے نوجوان اور جوان اساتذہ اور طلبا سے گزارش کرنے کا حق ہے کہ وہ بھی اپنے عمل و گفتار میں مزید فراستِ مومنانہ اور مزید ہمتِ مردانہ کا امتزاج پیدا کریں۔ صداقت و بصیرت کو اپنے رویے میں عام کریں اور تجزیے کی قوت کو اپنے روزمرہ کا محاورہ بنالیں۔ یہ سب شامل حال ہوگا تو پھر جذبوں کی گلابی آنچ سے دلوں کے خرابے ضرور روشن ہوں گے۔ اِن شاءاللہ۔

مرزا مظہر جانِ جاناں نقش بندی سلسلے کے بزرگانِ دلی میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ سرسید اور ان کے والد مرزا جانِ جاناں کے سجادہ نشین حضرت غلام علی کے بے حد عقیدت مند تھے اور اس بارگاہ میں اُن باپ بیٹوں کی بڑی پذیرائی تھی۔ جانِ جاناں کے عرس کے موقعے پر جب شاہ صاحب نذر کے طور پر ایک روپے کا سکہ مزار پر رکھتے تو یہ سرسید کے والد کا حق ہوتا تھا کہ اُسے اٹھائیں۔ ایک بار شاہ صاحب نے اپنے کسی اور متوسل کو اجازت دے دی کہ وہ نذر کا روپیہ اٹھا سکتا ہے۔ سرسید کے والد کو جب علم ہوا تو ان کو بہت تکلیف ہوئی۔ وہ نذر والے دن سرسید کو لے کر مزار پر پہنچے اور حضرت شاہ صاحب سے فرمایا کہ یہ تو میرا حق ہوا کرتا تھا۔ میری اور میری اولاد کے جیتے جی آپ یہ روپیہ کسی اور کو لینے کی اجازت دے رہے ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب نے فرمایا، نہیں تمھارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اُس وقت صغیر سن تھا، جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا۔ والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھالاؤ۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھالیا۔''

اس واقعے کو پڑھ کر میرے ذہن میں کئی باتیں آتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ سرسید اور ان کا گھرانہ بزرگانِ دین کا بہت عقیدت مند تھا۔ 'آثار الصنادید' کا متن بھی اس کی گواہی دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ روپے کے واقعے سے یہ غیبی اشارہ ملتا ہے کہ غالباً اُسی دن روحِ جانِ جاناں نے دعا دی ہو کہ اے سیدزادے! آج ہماری مزار سے روپیہ اٹھا رہے ہو کل جب بڑے ہو جاؤ گے تو قوم کے افرادِ قوم کے کاموں کے واسطے تمھارے امین ہاتھوں میں روپے ہی روپے رکھیں گے۔

اردو شاعری کی اصطلاح میں قاتل اُسے کہتے ہیں جو محبوبوں میں گل سرسبد ہو۔ کیا عجب کہ مرزا جانِ جاناں کی روحانی آنکھیں دیکھ رہی ہوں کہ آنے والے دنوں میں یہی فرد امت کی تعلیم و تہذیب میں ایسی مساعی کرے گا کہ اپنے بیگانے ہو جائیں گے، دوست دشمن ہو جائیں گے اور یہ حق کاموں کے لیے ناحق ہلکان کیا جائے گا۔ تب ہمارا ہی یہ شعر اس کی حفاظت کرے گا:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل بچا ہے

(ادارہ تہذیب الاخلاق کے زیر اہتمام یہ میموریل لیکچر یکم اکتوبر 2013 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیا گیا)

■

Mr. Syed Mohd Ashraf
D-II/59, Kidwai Nagar WestNew Delhi-110023

فاصلاتی نظامِ تعلیم اور اردو

زبیر شاداب

عالمی سطح پر عام اور پیشہ ورانہ تعلیم کے معاشرتی مطالبے کو دیکھتے ہوئے باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ فاصلاتی نظامِ تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی تا کہ نوکری پیشہ افراد اور امورِ خانہ داری میں مصروف خواتین یا پھر وہ لوگ جنھیں کسی وجہ سے تعلیم یافتہ ہونے کا موقع نہیں مل سکا، اپنی ضرورت اور خواہش کے لحاظ سے تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس تعلیمی ضرورت کی تکمیل کے لیے بہت سے فاصلاتی نظامِ تعلیم کے مراکز اور جامعات کا قیام عمل میں آیا۔ ان جامعات اور مراکز نے بہت سے کارآمد اور پیشہ ورانہ کورسیز کا آغاز وسیع پیمانے پر کیا۔ ان کورسیز کی تعمیر وتشکیل میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ خود ساختہ دلچسپی رکھنے والا آموزگار اپنے ذاتی مطالعے اور فاصلاتی کورسیز کے تیار کردہ مواد کی مدد سے اس لائق ہو جائیں کہ متعلقہ موضوع میں روانی اور اہلیت کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک دسترس بھی حاصل کر لیں۔ اس ضمن میں تحریری، صوتی اور تصویری ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے اسباق تیار کیے گئے۔ عہد حاضر میں باقاعدہ تحریری مواد کے علاوہ خط و کتابت، رابطہ کاری، ٹیلی کانفرنسنگ اور انٹرنیٹ کی مدد سے آموز گاروں کو تدریسی مواد بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔

کسی ملک کے تعلیمی نظام میں لسانی عقائد، سماجی فروغ، سیاسی بصیرت، معاشی استحکام اور تہذیبی اقدار کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کا تعلیمی منظر نامہ کثیر لسانی اعتبار سے بے حد پیچیدہ لیکن دلچسپ ہے۔ ایک طرف مختلف زبانوں کا ذریعہ تعلیم ہونا اور دوسری جانب مختلف الاقسام مضامین اور کورسیز کا اطلاق تعلیمی منصوبہ کاروں کو پریشان کرتے ہیں تو دوسری جانب تعلیم و تدریس کے مختلف طریقۂ کار طلبا اور اساتذہ کو روز بروز نئی آزمائشوں سے دوچار کراتے ہیں۔ بے لگام بڑھتی آبادی نے رسمی طرزِ تعلیم کو بڑی حد تک ناکافی ثابت کر دیا۔ اس طرح عوام کو یکساں طور پر تعلیمی سہولیات فراہم کرانا عہدِ حاضر کا اہم ترین مسئلہ بن گیا۔ اس صورتِ حال میں فاصلاتی اور آزادانہ طرزِ تعلیم کی اہمیت میں اور اس کے کردار کو نظر انداز کرنا غیر ممکن ہو چکا ہے۔ ہندستان میں فاصلاتی نظامِ تعلیم کے مختلف طریقوں اور ذرائع سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی مجموعی تعداد 20 لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ لہٰذا فاصلاتی تعلیم کی ضرورت و افادیت کو دیکھتے ہوئے تقریباً تمام اداروں اور جامعات نے فاصلاتی تعلیم کے مراکز کھولنا شروع کر دیا ہے۔ ہر چند کہ تعلیم و تربیت کی باقاعدگی کا انحصار بہر حال اساتذہ پر ہے لیکن ملک کی شرحِ خواندگی کی ترقی اور زیادہ سے زیادہ افراد کو تعلیم یافتہ بنانے میں فاصلاتی اور آزادنہ طرزِ تعلیم لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ حالانکہ اس سے تعلیمی معیار کو تنزل کا سامنا درپیش ہے اور نام نہاد تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بہتری لانے کے لیے سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

فاصلاتی تعلیم کے فیض یافتگان میں ایسے افراد کی ایک بڑی جماعت ہے جسے نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اور دوسرا طبقہ ان افراد کا ہے جو کسی نہ کسی شعبے میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے فاصلاتی یا آزادانہ طرزِ تعلیم ایک مفید اور کامیاب نظام ہے جس نے بہت بڑی تعداد کو تعلیم یافتہ بنایا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کی ترویج و ترقی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر اس نے پانچ نسلوں (Generation) کو تعلیم یافتہ بنایا ہے۔ تعلیم کی اصطلاح میں پہلی تا پانچویں نسل کو بالترتیب رابطہ جاتی نمونہ (Corresponding Model) کثیر ذرعی نمونہ (Multi-Media Model) ٹیلی آموزشی نمونہ (Tele Learning Model)، لچکدار آموزشی نمونہ (Flexible Learning Model) اور ذہین لچکدار آموزشی نمونہ (Inteligent Flexible Learning Model) کہتے ہیں۔

فاصلاتی یا آزادنہ تعلیم فراہم کرانے والے اداروں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم آزادانہ جامعات (Open Universities) کی ہے۔ مثلاً

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی دہلی، دوسری قسم دو طرحی تعلیمی جامعات یا اداروں کی ہے، یہ رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ فاصلاتی تعلیم بھی مہیا کراتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور تیسرے اور تیسری قسم مرکزی ادارہ آزادانہ تعلیم (National Institute of Open Schooling) کی ہے۔

ہندستان میں فاصلاتی، مراسلاتی اور آزادانہ تعلیم کا سلسلہ 1962 میں دہلی یونیورسٹی نے شروع کیا۔ لیکن باقاعدہ طور پر فاصلاتی تعلیم کی منظم طریقے سے شروعات کرنے والی درس گاہ حیدر آباد اوپن یونیورسٹی ہے جسے اب بھیم راؤ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا قیام غالباً 1982 میں ہوا تھا بعد ازاں ایک درجن ریاستی اوپن یونیورسٹیوں یا جامعات نے بھی فاصلاتی تعلیم کے مراکز قائم کیے جن کی مجموعی تعداد ایک سو سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہاں سبھی جامعات یا فاصلاتی تعلیم کے مراکز کی فہرست سازی مقصود نہیں ہے لیکن چند ممتاز جامعات کے نام درج کیے جا رہے ہیں تاکہ قارئین اگر خواہش مند ہوں تو فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے خود کو یا اپنے اقربا کو تعلیم یافتہ بنا سکیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدر آباد، اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی دہلی، راج شری ٹنڈن اوپن یونیورسٹی الہ آباد، نالندہ اوپن یونیورسٹی نالندہ، بہار شریف، بابا صاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی احمد آباد گجرات، وردھمان مہاویر اوپن یونیورسٹی کوٹہ راجستھان، یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی ناسک مدھیہ پردیش، نیتاجی شبھاس چندر بوس اوپن یونیورسٹی کلکتہ، تمل ناڈو اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی چنئی اور کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی میسور کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ جامعات یا یونیورسٹیوں میں مختلف قسم کے کورسیز چلائے جا رہے ہیں جن کی تفصیل ان کے ویب سائٹ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

ہندستان میں فاصلاتی تعلیم کی ضرورت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے تقریباً پندرہ لاکھ طلبا مختلف قسم کے کورسیز کر رہے ہیں۔ اِگنو کی حیثیت اب بین الاقوامی ہوتی جا رہی ہے اس کے مراکز 30 بیرونی ممالک میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صرف ہندستان میں اس کے علاقائی مراکز کی تعداد تقریباً 80 اور اسٹڈی سنٹر کی تعداد تقریباً 1400 ہے۔ یہ ہندستان کی واحد یونیورسٹی ہے جو ملک کے طلبا کی مجموعی تعداد کے دس فیصد طالب علم کو داخلہ دیتی ہے۔ باقی کے دس فیصد طلبا دیگر جامعات سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ گویا روایتی یا رسمی تعلیم کے ذریعے 80 فیصد طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور فاصلاتی تعلیم کے ذریعے 20 فیصد۔

اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدر آباد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مستعمل ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو مذکورہ جامعات میں اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ ملک گیر پیمانے پر اس کے تقریباً سات علاقائی مراکز قائم ہیں جہاں تمام ممکنہ سہولیات دستیاب ہیں۔ یہ مراکز عظیم آباد (پٹنہ)، دربھنگہ، کلکتہ، دہلی، بھوپال، شری نگر اور بنگلور میں ہیں۔ اس کے ایک سو سے زائد اسٹڈی سنٹرس ہیں۔ لکھنؤ میں ایک سٹلائٹ سنٹر کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ خواہش مند افراد ان مراکز سے رابطہ قائم کرکے اپنی اہلیت کے لحاظ سے مختلف کورسیز میں داخلہ لے سکتے ہیں

فاصلاتی تعلیم میں مختلف نوع کے مقاصد اور اہداف کا محاکمہ کرنے پر مختلف قسم کے کورسیز کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً

• آزادانہ یا فاصلاتی نظام تعلیم کا استعمال نوخیز طلبا سے لے کر ان عمر رسیدہ افراد تک کو حصولِ تعلیم کا موقع فراہم کرتا ہے جو کسی وجہ یا مجبوری کے باعث رسمی تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے ہوں۔ یہ نظام تعلیم دسویں جماعت سے پوسٹ گریجویٹ تک کی تعلیم مہیا کراتا ہے۔ اس میں نصاب کی تشکیل تعلیم بالغان کی آخذی قوت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔

• تعلیم و تربیت برائے اساتذہ کے تحت مختلف قسم کے ہدایتی مواد کا سہارا لے کر اساتذہ کے تدریسی معیار اور تعلیمی اہلیت کی فروغ کاری کی جاتی ہے۔ زیرِ ملازمت اساتذہ کے لیے مغربی ممالک نے تو بہت پہلے سے ایک نظام قائم کیا ہے جس کے ذریعے کسی مخصوص مضمون میں ان کے پیشہ ورانہ فروغ کو مزید مستحکم بنایا جا سکے۔ ہندستان میں بھی اس نوع کے ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اردو اساتذہ کی پیشہ ورانہ استعداد کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے وزارتِ فروغِ انسانی وسائل نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اکادمیاں قائم کی ہے۔ لیکن ان کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں مزید وسائل کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کی تربیت کاری کے لیے اعلیٰ قسم کے ویب بیسڈ پیشہ ورانہ ذرائع موجود ہیں جہاں آن لائن نگرانی اور معاونت کی سہولتیں دستیاب ہیں جن کی مدد سے اساتذہ جدید تدریسی تکنیک سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نوع کی سہولتیں ان اساتذہ کے لیے نہایت کارآمد ہیں جو نسبتاً غیر ترقی یافتہ یا دیہی علاقوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، بس ضرورت ہے تو ایک کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنکیشن کی۔

• پیشہ ورانہ اور ہنرمندانہ تعلیم کے حصول میں بھی فاصلاتی نظام تعلیم نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کسی مخصوص ہنر، حرفت یا زراعت میں مہارت حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہوئی ہے بلکہ حصول روزگار کے نقطۂ نظر سے بھی یہ بڑا کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اس نظام نے ان افراد کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہے جو کسی پیشے یا حرفت سے متعلق ہیں لیکن مہارت نہیں رکھتے، ان کے لیے ظاہر ہے کہ کام کرتے ہوئے رسمی تعلیم حاصل کرنا دشوار کام ہوگا کیوں کہ اس میں وقت کی پابندی ہوتی ہے اور آزادانہ یا فاصلاتی نظامِ تعلیم میں وہ اپنی سہولت سے وقت نکال کر خود کو ماہر (skilled) بنا سکتے ہیں بلکہ بنا رہے ہیں۔

• فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت غیر رسمی تعلیم نے تعلیم کے کمیونٹی فروغ کے شعبے میں گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ 60 اور 70 کی دہائی میں تعلیم کے میدان میں تکنالوجی کا بہت وسیع پیمانے پر استعمال شروع ہوا۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے طریقۂ تدریس میں روبرو ملاقات اور لکچر کا آغاز ہوا۔ زراعت، صحت، غذا، سیاسی تعلیم، روزگار سے متعلق پروجیکٹ وغیرہ سے بہت بڑا طبقہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس سے پہلے صرف ریڈیو کے ذریعے بھی تعلیم و تعلم کا کام ہوتا تھا۔

آزادانہ یا فاصلاتی آموزشی نظام کسی مخصوص نظام، پروگرام، نصابِ تعلیم، تدریس یا آموزش کے منصوبے یا

تکنیک، آموزشی مواد اور ماخذات، ترسیل اور رابطہ کاری، معاون اور ارسالی نظام، طلبا، ماہرین، انتظامیہ، آلہ جات اور تعیین قدر کا دائرۂ سیاق سے علاقہ رکھتا ہے۔

آزادانہ یا فاصلاتی نظامِ تعلیم نے اردو کے فروغ میں بھی بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت اردو بحیثیت زبان ملک کی 22 یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہے جن میں بعض جامعات گریجویشن کراتی ہیں اور چند ایک پوسٹ گریجویشن بھی کراتی ہیں۔ بھیم راؤ امبیڈکرا وپن یونیورسٹی حیدرآباد، کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، بہار یونیورسٹی مظفر پور، للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی وغیرہ سرفہرست ہیں جو اردو میں ایم اے کراتی ہیں۔

اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں مستعمل ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو مذکورہ جامعات میں اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ ملک گیر پیمانے پر اس کے تقریباً سات علاقائی مراکز قائم ہیں جہاں تمام ممکنہ سہولیات دستیاب ہیں۔ یہ مراکز عظیم آباد (پٹنہ)، دربھنگہ، کلکتہ، دہلی، بھوپال، شری نگر اور بنگلور میں ہیں۔ اس کے ایک سو سے زائد اسٹڈی سنٹرس ہیں۔ لکھنؤ میں ایک سٹلائٹ سنٹر کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ خواہش مند افراد ان مراکز سے رابطہ قائم کرکے اپنی اہلیت کے لحاظ سے مختلف کورسیز میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ اب تک اس یونیورسٹی نے لاکھوں افراد کو سند یافتہ بنایا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم نے جس سلیقے سے اپنا تعلیمی مواد تیار کیا ہے، اس کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے اسی سنجیدگی سے اپنے امتحانات کے مراکز پر امتحانات بھی منعقد کراتا رہے گا۔

• سب سے بدتر حالت فاصلاتی تعلیم کے امتحانات کی ہے۔ یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں فاصلاتی تعلیم کے مراکز پر امتحانات منعقد ہوتے ہیں وہاں طلبہ نقل کر کے اپنی بلا ٹالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نازیبا حرکت میں صرف طلبہ کی من مانی کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ان مراکز کے رابطہ کار اور ذمے داران کا نفع نقصان بھی شامل ہوتا ہے۔ اس بدنظمی سے کسی کورس میں شریک آموزگاروں کو سند تو مل جاتی ہے لیکن اہلیت کی کمی انھیں رسمی یا باقاعدہ تعلیم کے طلبہ کے مقابلے میں ملازمت یا پیشے میں اطمینان بخش حد تک کامیاب نہیں ہونے دیتی۔

• فاصلاتی تعلیم سے متعلق زیادہ تر جامعات، ادارے اور مراکز بے توجہی کے شکار ہیں۔ ان کا تدریسی مواد بڑی حد تک ناقص ہوتا ہے۔ اس لیے طالب علم پر بھی اس رویے کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کونسل برائے فاصلاتی تعلیم کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس طرزِ تعلیم کے معیار کو نہ صرف بہتر بنائے بلکہ اسے فروغ دینے اور اس کا اطلاق کرنے کے کارآمد طریقے بھی ایجاد کرے۔

سردست فاصلاتی تعلیم کی چند خامیوں پر روشنی ڈالنے کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے افراد کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے، بلکہ پوری صداقت و دیانت کے ساتھ یہ کوشش کی جارہی ہے

کہ طلبہ اور طالبات اس نکتے کو ذہن نشین کرلیں کہ تعلیم کا مقصد مہذب بنانا ہوتا ہے، دوسری بات، یہ عہد مقابلہ جاتی امتحانات کا ہے، زندگی کے ہر ایک شعبے میں مواقع یا ملازمتیں کم ہیں اور امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ، لہٰذا مقابلہ سخت سے سخت ترین ہوتا جارہا ہے اس لیے طلبہ و طالبات کو چاہیے کہ وہ زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہونے کے لیے دل و جان سے محنت کریں اور ایمانداری کے ساتھ تعلیم حاصل کریں اور امتحان دیں۔ یاد رہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم میں صرف خامیاں ہی نہیں ہیں بلکہ بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً:

• یہ کل وقتی اور جز وقتی نوکری پیشہ، تجارت پیشہ، زراعت و حرفت پیشہ افراد اور امور خانہ داری میں مصروف خواتین کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے جس سے ہمارا معاشرہ معتدل طریقے سے مہذب ہورہا ہے۔

• فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت مختلف قسم کے مقاصد کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً عام تعلیم، تعلیم و تربیت برائے اساتذہ، پیشہ ورانہ تعلیم، غیر رسمی تعلیم وغیرہ۔ اس سے ہر ایک شعبۂ حیات میں ترقی ہورہی ہے۔

• فاصلاتی نظامِ تعلیم کی ترویج و اشاعت نیز ترسیل کے لیے مختلف ذرائع کا استعمال کیا جارہا ہے۔ مثلاً Interactive Radio Instruction (IRI)، اسکول ریڈیو، تعلیمی ٹیلی وژن بذریعہ سٹلائٹ نیٹ ورک، ملٹی میڈیا اسکیم اور Web based Delivery of Multimedia Schemes وغیرہ، لہٰذا فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا آسان ہوگیا ہے۔

اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود آزادانہ اور فاصلاتی تعلیم نے معاشرے کی شرح خواندگی کو بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

معاون مضامین اور کتاب:

Ansari MM, Best Practices in Open and Distance Learning Systems in India: An Assessment, Indian Journal of Open Learning, 2002, 11 (2), P.219-228.

Ghosh Samia, Joyshree Nath and others, Open and Distance Learning Education System: Past, Present and Future - A Systematic Study of an Alternative Education System, Vol.3, no.4, April 2012, Journal of Global Research in Computer Science, P.53-57.

Raja Rao S ., The Social Basis of Distance Education: Strategies for Inclusive Growth, Asian Journal of Distance Education, vol.6, no 2, P.58-65.

ریاض احمد، ڈاکٹر، تعلیم و تدریس کے روشن پہلو (2011)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

□

Zubair Shadab Khan National Testing Service - India Central Institute of Indian Languages Mysore - 570006 (Karnataka)

مناظر عاشق ہرگانوی

ٹیگور کا نظریۂ موت و زیست خط کی روشنی میں

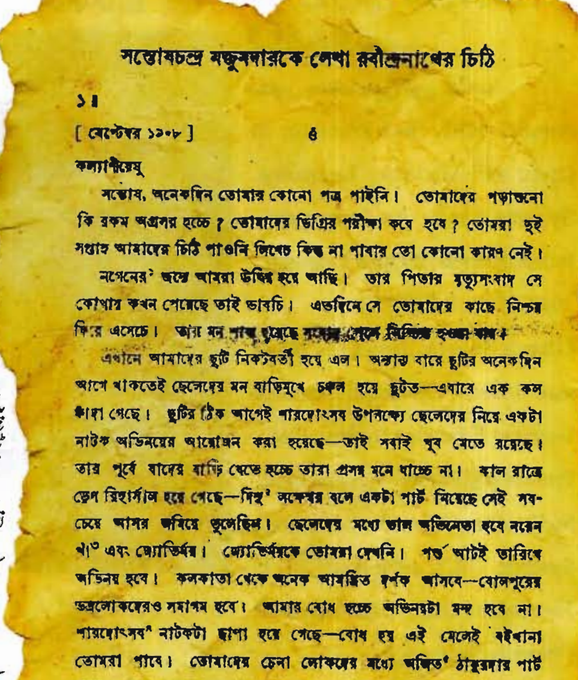

সন্তোষচন্দ্র মজুমদারকে লেখা রবীন্দ্রনাথের চিঠি

১।

[সেপ্টেম্বর ১৯০৮]   ॐ

কল্যাণীয়েষু

সন্তোষ, অনেকদিন তোমার কোনো পত্র পাইনি। তোমাদের পড়াশুনো কি রকম অগ্রসর হচ্ছে? তোমাদের ডিগ্রির পরীক্ষা কবে হবে? তোমরা দুই সপ্তাহ আমাদের চিঠি পাওনি লিখেচ কিন্তু না পাবার তো কোনো কারণ নেই।

নগেনের[১] জন্যে আমরা উদ্বিগ্ন হয়ে আছি। তার পিতার মৃত্যুসংবাদ সে কোথায় কখন পেয়েছে তাই ভাবচি। এতদিনে সে তোমাদের কাছে নিশ্চয় ফিরে এসেচে। তার মন [illegible]

এখানে আমাদের ছুটি নিকটবর্তী হয়ে এল। অন্যান্য বারে ছুটির অনেকদিন আগে থাকতেই ছেলেদের মন বাড়িমুখে চঞ্চল হয়ে ছুটত—এবারে এক কল ফাঁদা গেছে। ছুটির ঠিক আগেই শারদোৎসব উপলক্ষ্যে ছেলেদের নিয়ে একটা নাটক অভিনয়ের আয়োজন করা হয়েছে—তাই সবাই খুব মেতে রয়েছে। তার পূর্বে যাদের বাড়ি যেতে হচ্ছে তারা প্রসন্ন মনে যাচ্ছে না। কাল রাত্রে ড্রেস রিহার্সাল হয়ে গেছে—দিনু[২] সন্ন্যাসীর বলে একটা পার্ট নিয়েছে সেই সব-চেয়ে আসর জমিয়ে তুলেছিল। ছেলেদের মধ্যে ভাল অভিনেতা হবে নরেন খাঁ[৩] এবং জ্যোতির্ময়। জ্যোতির্ময়কে তোমরা দেখনি। পর্শু আটই তারিখে অভিনয় হবে। কলকাতা থেকে অনেক আমন্ত্রিত দর্শক আসবে—বোলপুরের ভদ্রলোকদেরও সমাগম হবে। আমার বোধ হচ্ছে অভিনয়টা মন্দ হবে না। শারদোৎসব[৪] নাটকটা ছাপা হয়ে গেছে—বোধ হয় এই মেলেই বইখানা তোমরা পাবে। তোমাদের চেনা লোকদের মধ্যে অজিত[৫] ঠাকুরদার পার্ট নেবে। ওর জন্যে কলকাতা থেকে পাকা গোঁফ এবং টাক জোগাড় করে আনিয়েছি। সেই ছদ্মবেশে ওকে একেবারেই চেনা যায় না। তোমরা ক্ষিতিমোহন বাবুকে[৬] চেন না—ইনি আমাদের নতুন অধ্যাপক—বেশ রসযুক্ত এবং খুব ভাল লোক। সংস্কৃত ভাষার পণ্ডিত, এম. এ. উপাধিধারী—ইনি সন্ন্যাসী ঠাকুর সাজবেন।

আজ মেলা[৭] সমস্ত অধ্যাপক ও ছাত্রদের একটা বড় [illegible]

সন্তোষচন্দ্র সংখ্যা—২

ایک بنگالی فیملی کی تقریب میں سُبیر چندر مجمدار (Subir Chandra-Majumdar) سے میرا تعارف ہوا تو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ سنتوش چندر مجمدار کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور معلّمی کی زندگی سے سبکدوش ہوکر شانتی نکیتن میں قیام پذیر ہیں۔

سنتوش چندر مجمدار ایک اچھے معلم، ادیب، ڈراما نگار، منتظم، شانتی نکیتن اسکول کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے والے تعاون کار، رابندر ناتھ ٹیگور کے صاحبزادے رتھیندر ناتھ ٹھاکر کے ہم جماعت، شانتی نکیتن کے ابتدائی پانچ طالب علموں میں سے ایک اور ٹیگور کے بے حد قریبی آدمی تھے۔

1901 میں جب ٹیگور نے بنیادی تعلیم کے لیے کلکتہ سے 160 کیلومیٹر دور، ضلع بیربھوم کے ایک چھوٹے سے دیہات اور شہر بولپور سے 4 کیلومیٹر کی دوری پر، پرسکون علاقے میں شانتی نکیتن اسکول کی داغ بیل ڈالی تو اس وقت صرف پانچ طالب علم اس اسکول میں آئے۔ سنتوش چندر مجمدار ان پانچوں میں ایک تھے، سنتوش چندر کے والد ٹیگور کے دوست تھے۔ دونوں گھرانے کے تعلقات اچھے تھے اور دونوں خاندان کے تہذیبی خیالات ملتے جلتے تھے۔

بعد میں رتھیندر ناتھ اور سنتوش چندر کو Illinois-USA بھیج دیا گیا جہاں سے دونوں نے ایگریکلچر میں ڈگری حاصل کی۔

وطن واپس آنے پر رابندر ناتھ ٹیگور نے سنتوش چندر مجمدار کو شانتی نکیتن کے شعبۂ زراعت کی ذمے داری سونپ دی۔

رفتہ رفتہ سنتوش چندر ایگریکلچر کے ساتھ سائنس اور انگریزی بھی پڑھانے لگے۔ شعبۂ پلی سنگھٹن (Palli Sanghatan) کو پروان چڑھانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سنتوش چندر مجمدار ادیب تھے اور مذہبی خیالات رکھنے والے انسان تھے۔ انھوں نے شمالی گیتوں کا ترجمہ بنگلہ میں کیا تھا جو 'پرباسی' اور 'وشوبھارتی' جیسے رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے حضرت محمدؐ کی سوانح بنگلہ میں لکھی تھی۔ ان کا انتقال صرف چالیس سال کی عمر میں 1926 میں ہوا۔

سنتوش چندر مجمدار کے چھوٹے بیٹے سبیر چندر مجمدار (ایم اے، بی ایڈ) پتھیا بھون، وشوبھارتی، شانتی نکیتن میں ٹیچر تھے۔ باتوں کے دوران انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بطور یادگار ٹیگور کے دو خطوط ہیں جو ان کے والد کے نام ہیں، سنتوش چندر مجمدار کے نام ٹیگور کے خطوط کتابی شکل میں بنگلہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ دونوں خطوط دیکھنے کی میں نے خواہش ظاہر کی تو وہ رضامند ہوگئے۔

اور آج یہ دونوں خطوط میرے پاس ہیں۔

میں نے پہلی فرصت میں اپنے دوست بنگلہ کے فلمکار سوشوبھن سین گپتا کی مدد سے ان خطوط کا ترجمہ اردو

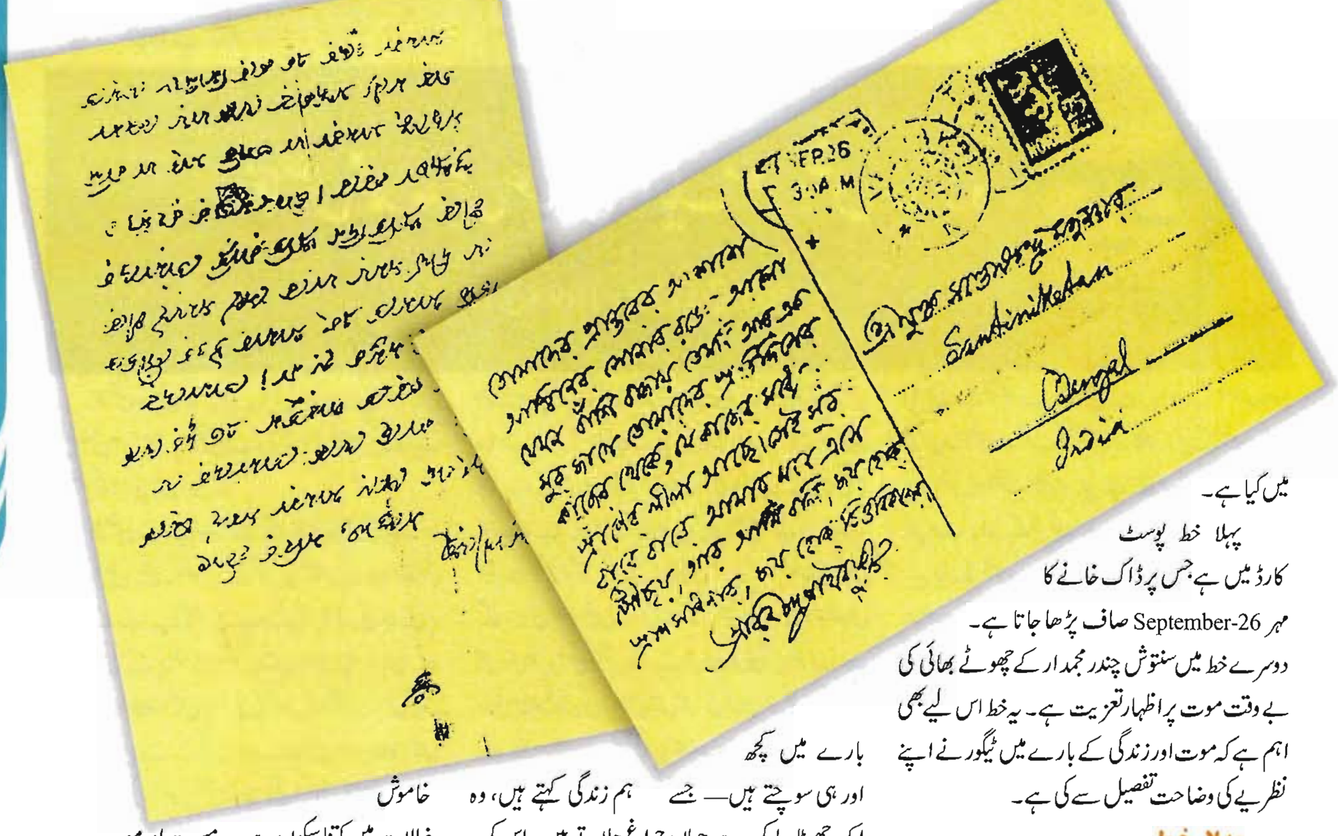

میں کیا ہے۔

پہلا خط پوسٹ کارڈ میں ہے جس پر ڈاک خانے کا مہر September-26 صاف پڑھا جاتا ہے۔

دوسرے خط میں سنتوش چندر مجمدار کے چھوٹے بھائی کی بے وقت موت پر اظہار تعزیت ہے۔ یہ خط اس لیے بھی اہم ہے کہ موت اور زندگی کے بارے میں ٹیگور نے اپنے نظریے کی وضاحت تفصیل سے کی ہے۔

پہلا خط

عزیز سنتوش

تم لوگوں کے مرغزار کے اوپر آسمان ہے، جہاں آسن ماہ کے سونے کے رنگ جیسا ایک بانسری بجاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور پُرترنم آواز سننے کو ملتی ہے۔ تم لوگوں کے روز دن کے کام کاج ہیں، جس میں پوشیدہ ہے فن زیست— اور یہ ترنم بار بار میرے دل میں پہنچ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں، آباد رہو۔ زندگی کی یہ کوشش— روح کی پاکیزگی!

رابندر ناتھ ٹھاکر

دوسرا خط:

عزیز سنتوش

ہم سب محو حیرت بنے ہوئے ہیں، سبی کی موت کی خبر پاکر— قریب رہ کر جو تسلی دے سکتا تھا دور سے یہ ناممکن لگتا ہے، تم لوگوں کے خطوط آنے میں اور میرا جواب ملنے میں جو وقت لگے گا، اس دوران ہر روز، ہر رات کا صدمہ ہے— زندگی اور موت کے درمیان جو راز پنہاں ہے اور اس معاملے میں ہم لوگ جو کچھ سوچتے ہیں یا کہتے ہیں اس میں بہت زیادہ اندھیرا ہے۔ کیونکہ دونوں کو ہم ایک بنا کر دیکھنے کے اہل نہیں ہوتے ہیں۔ ہم دونوں کو منقسم کر کے دیکھتے ہیں— ہم کمرہ کے اندر شمع جلاتے ہیں کیونکہ تاریکی کا احساس صرف گھر کے اندر ہی ہوتا ہے مگر کمرہ روشن کرنے کی فکر میں ہم باہری دنیا کی روشنی کے بارے میں کچھ اور ہی سوچتے ہیں— جسے ہم زندگی کہتے ہیں، وہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں چراغ جلاتے ہیں۔ اس کمرہ کے اندر ہماری روح محدود رہتی ہے۔ یہی ہے ہر فرد کا دورِ حیات— لیکن اس زندگی سے باہر جو حقیقت ہے اسے ہم دائرۂ زندگی سے خارج سمجھ کر غفلت کر بیٹھتے ہیں۔ مگر جس طرح اس گھر اور گھر کے باہر کے ماحول میں کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح زندگی اور موت کے بیچ کوئی فاصلہ نہیں ہے، دونوں کے بیچ کوئی عداوت نہیں ہے۔ چونکہ ہم لوگ اپنی فہم سے زندگی کو ایک الگ شکل میں دیکھتے ہیں اسی لیے تمام حقائق کے ساتھ فرق دیکھ پاتے ہیں— آج جہاں روشنی ہے کل وہاں پھر تاریکی قائم ہوسکتی ہے۔ مگر یہ کائنات محفوظ رہے گی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ اس عظیم حقیقت کو زندگی اور موت ختم نہیں کرسکتی ہے— جس حقیقت کو پاکر زندگی میں ہم خوش ہیں، موت کے بعد بھی ملے گی۔ رات میں اچانک جاگ کر چھوٹا سا بچہ رو پڑتا ہے یہ سمجھ کر کہ اس کی ماں کھوگئی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے واقفیت میں اسے وقت لگتا ہے کہ اس کی ماں روشنی اور تاریکی دونوں میں ہے— زندگی اور موت کے بارے میں ہم لوگوں کی سمجھداری اس بچے کی طرح ہی ہے۔ ہم لوگ بے مطلب خوف زدہ ہوکر روتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ حقیقت زندگی میں ہے، موت میں نہیں، مگر اس دنیا میں حیات کی صورت دیکھ لو جو مسرت کی ہے۔

ہر طرف کی ہریالی، جانور اور عبادت میں اور خاموش خیالات میں کتنا سکون ہے۔ یہ مسرت اور موت کی حقیقت کہاں رہتی ہوگی؟ رات میں جو چراغ جلتا ہے اس میں کتنا ہی تیل ڈالو اور اس کی بتی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، فکر تو رہتی ہی ہے۔ کیونکہ چراغ کی یہ خصوصیت ہے کہ گل ہونے پر بھی حقیقت یا اصلیت ختم نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں روح عظیم اصل ہے۔ روح صغیر کے چراغ گل ہوجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس شکل میں سچائی ہے وہ 'ہاں' ہے 'نا' نہیں ہے۔ اسی پر یقین و اعتماد رکھو۔ صبح کے شبنم کو اصل مت مان لو۔ ہمارے چاروں طرف زندگی جو اعلان— ابدی اعلان کر رہی ہے اسے موت روک نہیں سکتی۔ بادل بار بار آفتاب کے نیچے سے گزر کر اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامیاب رہ جاتا ہے۔ اسی طرح موت بار بار زندگی کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے لیکن زندگی کو مٹا نہیں سکتی ہے۔ اس لیے دل کو پرسکون کر کے حیات کو سلام کہو موت کو نہیں۔ جس سے پیار کرتے رہے ہو، سچ سمجھتے رہے ہو اسے موت میں بھی سچ سمجھو اور خود کو ماتم سے الگ رکھو۔

27 آسین 1327 تمھارا

رابندر ناتھ ٹھاکر

Dr. Manazir Ashiq Harganvi, 'Kohsaar'
Bhikanpur-3, Bhagalpur- 812001 (Bihar)

شاداب عالم

قاضی محمد عدیل عباسی: ایک معروضی جائزہ

(13 مارچ 1898 - 22 مارچ 1980)

قاضی عدیل عباسی کی پیدائش 19 مارچ 1898 میں ضلع بستی صوبہ اتر پردیش کے 'بیارہ' نامی گاؤں کے ایک ذی علم خاندان میں ہوئی۔

قاضی صاحب کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ انھوں نے گھر کی تعلیم کے بعد ابتدائی تعلیم کے لیے اپنے گاؤں سے دو تین فرلانگ کی دوری پر واقع کیوٹلی کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا، وہاں سے انھوں نے 1909 میں پرائمری اسکول کا امتحان پاس کیا۔ 1911 میں قریب کے قصبہ ہلور سے مڈل اور 1916 میں گورنمنٹ ہائی اسکول بستی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ہائی اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گورکھپور چلے گئے اور وہاں سے 1918 میں انٹرمیڈیٹ کیا اور 1920 میں بی اے پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے الہ آباد گئے اور وہاں انھوں نے یونیورسٹی اسکول آف لا میں داخلہ لیا لیکن جب 'تحریک ترک موالات' منظور کی گئی تو کالج چھوڑ کر اس تحریک میں شامل ہو گئے اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں زور وشور سے لگ گئے۔ 1921 میں 'مدینہ' کے صحافتی عملے سے منسلک ہو کر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا لیکن چند وجوہات کی بنا پر اس سے مستعفی ہو کر 1922 میں 'زمیندار' لاہور کے ایڈیٹوریل عملے میں شامل ہو گئے۔ 'زمیندار' کی وطن پرستانہ پالیسی کی وجہ سے جب اس کے ایڈیٹر ظفر علی خان کے ساتھ یکے بعد دیگرے اس کے مدیران گرفتار کیے جانے لگے تو قاضی صاحب نے اس کی چیف ایڈیٹری کا منصب ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور حکومت کے خلاف تیز وتند مضامین لکھے جس نے انگریزوں کے خلاف اہل وطن کے سینوں میں طلاطم برپا کر دیا۔ لیکن دن رات کی محنت کی وجہ سے ان کی طبیعت خراب رہنے لگی، جس کی وجہ سے 18 اگست 1922 میں بحالی صحت کے لیے وطن واپس لوٹ آئے۔ وطن واپس لوٹنے کے چند دن بعد ہی تعزیرات ہند کی دفعہ 124 کے تحت ان کے سات مضامین کو باغیانہ قرار دے کر ان پر سات مقدمے قائم کیے گئے۔ ان میں سے چار ریزرو رکھے گئے اور تین پر مقدمے چلائے گئے۔ مقدمے کی سماعت کے وقت قاضی صاحب نے مجسٹریٹ کے ہر سوال پر یہ کہتے ہوئے جواب دینے سے انکار کر دیا کہ "میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے انکار کرتا ہوں کیونکہ میں آپ کی حاکمانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا" بہرحال آپ کو سزا ہوئی، جیل گئے، بڑی صعوبتیں برداشت کیں لیکن پائے استقلال میں کسی طرح کی جنبش نہ آنے دی اور نہ ہی کسی طرف سے کوئی امداد قبول کی۔ جیل میں غذا کی خرابی اور قلت کی وجہ سے پہلے یرقان اور پھر ملیریا کا حملہ ہوا۔ بیماری کی حالت میں جب ایک سال بعد دسمبر 1923 میں جیل سے رہا ہوئے تو کافی کمزور ہو گئے تھے، اس لیے اپنے آبائی وطن 'بیارہ' میں ایک ڈیڑھ سال تک علاج کرواتے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری ایک ساتھ حاصل کی یہ زمانہ 1925 سے 1927 تک کا ہے۔ اس درمیان وہ مسلسل اپنے مضامین کے ذریعے اہل وطن کے جذبات آزادی کو بیدار کرنے کا کام کرتے رہے۔ وکالت کرنے کے بعد قاضی صاحب نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور قوم وملت کی خدمت میں لگ گئے۔ اسی کے ساتھ وہ عملی سیاست میں بھی سرگرم عمل ہوئے اور اس کے لیے انھوں نے بستی کو اپنا محور بنایا۔ 1926 میں انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبرشپ قبول کی اور 1946 تک اس عہدے پر فائز رہے، ہمیشہ عوام کی فلاح کو مدنظر رکھا اور کوئی ایسی تجویز منظور نہ ہونے دی جس سے عام آدمی اور غریب مزدوروں کے نقصان کا اندیشہ ہو۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب 1937 سے 1957 تک لگاتار یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ قاضی صاحب کے سیاسی مسلک میں انسان دوستی کو اولیت حاصل تھی۔ فرقہ واریت کو وہ ملک وقوم کے لیے زہر تصور کرتے تھے اور ہندو، مسلم، سکھ عیسائی کا بھید بھاؤ نہیں رکھتے تھے۔ وہ شروع سے نیشنلسٹ کانگریسی تھے اور مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کے سخت مخالف۔ مگر ان کا نیشنلزم ملی فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ بن سکا، بلکہ وہ جتنے پکے نیشنلسٹ تھے اس سے زیادہ راسخ العقیدہ مرد مومن۔ قاضی صاحب نیشنلزم اور سیکولرزم کے مفہوم سے پوری طرح واقف تھے اور چاہتے تھے کہ ملک کے نظم ونسق میں سب برابر کے شریک ہوں اور کوئی ایسا قانون نہ نافذ کیا جائے جس سے ملک میں بسنے والے کسی گروہ یا جماعت کے عقائد وجذبات کو ٹھیس پہنچے اور ان کی عزت نفس مجروح ہو۔

1957 میں الیکشن ہارنے کے ساتھ ہی انھوں نے پارلیمانی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مختلف سمتوں میں اپنی خدمات کا رخ موڑ دیا جن میں دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (الف) اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے عملی جدوجہد، جو مکمل طور پر آئینی اور جمہوری تھی، اس کے لیے انھوں نے جنوری 1950 میں بستی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کی تجدید کی اور تاحیات اس کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ (ب) دینی تعلیمی نظام کی شیرازہ بندی کی اور اس کو منصوبہ بند طریقے سے چلانے کے لیے 'انجمن تعلیمات دین' کی بنیاد ڈالی جو بہت کارگر ثابت ہوئی۔ آج بستی (اس میں سدھارتھ نگر کو بھی شامل سمجھا جائے) میں مدارس کا جو جال نظر آرہا ہے ان میں سے بیشتر اسی تحریک کی دین ہیں۔ قاضی عدیل عباسی کی شخصیت کی وضاحت اختر بستوی ان لفظوں میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

قاضی عدیل عباسی کی شخصیت میں متعدد ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو 'بڑا' آدمی بھی بنایا اور 'اچھا' بھی۔ وہ ایک انتہائی ذہین، اقبال مند، اولوالعزم، جری، باہمت اور مستقل مزاج انسان تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ قوت فیصلہ کی مضبوطی اور ارادے کی پختگی ان کا جوہر تھی، جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے اور انھیں عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ بے تعصبی، وسیع المشربی اور مذہبی رواداری ان کے مزاج کا خاصہ تھی جس کے باعث ان کے افکار واعمال، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، کبھی تنگ نظری سے دوچار نہیں ہوئے۔"

(اختر بستوی: قاضی محمد عدیل عباسی (مونوگرف)، ساہتیہ اکادمی، نئی

دہلی، 1997ص:47)

قاضی عدیل عباسی بیک وقت کئی صفات بلکہ متنوع جہات کے حامل تھے۔ وہ صحافی، ادیب، سیاست داں، مفکر اور مجاہد اردو کی حیثیت سے مشہور و مقبول تھے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور خدا داد صلاحیت سے سیاسی، ادبی، مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر گہرے اور فکر انگیز مقالے تحریر کیے اور معاصر مسائل پر اپنی آزادانہ رائے اور موقف کا اظہار دیانت داری اور بے باکی سے مسلسل کرتے رہے۔

اردو سے ان کو عشق تھا۔ وہ اردو کو ہندوستان کی ایک ممتاز زبان سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے قومی تشخص کا ذریعہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ کوئی ایسا نظام تعلیم نہ نافذ کیا جائے، جس سے کسی جماعت کے عقائد و جذبات کو ٹھیس پہنچے اور ان کی عزت نفس مجروح ہو۔ ان کا خیال تھا کہ اردو کی اپنی ایک تہذیب ہے، اس زبان کو ختم کرنے کا مطلب ہے، ایک تہذیب کو ختم کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو کی بقا و تحفظ کے لیے ٹھوس و عملی اقدام کیے اور دینی تعلیمی نظام کی شیرازہ بندی بھی کی۔ جس کے لیے انھوں نے دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کی تشکیل کی، جس کا مقصد مسلمانوں کا دینی تحفظ اور اسلامی تہذیب وثقافت میں استواری تھا۔

صحافت قاضی صاحب کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ ان کی ضرورت بھی تھی اور جس سوچ کو وہ عام کرنا چاہتے تھے اس کے لیے ایک ذریعہ بھی۔ انھوں نے صحافت کے ذریعہ اردو اور مسلمانوں کے مسائل کے لیے آواز بلند کی، علما کی قربانیوں اور جنگ آزادی میں ان کی خدمات کو منوایا، اہل وطن کو غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابھارا اور خودی وخودآگہی کی تعلیم دی، ان کا خیال تھا کہ آزادی میں انسان بحر بیکراں ہو جاتا ہے لیکن غلامی میں انسان احساس کمتری میں مبتلا ہو کر 'شعلہ سوزاں' کو 'دود' سمجھنے لگتا ہے۔ غالب اقوام کی ظاہری چمک دمک اور کھوکھلی تہذیب اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ قاضی صاحب نے مسلسل اپنے قلم سے اہل وطن کو انگریزوں کے جبر وظلم سے واقف کرایا۔ اپنے وطن کی عظمت اور آزادی کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اہل وطن کو بھائی چارگی کی تعلیم دی، فرقہ پرستی کی لعنتوں سے آگاہ کیا اور حکومت کی غلطیوں اور کمیوں پر کھل کر تنقید کی۔ صحافت کے سلسلے میں وہ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے اور حکومت کے خلاف تیز وتند مضامین لکھنے کے پاداش میں جیل گئے۔ وہ جن اخبارات سے وابستہ رہے ان میں 'مدینہ' اور 'زمیندار' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی صحافتی تحریروں کو علامہ اقبال تک قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی مدح وستائش کرتے تھے۔ ہمدم کے مدیر حبیب جالب جن سے قاضی صاحب ایک بار تحریری مباحثہ میں الجھ پڑے تھے، نے انھیں صحافت کا جوہر کامل کہا تھا۔

ان کو 'مدینہ' اور 'زمیندار' کے لیے بہت سے انگریزی مضامین کے ترجمے بھی کرنے پڑے تھے، جس سے ترجمے کے فن پر ان کو عبور حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ لاہور جیل میں قید فرنگ کی سزا کاٹ رہے تھے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ 'بم کا نسخہ' کے نام سے 1923 میں کیا۔ عمر کے آخری ایام میں جب انھوں نے ڈاکٹر تاراچند کی مشہور ومعروف انگریزی تصنیف History of the freedom movement in India کی پہلی اور تیسری جلد کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے اس ترجمہ کو ترجمہ برائے ترجمہ کے بجائے تخلیق کی سطح پر برتا اور شروع سے آخر تک ایسا انداز برقرار رکھا، جس میں تسلسل اور روانی ہے۔ قاضی صاحب نے صرف انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے انگریزی میں باقاعدہ ایک کتاب بھی ''Aspect of politics and society کے نام سے لکھی، جس کی رسم اجرا 15 مئی 1981 کو اندرا گاندھی نے ادا کی۔

قاضی عدیل عباسی نے اردو کے ایک خادم کی حیثیت سے اردو کی علمی، ادبی اور تنقیدی سرمائے میں بھی بیش بہا اضافہ کیا اور بے شمار مضامین، کتابچے اور کتابیں لکھیں جن کی حتمی فہرست تو تیار نہیں کی جاسکتی کیونکہ انھوں نے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا، پھر بھی اختر بستوی نے کچھ مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، جن میں ایک ناول 'چمار کا لڑکا صاحب' جو انھوں نے زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا لیکن چھپ نہ سکا 'کانگریس اور مسلمان' جو کافی ضخیم کتاب تھی جس میں انھوں نے تفصیل سے کانگریس کی تاریخ بیان کی تھی اور اس کی قومی سرگرمیوں میں مسلمانوں کی حصہ داری پر بحث کی تھی اس کے علاوہ 'مسلم پرسنل لا' اور 'اسلام میں کوئی فرقہ نہیں ہے' بھی ان کی کاوشوں کا نتیجہ تھے لیکن کسی وجہ سے شائع نہ ہوسکے اور نہ اب ان کے مسودے ہی دستیاب ہیں کہ انھیں شائع کرایا جاسکے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابچے بھی لکھے جن میں 'جمعیۃ المسلمین'، 'اردو کا استغاثہ' اور 'اردو کا جنازہ' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قاضی عدیل عباسی اقبال کے گرویدہ تھے اور اقبال سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے اشعار کا بیشتر حصہ انھیں یاد تھا اور ان کے اشعار انھیں کے ترنم میں پڑھا کرتے تھے۔ اس گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کلام اقبال کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے ان پر کئی مضامین لکھے تھے۔ ان مضامین میں 'اقبال کا مذہب' اور 'اقبال کا ایک شعر' کے علاوہ ایک کتابچہ 'علامہ اقبال کا پیام طلبائے عصر کے نام' سے 1938 میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں قاضی صاحب نے تین الگ الگ عناوین کے تحت، اقبال کے تین پیغاموں کی تشریح وتعبیر نہایت عالمانہ انداز میں کی ہے۔ جو طلبا اور نوجوانوں کو جمود وتعطل کی لعنتوں سے آگاہ کراتا ہے اور حرکت وعمل کی تعلیم دیتا ہے۔

قاضی صاحب کی اقبال شناسی صرف مضامین اور کتابچوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ انھوں نے کلام اقبال کو عام کرنے کے لیے ایک مستقل اور ضخیم کتاب بھی تصنیف کی جو 'اقبال کا فلسفۂ حیات وشاعری' کے نام سے پہلی بار 1971 میں شائع ہوئی۔

عمر کے آخری پڑاؤ پر انھوں نے کچھ افسانے بھی لکھے تھے جس کو ان کے نواسے محبوب سعید نے 'جرأت رندانہ' کے نام سے مرتب کرکے 2003 میں شائع کیا۔ یہ افسانے ان کی زندگی کا نچوڑ ہیں۔ انھوں نے ان افسانوں میں سماج کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے اور کرداروں کی نفسیاتی تصویر کشی کے ذریعے سچویشن کو ابھارا ہے۔ ان افسانوں میں کہانی پن شروع سے آخر تک قاری کو ایک خاص کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے اور بیانیہ انداز مرکزی خیال کو ادھر سے ادھر بھٹکنے نہیں دیتا۔ ان کے افسانوں کی انھیں خصوصیات کو دیکھتے ہوئے پروفیسر افغان اللہ لکھتے ہیں۔ ''مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب کے افسانے رواروی میں نہیں پڑھے جائیں گے کیونکہ یہ افسانے اپنے عہد کی وہ دستاویز ہیں جن میں اپنے عہد کی شکست وفتح کی تحریر رقم ہے۔''

قاضی صاحب 1968 میں سفر حج پر گئے وہاں سے واپسی پر انھوں نے روداد سفر اور حج کے مسائل کو نہایت ہی والہانہ انداز میں، پر از معلومات کے ساتھ تحریر فرما کر 1970 میں شائع کروایا۔ بہرحال قاضی صاحب کی خدمات چاہے سیاسی ہوں یا صحافتی، ادبی ہوں یا سماجی، قابل ستائش بھی ہیں اور لائق تقلید بھی، جو ہمارے لیے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیتی رہیں گی۔

■

Shadab Alam, 243, Jhelum Hostel, JNU, New Delhi - 110067

محمد سلمان بلرام پوری

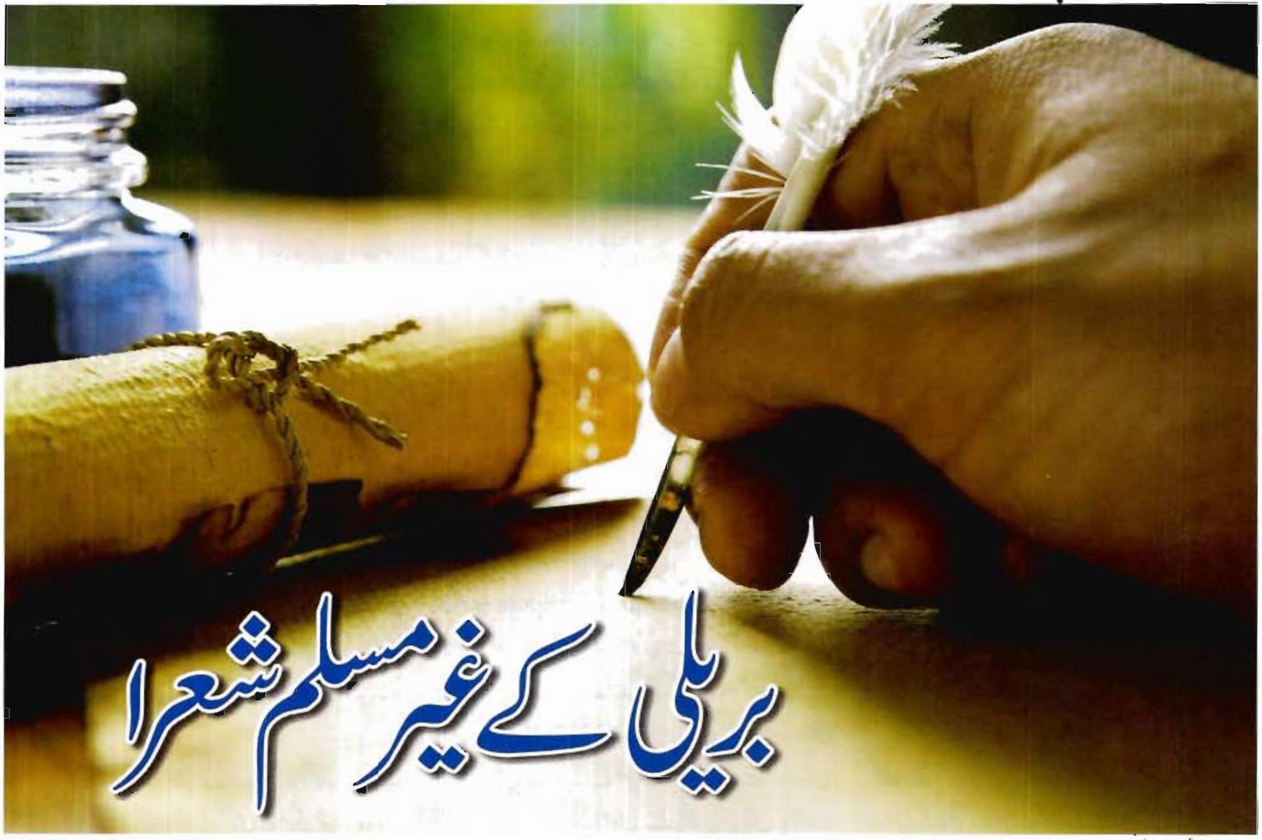

بریلی کے غیر مسلم شعرا

ضلع بریلی میں اردو شاعری کی روایت خاصی پرانی رہی ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ یہاں کے شعرا کا شعری سرمایہ کافی فنی مہارت وریاضت کا حامل ہے نہ صرف فنی مہارت وریاضت کا ہمیں ثبوت دیتے ہیں بلکہ یہاں کی شاعری قابل ستائش بھی ہے یہاں کی شاعری موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان کا اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ مختلف سیاسی، سماجی معاشرتی اور تہذیبی رنگوں کا عرفان دیتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں کے ممتاز شعرا نے نہ صرف فطرت کے دیگر شاداب اور سحر کار مناظر کو اپنی تخلیقات میں سمونے کی کوشش کی ہے بلکہ ان تخلیقات میں ہم روہیلکھنڈ کے جسم وروح کے حسین امتزاج دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کے غیر مسلم شعرا میں پنڈت چھمی رام منشی آنند نارائن، منشی روپ نارائن، منشی بھگوان داس، منشی جیون سہائے، بابو منموہن لال ایڈوکیٹ، منشی رگھبر دیال، مخمور لال، پنڈت دینا ناتھ، جوہر منشی سیورام، راجہ رتن رند بریلوی۔ پنڈت ٹھاکر پرساد، پنڈت جولا پرشاد منشی سمھو سہائے جوش اور جوہری بابو بھیروں پرساد وغیرہ۔

پنڈت چھمی رام کشمیری۔ دہلوی ثم بریلوی کے بارے میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

''ایک طویل مدت دہلی میں مقیم رہے کچھ عرصے سے تقریباً 1800 میں لکھنؤ میں قیام ہے وہاں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں نوکر ہیں بریلی میں متعین ہیں اور آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہوشیار اور خوش اطوار شخص ہیں۔ فن سخنوری سودا کی تتبع کی ہے۔ فدا ان کا تخلص تھا''

> اگر ہم یہ کہیں کہ یہاں کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان کا اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ مختلف سیاسی، سماجی معاشرتی اور تہذیبی رنگوں کا عرفان دیتی ہے تو غلط نہ ہوگا

نمونہ کلام:

ہوا ہے قصرِ مجنوں اگرچہ شہر آشوب
ہمارے عشق کی بھی داستان باقی ہے
کہا جوان سے کے میں دل تو کرچکا ہوں فدا
تو ہنس کے بولے ابھی تجھ میں جان باقی ہے

تعریف کشمیر میں لکھتے ہیں کہ:

ایک قطعہ زمین ہے روئے زمین پر
کشمیر جس کی سیر کے قابل زمین ہے

(عمدہ منتخب بہار گلشن کشمیر معارف فروری 1967)

پنڈت چھمی رام نے اپنے پیچھے بہت سے شاگرد بھی چھوڑے جن میں سے پنڈت بخت مل جن کا تخلص تمکین تھا۔ بہت مشہور ہوئے تذکرہ عمدہ منتخبہ میں لکھا ہے کہ آپ کی اصل کشمیر اور مولد دہلی ہے۔ آپ جوان مودب ومتواضع تھے اور پیشہ میں وکالت میں ماہر تھے۔ سرکار بریلی میں قیام تھا۔ کچھ عرصے پہلے کسی کام سے دہلی تھے شعر عاشقانہ اور مربوط کہتے تھے:

قید سے ہو تیری ظالم جو رہائی مجھ کو
پھر نہ دوں دل تجھے ہے تیری دہائی مجھ کو

بن گیا آئینہ تمثال سرا پا حیرت
تیرے چہرے کی جو یاد آئی صفائی مجھ کو

آج سر پنجۂ مژگان جو یہ خوں رنگیں ہے
کس کا خوش آیا ہے یہ دست حِنائی مجھ کو

فصل گل جاتی ہے اور کنج قفس ہے تمکین
وا دریغا نہیں سوجھے ہے رہائی مجھ کو

کچھ اہم بریلوی شعراء کے کلام ملاحظہ ہو:
منشی آنند نرائن استھام نرائن استھام بریلوی۔

حسرت نہیں رہی اور کوئی ارماں نہیں رہا
دل قابل محبت جاناں نہیں رہا
(گلدست بہارِ سخن)

منشی بھگوان داس اثر بریلوی:

نوجواں تجھ سا زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا
پھرتے پھرتے فلک پیر کو چکر آیا
(گلدست لطیف)

منشی جیون سہائے احقر بریلوی:

رہ گیا مقتل میں میں اک جاں دینے کے لیے
صاف تھا میدان جس دم کے لیے خنجر اٹھا
(بہارِ خزاں 1901)

بابومنموہن لال شمیم ایڈوکیٹ

1960 میں ذکاتی محلّہ بریلی میں مقیم تھے آپ حضرت خواہاں بریلوی کے بڑے محبوب شاگرد تھے آپ کے مکان پر اہل علم کا مجمع رہتا تھا۔ جناب فانی بدایونی اور جناب جگر بریلوی سے آپ کے خاص تعلقات تھے، جناب جگر بریلوی نے 'مکاتیب شمیم' مرتب کیے تھے جو غیر مطبوعہ منشی دیرندر پرسا دسکسینہ بدایونی کے پاس محفوظ ہیں:

کیفیت شباب یہ ہے چشم یار میں
ہومست جس طرح کوئی مے کے خمار میں
وعدہ کسی کا ہے ترے آنے پر منحصر
آجا تو اے اجل کہ میں ہوں انتظار میں
ہنستے ہوئے وہ آئیں مرے پاس اے شمیم
کچھ ہوا اثر جو گریۂ بے اختیار میں

لالہ بنارسی داس مخمور بریلوی:

سجدے کرتے فرشتے بھی آکر
توبہ توبہ وہ بت خدا نہ ہو ہوا

پنڈت دیناناتھ وفا کشمیری بریلوی:

جناب وفا فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے مرزا علی اکبر عارف شیرازی 1809 کے شاگرد تھے۔ جناب وفا کی ایک فارسی 'مثنوی گل وبلبل' اور اردو مثنوی 'داغ دل' مصنفہ 1837 کے قلمی نسخے کتب خانہ رام پور میں محفوظ ہیں، آپ کا آخری زمانہ عہد واجد علی شاہ میں لکھنؤ میں گزرا:

خیالی زلف پریشاں شگفتہ کرد مرا
شمیم طرہ جاناں شگفتہ کرد مرا
راحت تیغ نگاہ یار می دانیم ودل
لذت زخم دل افکار می دانیم و دل

جوہر منشی سیوارام بریلوی:

منشی عوض رائے مسرت شاہ جہانپوری کے شاگرد تھے تذکرہ شعرائے ہنود میں لکھا ہے کہ آپ بڑے فصیح وبلیغ شاعر گذرے ہیں، علم نحو میں انہوں نے ایک نہایت عمدہ رسالے جواہر الترکیب لکھا ہے کہ جس کی نظیر آج تک دیکھنے کو نہیں ملی۔ جس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

بعد حمد نعت ومدح ظل سبحاں اے ہمام
خواں ز جوہر ایں قصیدہ جوہر الترکیب
باہمہ تحقیق بہر مبتدی ومنتہی
نظم کردم من اصول نحو وزفارس کلام

جواہر الترکیب کا آخری شعر یہ ہے:

سال ہجری یک ہزار دوصد افزوں سی وپنج
عہد ظل اللہ اکبر شاہ کردم اختتام

1821 میں جناب جوہر کسی بات پر اپنے استاد مسرت سے ناراض ہوکر کلکتہ چلے گئے تھے وہاں علم کی تکمیل کی جب واپس آئے تو استاد کا انتقال ہو چکا تھا آپ کی تصانیف میں دلیل الترکیب املائے جوہری اور جواہر التعلیم ہیں۔ مہاراجہ رتن سنگھ زخمی بریلوی 1782 میں پیدا ہوئے اور 1851 میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد مالک رام نواب آصف الدولہ 1795 کے زمانے میں میر آتش تھے، ان کے نام سے لکھنؤ میں ایک محلّہ توپ خانہ مالک رام اب تک مشہور ہے، راجہ رتن سنگھ شاہاں اودھ کے منشی تھے، نواب محمد علی شاہ کے زمانے میں دیوان ہوئے۔ اور فخر الدولہ دبیر الممالک اور مہاراجہ کا خطاب پایا۔ 1849 میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ علوم عربی فارسی ترکی سنسکرت اور انگریزی سے واقف تھے۔ آپ شیخ مصحفی نے آپ کا ذکر اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اس طرح کیا ہے،

''راجہ صاحب کو حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی 1835 سے بڑی عقیدت تھی حضرت کی سوانح حیات ''راز و نیاز'' میں آپ کا ذکر کافی مقامات پر ہے''۔

جگر نہذب بہ خوں جاں بہ لب رسیدائے وائے
من ستم زدہ دایں عذاب ہائے فراق

راجہ صاحب نے کئی منقبت بھی لکھے۔

بہ تو شاہا صد سلام وبرتو شاہاصد درود
زخمی غم دیدہ راہبرہ خدا در باب زود

راجہ صاحب کی ایک کتاب سلطان التواریخ مولفہ 1842 یادگار ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا آپ کے نواسے کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں خاص سے نیشنل میوزیم کراچی منتقل ہوا تھا، وہ مخطوطہ اب دستیاب نہیں راجہ صاحب کے صاحب زادے کنور دولت سنگھ شکری بریلوی بھی شاعر تھے۔

ان کا کلام اب نہیں ملتا ان کی ایک منظوم کتاب مولفہ 1836 کی تاریخ خلیفہ امیر المومنین آزاد بریلوی کے قلمی دیوان میں موجود ہے۔

صاحب طبع شکری خوشگو
خوش بیاں خوش معاملہ خوشخو

فلسفی رائے منولال کایستھ بریلوی:

شاعری میں کافی استعداد رکھتے تھے طبیب، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ مفردات طب آپ کی تصنیفات میں سے یادگار ہے۔

اشکی راجہ کندن لال:

خلف رائے منولال فلسفی بریلوی جناب اشکی حقیقتاً فخر بریلی تھے بے شمار علوم میں کامل اور لاتعداد کتابوں کے مصنف تھے، معقولات ومنقولات کی تحصیل علمائے کاملین سے کی، علوم حکمیہ مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے پڑھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے شعرا مثلاً پنڈت گنگا پرساد رند بریلوی، مضطر پنڈت بریلوی، پنڈت جولا پرشاد بریلوی وغیرہ ہیں۔

■

Mohd Salman Balrampuri, 137, S S Hall North, AMU, Aligarh - 202002 (UP)

خاکہ نگاری اور مرزا فرحت اللہ بیگ

روحی فرزانہ

مغرب کی صنعتی برکتوں کے مثبت و منفی اثرات انگریزی سے ہوتے ہوئے ہمارے اردو ادب میں بھی داخل ہوئے ہیں۔ خاکہ نگاری بھی انھیں اثرات کی دین ہے جو اب باقاعدہ ایک صنف کی صورت اور منصب اختیار کر چکی ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعے کسی فرد واحد کی مختصراً اور اجمالاً اس انداز میں تصویر کشی کی جائے کہ جس سے اُس شخص کی بھرپور شخصیت اپنی تمام تر رعنائیوں، لطافتوں اور نفسیات کے ساتھ سامنے آجائے۔ 'خاکہ' کے لفظی اور ادبی معنیٰ دونوں ایک جیسے لیے جاتے ہیں یعنی وہ نثری تحریر جس میں مختصراً اور نہایت ہی اشارے کنائے میں کسی شخص کا ناک، نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ یہ ایک پرزم نما فن ہے جس کے ذریعے کسی بھی شخصیت پر متعدد پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاتی ہے جس سے اس کی بھرپور شخصیت ہمارے سامنے واضح دکھائی دینے لگتی ہے۔ خاکہ نگاری کے متعلق خلیق انجم کی یہ بات بہت درست معلوم ہوتی ہے کہ:

''خاکہ نگاری کا فن بہت ہی مشکل اور نازک فن ہے اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب ادا کرنے پڑتے ہیں ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی حسین مورت کس طرح تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی میں نے صرف زائد حصے کو علاحدہ کر دیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے، وہ سوانح عمری میں سے زائد حصے کو اس طرح الگ کر دیتا ہے کہ شخصیت اپنے اصل روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔''

(عبدالحق کی خاکہ نگاری۔فن اور تنقید: خلیق انجم، ص 71-370)

خاکہ نگاری حقیقتاً نثر میں فن غزل گوئی ہے یعنی ایجاز و اختصار میں کسی بھی شخصیت کا خاکہ کھینچنا۔ اس کے روابط سوانح نگاری سے بڑے گہرے ہیں البتہ یہ سوانح نگاری سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعے کسی شخصیت کے خط و خال واضح کرنے کے لیے اس شخص کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بھرپور نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس صنف کے تحت بجائے یہ کہ اس شخص کا قصیدہ یا مرثیہ پڑھا جائے اس کی اپنی تمام تر انسانی خوبیوں اور خرابیوں کا مجموعہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اور بجائے یہ کہ فرد واحد کی زندگی پر مفصل نظر ڈالی جائے یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے اس شخص کی زندگی سے چند واقعات لے کر انھیں کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ شخصیت کے خط و خال اپنے مجملہ محاسن اور عیوب کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ افروز ہو۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اس لحاظ سے ادب میں ایک نئی صنف کے موجد ہیں۔ خاکہ نگاری اردو ادب میں باضابطہ انھیں سے شروع ہوئی۔ مرزا اپنے استاد گرامی ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی' عنوان سے لکھ کر نذیر احمد کی شخصیت کو قاری کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی بھرپور تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ خاکہ انھوں نے اس وقت کھینچا جب ان کا فن اپنے نقطۂ عروج پر تھا یعنی انھوں نے یہ کارنامہ اپنی وفات سے بیس برس قبل انجام دیا۔ ان کو طویل عمر ملی لیکن ان کا ادبی عرصۂ حیات نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ 1927 میں شائع اس خاکے میں نذیر احمد کی سیرت، کردار، شکل و شباہت، عادات و اطوار، حلیہ اور لباس وغیرہ سب کا نقشہ بڑی ہی خوش اسلوبی سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جس طرح پطرس بخاری کے بارے میں ناقدین ادب کی آرا ہیں کہ پطرس اگر مضامین پطرس کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے تو ان کا اردو ادب میں وہی مقام رہتا جو کہ اب ہے ویسے ہی مرزا فرحت اللہ بیگ اگر 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی' کے علاوہ کچھ نہ لکھتے تب بھی اپنے اسی خاکے کی بدولت اتنا ہی مشہور و مقبول اور زندۂ جاوید رہتے جتنا کہ آج ہیں۔ ان کی فنی خوش مذاقی کے متعلق وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''فرحت اللہ بیگ کا اسٹائل اپنی خوش مزاقی کے باعث بڑا مقبول ہے اور اگرچہ بنیادی طور پر یہ انداز وہی ہے جسے محفوظ علی بدایونی نے اپنے مضمون کے سلسلے میں بڑی خوش اسلوبی سے رائج کیا تھا۔ تاہم اسے پروان چڑھانے اور خوش مذاقی کے صحیح معیار سے قریب تر کرنے کا سہرا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔ خوش مذاقی کے اس اسٹائل کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں واقعہ کردار یا موازنہ وغیرہ سے قہقہوں کو تحریک دینے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ الفاظ اور جملوں کو ایسی شگفتہ کیفیت میں سمو کر پیش کیا جاتا ہے کہ دل و دماغ ایک نفسی انبساط میں ڈوب جاتے ہیں۔'' (اردو ادب میں طنز و مزاح: وزیر آغا، ص 21-220)

خاکہ نگار نے مذکورہ خاکے میں نذیر احمد کے ظاہر و باطن کو آئینہ بنا کر پیش کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی خوش طبعی سے اس خاکے میں مزاح کی چاشنی ڈال کر خاکہ نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت کے ذائقے میں بڑی دلچسپی پیدا کر دی جس سے اس خاکے کا مزا دوبالا ہو گیا۔ جیسا کہ ان کے منفرد اسلوب سے متعلق وزیر آغا تحریر کر چکے ہیں۔ مرزا کی معصومیت کی انتہا یہ ہے کہ انھوں نے نذیر احمد کی جو تصویر پیش کی ہے وہ نہایت صاف شفاف، تصنع اور بناوٹ سے یکسر عاری ہے۔ پورے خاکے میں ایسا لگتا ہے کہ کہیں بھی مبالغہ آرائی یا لفظی بازیگری سے کوئی کام نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ یوں

محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور جو کانوں نے سنا اسے بنا کسی تامل اور لاگ لپٹ کے ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ہر چند کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس جامع اور آفاقی نوعیت کے خاکے کے علاوہ اور بھی کئی خاکے مثلاً ایک وصیت کی تکمیل، 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'، 'والعظمت للہ'، 'لالہ سری رام'، 'خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان' اور حکیم آغا جان عیش وغیرہ ہیں مگر جو مقبولیت اور شہرت دوام 'نذیر احمد کی کہانی...' کے حصے میں آئی وہ کسی اور خاکے کو نصیب نہیں ہوئی۔

ویسے تو اردو میں باقاعدہ خاکہ نگاری کا رواج تو حال ہی میں ہوا لیکن شعرا اردو کے تذکروں میں اس کی تھوڑی بہت جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں جس طرح انھیں تذکروں میں تنقیدی نقوش کی بازیافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں میر کے 'نکات الشعرا'، مصحفی کے 'تذکرہ ہندی'، شیفتہ کے 'گلشن بیخار'، قدرت اللہ قاسم کے مجموعۂ نغز اور سعادت یار خاں کے 'خوش معرکۂ زیبا' کو چند نمونوں کے بطور پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' ایک ایسی کتاب ہے جس میں بیسیوں چلتی پھرتی اور منہ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس کوشش کو اگر خوبصورت تصاویر کا البم کہا جائے تو ہرگز برا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد کی دوسری کتاب 'دربار اکبری' اور انشاء اللہ خاں انشا کی 'دریائے لطافت' میں بھی چند شخصی تصاویر کی چھاپ کا اثر، نذیر احمد کی کہانی پر چھوڑا ہے۔ ان کے دیگر خاکوں میں یہ عنصر کمیاب ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے پہلے کے خاکے کے مقابلے میں دیگر خاکے مقبولیت نہیں پا سکے۔ اس کے متعلق طارق سعید لکھتے ہیں کہ:

''مشاہدے کی صحت، تجربے کا خلوص اور مواد کی تنظیم کے جس معیار کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اس کا اندازہ مولوی نذیر احمد کی لفظی تصویر کے ایک بامعنی تسلسل میں نہاں ہے۔ مزاحیہ مرقعوں میں فنی تنظیم کا وہ تصور نہیں ہوتا جو مختصر افسانے میں ہوتا ہے لیکن یہ مرقعہ اپنی تنظیمی قوتوں سے کسی بھی افسانے سے ٹکر لے سکتا ہے۔'' (اردو طنزیات ومضحکات کے نمائندہ اسالیب: طارق سعید، ص 36-135)

مرزا کا کردار کوئی ماورائی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ ایک جیتا جاگتا اور متحرک کردار ہے۔ اس خاکے میں جو بھی باتیں کارفرما ہیں وہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے استاد ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ان کے لگاؤ اور ہمدردی، شوخ چشمی، خلوص اور ان سے بے باک گفتگو ہے۔ ان تمام بے تکلفانہ باتوں کے باوجود چند نکات ایسے ہیں جنھوں نے مرزا کو اپنے استاد کی سوانح لکھنے میں رخنہ ڈالا۔ اس کی وجہ سے ایک عمر تک وہ تذبذب اور کشمکش کا شکار رہے کیونکہ ان کی نگاہ میں مولانا کے محاسن و معائب دونوں موجود تھے۔ شاگرد ہونے کے سبب مرزا فرحت اللہ نے نذیر احمد کو چونکہ بہت قریب سے دیکھا تھا اس لیے نذیر احمد کی شخصیت سے کماحقہ آگاہی رکھتے تھے اور مرزا بذات خود بھی ایک سچے اور کھرے انسان تھے اس لیے انھوں نے نذیر احمد کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بڑی دیانتداری کے ساتھ بیان کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاکے میں نذیر احمد سے متعلق جن خرابیوں کا ذکر کیا ہے اس میں انھوں نے ادب واحترام اور ہمدردانہ انداز نظر کو حاوی رکھا ہے۔ ان کی خامیوں

> **مرزا فرحت اللہ بیگ اس لحاظ سے ادب میں ایک نئی صنف کے موجد ہیں۔ خاکہ نگاری اردو ادب میں باضابطہ انہیں سے شروع ہوئی۔ مرزا اپنے استاد گرامی ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی' عنوان سے لکھ کر نذیر احمد کی شخصیت کو قاری کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی بھرپور تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔**

سے متعلق ایک مقام پر اپنے خاکے میں وہ کس معصومانہ انداز سے ان کے سود لینے کی بات کا ذکر کرتے ہیں ملاحظہ کریں:

''سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے۔ اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے، ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے لسان، بھلا ان سے کون در آسکتا تھا اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے...''

(ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، مشمولہ 'مضامین فرحت' (حصہ اول): مرزا فرحت اللہ بیگ، ص 5)

ڈپٹی نذیر احمد سے مرزا فرحت اللہ بیگ نہ صرف یہ کہ بے تکلف تھے بلکہ شوخی بھی خوب کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا روزانہ حسب معمول ان سے تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ حصول تعلیم کے دوران مرزا کو اکثر و بیشتر مولی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار بھی سنی پڑتی تھی۔ اپنے خاکے میں جب وہ ان کا سراپا بیان کرتے ہیں تو مولوی صاحب کی بھرپور تصویر تصور کی نظر میں ہمارے سامنے یوں جلوہ نما ہو جاتی ہے:

''رنگ سانولا تھا مگر روکھا۔ قد خاصا اونچا، مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دہرا بدن، گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا، اس لیے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ تو ندا س قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں، تکلیف دہ خیال کیا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمند باندھتے تھے۔ اس کے پلواڑسنے کی بجائے ادھر ادھر ڈال لیتے تھے، مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے، اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔''

(ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، مشمولہ 'مضامین فرحت' (حصہ اول): مرزا فرحت اللہ بیگ، ص 5)

مذکورہ اقتباس کا مطالعہ کر کے کوئی بھی انسان نذیر احمد کی ایک خیالی تصویر اپنے تصور میں بنا لے گا۔ پورے خاکے میں مرزا فرحت نے اپنی جدت طرازی اور شوخی سے لبریز نثر میں اپنے استاد کے مجملہ عادات واطوار، رفتار وگفتار اور حلیے کو زیر لب مسکراہٹ بھرے جملوں میں اس طرح ابھارا ہے کہ پڑھنے والا ان کے ایک ایک جملے پر داد وتحسین سے نوازتا ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی خوش فعلیوں کی داد دیتا چلا جاتا ہے۔ اس امر میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں انھوں نے مولوی صاحب پر مختلف انداز اور زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔ کہیں ان کے قد اور کاٹھی کا ذکر ہے تو کہیں، کھانے اور پینے کی تفصیل تو کہیں دیگر معمولات اور کہیں کہیں ان کی علمی بصیرت سے بھی قاری کو خاطر خواہ آگاہی دلائی ہے۔ غرض کہ فرحت اللہ بیگ نے جس قسم کی خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے وہ اپنے آپ میں ہی ایک مثال ہے اور پورے اردو ادب میں اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس اردو ادب میں اس روایت کے موجد اور خاتم دونوں ہی ہیں۔

■

Dr. Ruhi Farzana, D/o Salahuddin Khan
Advocate, Village & Post Office - Raniganj,
Block - Jagdishpur, District - Amethi, UP

عبدالناصر فاروقی

طاعون کا محقق اوّل — ابن الخاتمہ اندلسی

اندلس کے اسلامی عہد میں علم طب اور اس سے متعلقہ علوم میں مسلمانوں کی خدمات کا سرسری طور پر جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان علوم کی ترقی ترویج و اشاعت اور مختلف امراض کی تشخیص وعلاج میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ بعد کے ادوار میں محققین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے اور انھی کو بنیاد بنا کر ان میں بیش بہا اضافے کیے گئے۔ اندلس کا یہ عہد زریں اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں علم طب ہی نہیں بلکہ جملہ علوم وفنون میں ایسی حیرت انگیز اور نقلاب آفریں ایجادات معرض وجود میں آئیں جن کا تمام تر سہرا وہاں کے مسلم دانشوران اور ماہرین کے سر جاتا ہے۔ اندلس کی دانشگاہوں اور دارالعلوم سے بہت نامی گرامی اطبا وابستہ رہے جن کے علاج و معالجے اور تشخیص امراض کے محیرالعقول واقعات آج بھی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مشہور مستشرق لین پول کے مطابق:

''فن جراحت کو اندلس کے ماہرین جراحت کی نئی نئی معلومات سے اس قدر وسعت وترقی ہوئی کہ تمام گزشتہ صدیوں میں بہ استثنائے عہد جالینوس عدیم المثال تھی۔''

اندلس کی سرزمین سے وابستہ جن سربرآوردہ اطبا نے تاریخ طب میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ان میں ابن الخاتمہ (1323-1374) کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اسے ایک طبیب، ادیب، شاعر، مورخ ماہر لسانیات اور نجومی کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس کا اصل نام احمد بن علی بن محمد بن علی بن محمد بن خاتمہ، ابوجعفر الانصاری اور الاندلسی تھا۔ یہ اندلس کے شہر المریٔہ میں پیدا ہوا، وہیں اس کی تعلیم بھی ہوئی اور زندگی کا بیشتر حصہ اس نے وہیں گزارا۔ مورخین نے 1323 اس کی سال پیدائش تحریر کی ہے۔ یہ حضورؐ کے انصاری اصحاب میں سے ایک صحابی کی اولاد میں تھا۔ غرناطہ کا مشہور طبیب مصنف، شاعر اور سیاست داں لسان الدین ابن الخطیب (1323-1371) سے اس کی گہری دوستی تھی اور مملکت غرناطہ کے دیگر مشاہیر سے بھی اسے مصاحبت حاصل تھی تاہم وہ اعلیٰ عہدوں پر کبھی بھی فائز نہیں رہا اور بحیثیت کاتب یا پھر المریٔہ کی مسجد میں مقری کی حیثیت سے اس کا نام سامنے آتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت نیک نامی وشہرت حاصل کی۔ اس کے اساتذہ میں ابوالبرکات البلافقی، ابن لیون، ابن جابر، ابن شعیب اور ابن فرکون جیسے جید علما شامل تھے۔ اس نے باوقار اور پرعظمت زندگی گزاری اور ستر سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ اس کی تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں ہوسکا ہے لیکن ابن الخطیب نے الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ، میں لکھا ہے کہ 1369 تک وہ زندہ تھا۔

ابن الخاتمہ نے اشعار پر مشتمل یادگار کے طور پر تصنیف چھوڑی ہے اس کے علاوہ کم ازکم دو نثری نمونے اور متعدد رسالے اس کے علمی آثار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس کے علمی شاہکار میں شامل ہیں۔

(1) المریٔہ علی غیرھا من بلاد الاندلسیہ: اس میں المریٔہ کی تاریخ درج ہے۔ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن تاریخ نگاروں جیسے ابن الخطیب، المکرّی اور ابن القاضی وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(2) دیوان: یہ پانچ حصوں میں پائی جاتی ہے۔ گلبرٹ نے اس کا اندلسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

(3) کتاب الرحیق التحلیہ فی فائق التوریہ: یہ شاعری کے موضوع پر ہے جسے اس کے شاگرد ابن زرکالہ نے مرتب کیا تھا۔

(4) الفصل العادل بین الرقیب والواشی العادل

(5) ارادلائل فی انشاد الدوائل

(6) اس کی ایک کتاب گرامر پر بھی ہے جو الحاق العقل بالحس کے نام سے جانی جاتی ہے۔

(7) تحصیل الاغراض القاصد فی تفصیل المرض الوافد:

یہ کتاب مرض طاعون پر لکھی گئی ہے جو المریّہ میں 1348/49 میں بڑی شدت سے پھیلا تھا۔ ابن الخاتمہ نے اس وبا کے اسباب اور اپنے وطن المریّہ میں اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے کیونکہ یہ ان رسائل قدیمہ میں سے ایک ہے جس میں طاعون کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مرض وہاں یکم جون 1348 سے پھیلنا شروع ہوا تھا اور اس وقت تک اثر انداز رہا جس وقت تک کہ ابن الخاتمہ نے اپنے اس رسالے کو فروری 1349 میں تحریر کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی قدامت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ اپنی افادیت کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ درحقیقت یہ رسالہ ان دس سوالوں کے جواب میں ہے جو قدرے تفصیل سے اس میں درج ہیں۔ اس رسالے میں مندرجہ ذیل مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔

1. طاعون پر عمومی بحث اور اس کے عربی نام پر مفصل بحث۔
2. اس مرض کے عمومی اور خصوصی اسباب

ابن الخاتمہ نے لکھا ہے کہ میری زندگی کے تجربے کا یہ نچوڑ ہے کہ اگر کوئی شخص متعدی مرض کی چھوت اور زد میں آجائے تو وہ فوراً اس مرض میں ایک ہی علامات کے ساتھ مبتلا ہوجاتا ہے مثلاً اگر پہلا مریض منہ سے خون تھوکتا ہے تو اس دوسرے مریض کو بھی منہ سے خون آنے لگے گا۔ اگر پہلے مریض کی گلٹیاں نمودار ہوتی ہیں تو دوسرے مریض کی گلٹیاں بھی اسی جگہ نکلتی ہیں۔ اگر پہلے مریض کو ناسور ہے تو دوسرے مریض کو بھی ناسور ہوجاتا ہے۔ متعدی بیماریوں کی ان خصوصیات کو اصولی طور پر سب سے پہلے اس طبیب نے بیان کیا ہے۔ تمام یونانی حکما اور اس سے پہلے عرب کے اطبا نے اس اصول کو نظرانداز کیا ہے۔

3. ان عوامل پر مفصل غور جن کے تحت یہ مرض کچھ لوگوں کو متاثر کرتا ہے جب کہ اسی ماحول میں رہنے والے دوسرے لوگ بالکل متاثر نہیں ہوتے اور دوسرے یہ کہ یہ وبا المریّہ کی طرف بہ نسبت اندلس کے دوسرے شہروں کے جلدی کیوں نازل ہوئی۔
4. امراض متعدیہ یعنی چھوت چھات سے پھیلنے والے امراض کے تصور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ عہد وسطیٰ کے طبی ادب میں یہ کسی قدر نیا اضافہ ہے۔
5. احتیاطی تدابیر جو مرض طاعون کے سلسلے میں اختیار کی جاسکتی ہیں۔
6. معالجات جو اس مرض میں خاص طور سے مفید ہیں۔

بقیہ سوالات وبائیات سے متعلق ہیں۔ ابن الخطیب اور ابن الخاتمہ نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ چھوت والے امراض ان چھوت دار اجسام سے پیدا ہوتے ہیں جو جسم میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اسی کو موجودہ دور میں جرم تھیوری کہا جاتا ہے۔ ابن الخاتمہ نے اس رسالے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس مرض کی ترسیل تعلق میں رہنے والے کپڑوں، برتنوں اور کان کی بالیوں سے ہوسکتی ہے۔ ابن الخاتمہ کے اس جراثیمی نظریے سے متاثر ہوکر John Snow (1813-1858) اور William budd (1811-1880) نے میعادی بخار اور ہیضے کی متعدی نوعیت پر کام کیا اور یہ بتایا کہ یہ امراض متعفن پانی کے استعمال سے پھیلتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس تحقیق کو خورد بین کی مدد سے مشاہدہ کیا۔ علامہ حکیم کبیرالدین (وفات 1976) نے رسالہ ارمغان میں نفخ الطب جو تاریخ اندلس کی ایک ضخیم کتاب ہے، کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ ابن الخاتمہ اس امر کے قائل تھے کہ انسان کے ماحول میں کچھ باریک باریک اجسام ہوتے ہیں جو انسان کے جسم میں پہنچ کر موجب امراض بنتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ ان کی اپنی طبیعت ناساز ہوگئی۔ بحیثیت طبیب انھوں نے اپنی علالت طبع کے سبب پر کافی غور کیا، بظاہر کوئی سبب نظر نہیں آیا۔ بالآخر انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ کتابوں کے انبار میں جن میں وہ مشغول تھے اور جو کرم خوردہ اور بوسیدہ تھیں، کچھ ایسے ننھے ننھے غیرمرئی اجسام (Invisible Bodies) ہیں جو میرے جسم کے اندر براہِ تنفس داخل ہورہے ہیں۔ یہی اجسام صغیرہ میری طبیعت کی بدمزگی کے موجب ہیں۔ آج کل انھی اجسام کو جراثیم کی اصطلاح دی گئی ہے۔

ابن الخاتمہ نے لکھا ہے کہ میری زندگی کے تجربے کا یہ نچوڑ ہے کہ اگر کوئی شخص متعدی مرض کی چھوت اور زد میں آجائے تو وہ فوراً اس مرض میں ایک ہی علامات کے ساتھ مبتلا ہوجاتا ہے مثلاً اگر پہلا مریض منھ سے خون تھوکتا ہے تو اس دوسرے مریض کو بھی منھ سے خون آنے لگے گا۔ اگر پہلے مریض کی گلٹیاں نمودار ہوتی ہیں تو دوسرے مریض کی گلٹیاں بھی اسی جگہ نکلتی ہیں۔ اگر پہلے مریض کو ناسور ہے تو دوسرے مریض کو بھی ناسور ہوجاتا ہے۔ متعدی بیماریوں

کی ان خصوصیات کو اصولی طور پر سب سے پہلے اس طبیب نے بیان کیا ہے۔ تمام یونانی حکما اور اس سے پہلے عرب کے اطبا نے اس اصول کو نظرانداز کیا ہے۔

ابن الخاتمہ محض ایک نظریاتی مصنف ہی نہیں تھا بلکہ اس نے عملی طور پر جغرافیائی حالات اور مختلف زمان و مکان کے طاعون کا تقابلی مطالعہ کرکے کچھ نئی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور اس کی ذاتی تحقیقات نہایت واضح اور معتبر تھیں۔

مذکورہ رسالہ نہ صرف عربی زبان میں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی سب سے قدیم ہے جس میں اس نے Black Death کا تذکرہ کیا ہے۔ طاعون پر اس کا یہ رسالہ اب تک غیرمطبوعہ ہے البتہ اس کے کچھ حصے ضرور شائع ہوئے ہیں۔ اس کے قلمی نسخے برلن اور اسکوریال میں موجود ہیں۔ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ 1926 میں شائع ہوا اور جرمن ترجمہ کے طبی حصے کا ہسپانوی ترجمہ 1958 میں شائع ہوا۔

اس طرح ابن الخاتمہ نے طب کے اہم شعبہ امراض وافدہ اور وبائیات کے سلسلے میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔ جراثیم کا تصور اور طاعون پر اس کی تحقیقات اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ اس زمانے میں موجودہ دور کی طرح تشخیص وتحقیق کی صورتوں کا فقدان تھا۔ ان حالات میں بھی ابن الخاتمہ نے صرف اپنے ذاتی مشاہدات اور غور وخوض سے نہ صرف ان امراض کا پتہ لگایا بلکہ ان کی تحفظی تدابیر اور علاج ومعالجے پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ابن الخاتمہ کے ان کاموں پر مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے۔

■

Dr. Abdun Nasir Farooqui
Glaxi Aprtment, RZ 2001-B/24,
Tughlaqabad Ext. New Delhi - 110019

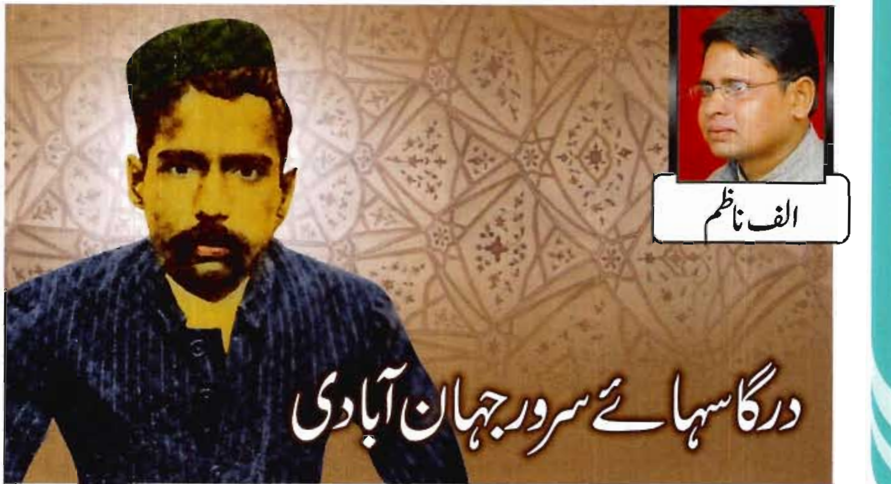

درگا سہائے سرور جہان آبادی

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ایک علمی اور ادبی گھرانے، پیلی بھیت (یو پی) کے ایک چھوٹے سے قصبے جہان آباد میں 1873 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم پیارے لال کافی پڑھے لکھے اور متمول شخص تھے۔ درگا سہائے کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر جہان آباد کے مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ مڈل کے امتحان کو اول درجے سے پاس کیا۔ مولوی کرامت حسین بہار بریلوی اس اسکول کے ہیڈ مدرس تھے۔ درگا سہائے نے انھیں سے اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی نیز اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح بھی لی۔ 1893 میں سرور کی شادی جہان آباد کی ایک تعلیم یافتہ خاتون شنکر دیوی سے ہوئی۔ سرور کو اپنی اہلیہ سے بیحد محبت تھی۔ وہ انھیں دیوی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ سرور نے اپنی مشہور نظم 'زنِ خوشخو' میں اپنی اہلیہ کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا ہے۔

درگا سہائے کے والد حکیم پیارے لال فارسی شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا خاندان کسی زمانے میں زمیندار تھا لیکن اب صورتِ حال پہلی جیسی نہیں رہ گئی تھی۔ درگا سہائے کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا چنانچہ خاندانی پیشے طبابت میں دلچسپی لی اور طبِ یونانی اور آیور وید میں مہارت حاصل کی۔ آیورویدک طب کے لیے سنسکرت زبان بھی سیکھی۔ کچھ عرصے تک مریضوں کو دیکھتے رہے۔ لیکن ہر وقت فکرِ سخن میں محو رہنے کے باعث طبابت کے پیشے سے ان کا جی اکتا گیا۔ دراصل شعر و شاعری ہی ان کا خاص شغل تھا۔

اس زمانے میں بیان و یزدانی میرٹھی (اردو میں تخلص بیان اور فارسی میں یزدانی) کی شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ ان کی نظمیں ملک کے معیاری رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو رہی تھیں۔ درگا سہائے ان کا کلام پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں اپنا استادِ معنوی مان لیا۔ درگا سہائے نے اپنی ابتدائی تصانیف مثلاً خونِ ناحق، نیرنگِ قلق (کتابچے) اور وصال (ناول) وغیرہ میں خود کو فخر کے ساتھ شاگردِ بیان و یزدانی میرٹھی لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ استاد صرف معنوی نہیں بلکہ حقیقی تھے جن سے درگا سہائے نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ ابتداً 'وحشت' تخلص اختیار کیا۔ مذکورہ تصانیف اسی نام سے شائع ہوئیں۔ بعد میں سرور جہان آبادی ہو گئے۔

سرور ایک وضع دار شخص تھے۔ ان کی خوش گفتاری، سیر چشمی اور دریا دلی کے لوگ قائل تھے۔ عاجزی اور انکساری ان کی طبیعت کا حصہ تھیں۔ بادا کرشن گوپال مغموم نے سرور کا سراپا ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

''آپ (سرور جہان آبادی) میانہ قد، پتلے دبلے، چہرہ کشادہ، رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی ابھری ہوئی، ناک بڑی، بھویں اور مونچھیں گھنی، چہرے کے خدوخال صاف اور نمایاں تھے۔ لباس میں کھلے گلے کی اچکن یا شیروانی اور چست پائجامہ پہنتے تھے۔ غذا میں چاول اور گوشت کا شوربہ مرغوب خاطر تھا۔ خوراک بہت کم تھی۔ آپ نیک طینت، حلیم الطبع، متواضع، شرمیلے اور راست باز انسان تھے۔ مزاج میں حد سے زیادہ حلم و انکسار تھا۔ خیالات اور کردار بلند، خوش خلقی، زندہ دلی اور ظرافت طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ گفتگو کا انداز خاص تھا۔ جس میں منکسر المزاجی ایک قسم کی شیرینی پیدا کر دیتی تھی، جس سے ملتے ادب، خلوص اور تپاک سے ملتے تھے۔ جب کسی سے ملاقات کی تقریب ہوتی تو کہتے تھے کہ ''میں سرور جہان آبادی ہوں''۔ 'بندہ نواز' ان کا تکیہ کلام تھا۔ بات بات پر ''معاف فرمایئے'' بھی کہتے تھے''۔ (بادا کرشن گوپال مغموم، سرور جہان آبادی: حیات و شاعری، ص 50)

سرور آریہ سماجی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ 1897 میں جب مشہور آریہ سماجی لیڈر پنڈت لیکھ رام آریہ مسافر کا افسوسناک قتل ہوا تو سرور نے اس سانحے پر قطعاتِ تاریخ شہادت، کچھ غزلیں، دو مسدس، متعدد خمسے اور درجنوں رباعیات لکھیں جو 'انیسِ ہند' (میرٹھ) اور 'کائستھ ہتکاری' (میرٹھ) میں قسط وار شائع ہوئیں۔ بعد میں یہ کلام دو کتابچوں (خونِ ناحق اور نیرنگِ قلق) کی شکل میں مطبع ودیا پرکاشن، میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس سے سرور کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ سرور کی شاعرانہ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انیسِ ہند (میرٹھ) کے مالک رام چندر ویش نے سرور کو 1897ہی میں میرٹھ بلوا کر 'انیسِ ہند' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر و منیجر مقرر کیا۔ میرٹھ میں اس وقت شوکت میرٹھی اور بیان و یزدانی میرٹھی کا طوطی بول رہا تھا۔ ان دونوں اساتذہ کے بیشمار شاگرد تھے۔ میرٹھ میں آئے دن نشستیں اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ سرور جو بیان کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھے، ان مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس دور کی بہت سی نظمیں اور متعدد کتابچے اور ایک ناول (وصال) یادگار ہیں۔ بمشکل ایک برس بیتا ہوگا کہ سرور نے کسی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ دی۔ اس کے بعد سرور ہلدور اور نہٹور کے راجاؤں کے فرزندوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ 1899 میں اہلیہ کی علالت کی خبر سن کر سرور جہان آباد واپس آ گئے۔ کافی علاج معالجہ کرایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر وہ مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس صدمے کی وجہ سے سرور نے شعر گوئی ترک کر دی۔ تقریباً چار برس بعد دوبارہ طبیعت شعر گوئی کی جانب مائل ہوئی اور ایک نظم 'دنیا کی اجڑی ہوئی محفل' لکھی جو 'مخزن' (لاہور) میں شائع ہوئی۔ بیوی کی موت کے صدمے سے سرور پوری طرح ابھر نہ پائے تھے کہ 1906 میں ان کا اکلوتا بیٹا بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ سرور جیسے حساس شاعر کے لیے بیٹے کی موت کسی عظیم سانحے سے کم نہ تھی۔ بیٹے کا 'انتم سنسکار' کر کے جب گھر لوٹے تو سرور کے دکھے ہوئے دل کے جذبات ایک لوری میں ڈھل گئے:

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی، یہ ہوا کے مست جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری، مرے غم گسار سو جا

سرور کو اپنی مختصر سی عمر میں مسلسل آلام و مصائب کا سامنا رہا۔ بیوی اور بیٹے کی موت کے صدمے سے ابھرنے کے لیے سرور نے شراب نوشی کا سہارا لیا۔ کثرتِ شراب نوشی نے تنگدستی میں اور بھی اضافہ کیا۔ یہ کافر منہ سے کچھ ایسی لگی کہ مرتے دم تک نہ چھٹی۔ یہاں تک کہ نزع کے عالم میں ملازم نے جب پانی دیا تو برجستہ یہ شعر پڑھا:

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے
سمجھ لیا مرے ساقی نے بد حواس مجھے

منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر 'زمانہ' کانپور) سرور سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ نگم نے سرور کی مالی مشکلات کے پیشِ نظر انھیں 'زمانہ' کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پیش کش کی۔ 1907 میں سرور دفترِ 'زمانہ' سے وابستہ ہوئے۔ جہاں ان کی ملاقات پیارے لال شاکر میرٹھی سے ہوئی۔ اس وقت پریم چند بھی کانپور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ پریم چند سرور کی ذکاوت و ذہانت سے بے حد متاثر اور ان کی نظم نگاری کے مداح تھے۔ کانپور میں بھی سرور زیادہ عرصے تک نہ رہ سکے اور پھر جہان آباد واپس آ گئے۔ لیکن نگم کی محبت میں ہر سال ہولی میں کانپور ضرور تشریف لے جاتے تھے۔ سرور کا انتقال 3 دسمبر 1910 کو پیلی بھیت میں ہوا۔

سرور کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا۔ تخلیقات کی اشاعت پر معاوضہ بھی اتنا نہ ملتا تھا کہ مالی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ اس پر شراب کا خرچ مستزاد۔ اس لیے نوبت سخن فروشی تک آ پہنچی۔ سرور کی بدولت کئی نا اہل لوگ شاعر بن بیٹھے اور اتنے مقبول ہوئے کہ صفِ اول کے شاعروں میں شمار کیے جانے لگے۔ سرور اگر شراب نہ پیتے تو نظموں کے بیش بہا خزانے کا اضافہ نہ کر پاتے۔ انھیں دن رات شراب چاہیے تھی۔ شراب نہ پینے کی حالت میں انھیں معاشی مسائل گھیرے رہتے تھے۔ چنانچہ انھیں ہر قیمت پر شراب کی ضرورت تھی۔ شراب کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شراب کے لیے پیسے جٹانے کے جب تمام وسائل محدود ہو گئے تو اپنی بیش بہا نظمیں کوڑیوں کے مول فروخت کر کے شراب کا انتظام کرنے لگے۔ سرور کی اس کمزوری کا فائدہ سب سے زیادہ پیارے لال شاکر میرٹھی نے اٹھایا۔ اس کا ثبوت خود شاکر کے ان خطوط میں موجود ہے جو انھوں نے سرور کے نام لکھے۔ اس سلسلے میں ویریندر پرساد سکسینہ لکھتے ہیں:

"شاکر میرٹھی سے دہلی میں میری ملاقات پانچ سات بار ہوئی۔ میں نے ان کے پاس سرور مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ دیکھا تھا جس میں پانچ سو رباعیاں اور ڈیڑھ سو نظمیں تھیں۔ جس میں سے تقریباً دو سو رباعیاں اور پچاس نظمیں شاکر نے اپنے نام سے شائع کرائیں۔" (سرور جہان آبادی اور شاکر میرٹھی، ہماری زبان، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ستمبر، 1966)

اس کے علاوہ سنسکرت کے مہاکوی کالی داس کی 'رتو سنگھار' (چھ موسمی نظموں پر مشتمل) کا اردو منظوم ترجمہ جو سرور جہان آبادی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، بھی شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ سرور کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔

سرور جہان آبادی کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'جامِ سرور' کے نام سے انڈین پریس، الٰہ آباد سے شائع ہوا جسے خود سرور نے مرتب کیا تھا۔ سرور اس کا پروف پڑھنے کے لیے الٰہ آباد جا رہے تھے کہ بمقام پیلی بھیت ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ مجموعہ ان کے انتقال کے بعد 1911 میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ سرور کی نظموں کا دوسرا انتخاب سرور کے دوست منشی دیا نرائن نگم نے 'خمخانۂ سرور' کے نام سے، زمانہ پریس کانپور سے 1911 میں سرور کی یادگار کے طور پر شائع کیا۔ خمخانۂ سرور میں صرف وہی نظمیں شامل ہیں جو 'زمانہ' کانپور میں شائع ہو چکی تھیں۔ سرور کی نظموں کا تیسرا انتخاب قاضی محمد غوث فضا حیدر آبادی نے 'خمکدۂ سرور' کے نام سے، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد سے 1928 میں شائع کرایا۔ یہ مجموعہ کسی قدر ضخیم ہے۔ سرور کی نظموں کے تمام مجموعے اب نایاب ہیں۔ حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی نے کلیاتِ سرور شائع کر کے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ اس کلیات میں جامِ سرور

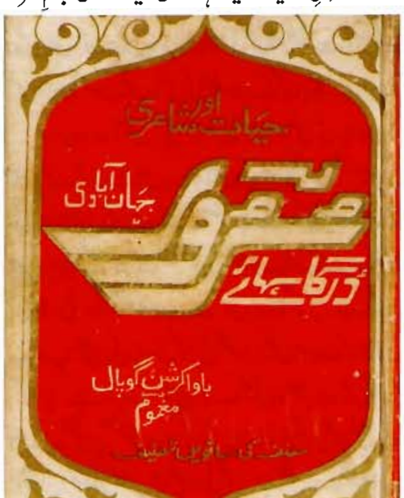

اور خمخانۂ سرور کی نظموں کو ہی شامل کیا گیا ہے۔

اردو شاعری کے جس عہد میں سرور جہان آبادی نے آنکھ کھولی وہ مناظرِ فطرت اور حب الوطنی کے موضوعات سے عبارت ہے۔ جس کی بنیاد مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے ڈالی تھی۔ سرور نے انھیں کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو کر مناظرِ فطرت اور حب الوطنی وغیرہ موضوعات پر طبع آزمائی کر کے جدید نظم نگاری کی روایت کو استحکام بخشا۔ نظم کے علاوہ دیگر اصناف مثلاً غزل، مرثیہ، قطعہ، رباعی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی شاعرانہ ہنرمندی کے جوہر دکھلائے لیکن جس صنفِ سخن نے انھیں نابغۂ روزگار بنایا، وہ ان کی نظم نگاری ہے۔

حب الوطنی سرور کی نظموں کا اہم موضوع ہے۔ سرور کی سب سے زیادہ نظمیں اسی جذبے میں ڈوب کر لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے فراق گورکھپوری نے سرور کو اردو کا سب سے بڑا قومی شاعر قرار دیا۔ سرور کی مشہور نظمیں مثلاً بدنصیب بنگال، عروسِ حبِ وطن، خاکِ وطن، پھولوں کا کنج، مادرِ ہند، یادِ وطن، سالِ نو اور ہندستان، حسرتِ وطن وغیرہ میں حبِ وطن کے سچے جذبات کی تصویریں موجود ہیں۔ سرور کا تصورِ وطن ماضی کی روایت سے وابستہ ہے۔ ہندستان کی سنسکرتی میں دھرتی ایک مقدس ماں کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماں کا یہی تصور سرور کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ سرور کا تصورِ وطن محبوب کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نظم 'مادرِ ہند' میں سرور وطن کو ہندستان کے قدیم تصور کے مطابق لکشمی، سرسوتی اور درگا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں:

لکشمی تو ہے زمانے میں اجالا ہے ترا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالہ ہے ترا
سرسوتی کا روپ ہے درگا کا ہے اوتار تو
نطق و دانش کی ہے دیوی ، مادرِ غمخوار تو
اف! یہ سندر چھب تری یہ سانولی صورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تری

عروسِ حبِ وطن میں سرور کا احساسِ جمال اس تصور کو محبوبیت کی شان عطا کر دیتا ہے:

آ اے نگار تجھ کو گلے سے لگاؤں میں
آ مجھ سے ہمکنار ہو اے شوخ خوش گلو
تیری شرابِ عشق کا آنکھوں میں ہو سرور
خلوت میں ہو نہ ذکرِ مے و شیشہ و سبو
لپٹوں میں بے خودی میں جو تجھ سے شبِ وصال
بانہیں ترے گلے میں ہوں، لب پر یہ گفتگو
ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو نہ تیری تلاش ہو
پھوٹے وہ آنکھ جس کو نہ ہو تیری جستجو

سرور کے عہد میں وطن کا تصور مکمل طور پر واضح نہیں ہو پایا تھا۔ لیکن سرور نے سب سے پہلے وطن کا مکمل اور بھرپور تصور اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔ اس لیے قومی شاعری کے ابتدائی نمونے بھرپور انداز میں سرور کی نظموں میں نظر آتے ہیں۔

سرور کی نظمیہ شاعری کا دوسرا اہم پہلو مناظرِ فطرت کی عکاسی ہے۔ حالی اور آزاد نے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی اور شعرا کی توجہ نیچر کی جانب مبذول کرائی۔ جسے سرور جہان آبادی نے سب سے پہلے عملی جامہ پہنایا۔ انگریزی شاعری کا اہم وصف فطرت نگاری ہے۔ سرور اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی سے فطرت نگاری کی جانب مائل ہو گئے تھے۔ ابتدائی دور میں ہی سرور نے 'نیچرل شاعری' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو 'ادیب' (فیروز آباد 1897) میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں سرور نے انگریزی شاعری کی اہمیت اور خصوصیت کا ذکر کیا

ہے۔ حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی تحریک کے باوجود اس کا رواج ہندستان میں عام نہ تھا۔ اکا دکا شاعر ہی نیچرل نظمیں لکھ رہے تھے اور وہ بھی نیچرل شاعری کے میدان میں کوئی خاص مقام پیدا نہ کر سکے۔ سرور کی نظم نگاری کا آغاز ہی نیچرل شاعری کی تحریک کے زیرِ اثر ہوا تھا۔ سرور چونکہ ہر شے میں حسن کی جلوہ گری محسوس کرتے تھے، اس لیے مناظرِ فطرت کی عکاسی میں وہ ایک کمسن حسین وجمیل نازنیں کے حسن و جمال کا سراپا کھینچتے ہیں، جس میں ان کی پیکر تراشی کا کمال انتہا پر نظر آتا ہے۔ سرور نے حب الوطنی اور مناظرِ فطرت کی عکاسی میں دراصل غیر مادی اشیا کی تجسیم کرکے اسے ایک خوب صورت نازنیں کے خد وخال عطا کر دیے ہیں۔ تجسیم کا ایسا عمل سرور کے علاوہ صرف اقبال کے یہاں نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں 'نسیم سحر' کا یہ بند:

گھونگٹ الٹ الٹ کے رخِ نازنیں سے تو
کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمیں سے تو
چلتی ہے بس کے عطر میں خلدِ بریں سے تو
یوں دھیمی دھیمی آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی پاؤں میں

ایسا لگتا ہے کہ سرور کو حسن کے بیان میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ فطرت کے حسن سے اس قدر متاثر ہیں کہ اس کے آغوش میں سما جانا چاہتے ہیں۔ آبشار، کہسار، دریا، باغوں میں چڑیوں کا پھدکنا، رعد کا کڑکنا، بجلی کا چمکنا، نسیمِ سحر کا دبے پاؤں آنا سرور کے لیے آرامِ جاں اور باعث راحتِ قلب وجگر ہے۔ سرور کی فطرت پسند طبیعت نے فطرت کے گونا گوں پہلوؤں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ہم ان کی نظموں میں فطرت کو سانس لیتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں۔ نسیمِ سحر کے علاوہ بیر بہوٹی، عروسِ برشگال، فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال، مرغابی، تیتری، لالۂ صحرا، شیونِ عروس وغیرہ نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن میں حسنِ فطرت کی متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔

سرور کے کلام کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں پر مشتمل ہے۔ سرور نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ انگریزی نظموں کو اردو کے قالب میں بڑی روانی کے ساتھ ڈھال سکتے تھے۔ سرور نے صرف لفظی ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اصل نظم سے تصرف بھی کیا ہے اور بعض نظموں میں ہندستانی مذاق کو بھی برقرار رکھا ہے۔ سرور نے یہ ترجمے اس وقت کیے جب اردو میں ترجمہ نگاری کا رواج زیادہ عام نہیں تھا۔ اظہارِ بیان کی سادگی اور بے تکلفی ان ترجموں کا امتیازی وصف ہے۔ اندھی پھول والی کا گیت، کوئل، مرغابی، ترانۂ خواب، سالِ گذشتہ، آنے والی گھڑی، موسمِ سرما کا آخری گلاب وغیرہ (نظمیں) بہترین اور کامیاب ترجمے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ جو بلا شبہ اردو میں منظوم ترجمہ نگاری کے باب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

سرور کی مذہبی نظمیں بھی بے حد مقبول ہوئیں۔ سرور مرلی والے کی دھن کے والہ وشیدا ہیں تو محبوبِ خدا کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت بھی بڑے والہانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ رام، سیتا، مہاراجہ دسرتھ اور رادھا کی کہانی کے دلچسپ پہلوؤں کی تصویر کشی کرتے ہیں تو مغل شہنشاہ شاہ جہاں، ممتاز محل اور نور جہاں کی داستانِ حیات کی کشش بھی انھیں متوجہ کرتی ہے۔ زمزمۂ توحید، پدمنی، مہاراجہ دسرتھ کی بے قراری، سیتا جی کی گریہ وزاری، فراقِ نل میں دمن کی بے قراری، گنگا جی، جمنا جی، لکشمی جی، روٹھی رانی، نور جہاں کا مزار، چتوڑ کی گذشتہ عظمت، دمن اور ہنس وغیرہ نظموں میں ماضی کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔

سرور دراصل اپنی شاعری میں ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ماضی کی تاریخ ساز شخصیتوں کی داستانوں کو زندہ کرکے عظمتِ رفتہ کے گیت گاتے ہیں۔ ان کے نزدیک مستقبل کو سنوارنے کے لیے ماضی کی تاریخ ساز شخصیتوں سے سبق لینا ناگزیر ہے۔ سرور نے اپنے بچپن کی یادوں کو اپنی نظموں میں سمیٹ کر لافانی کر دیا ہے۔ سرور کا بچپن بڑے عیش وعشرت میں گزرا تھا۔ عہدِ طفلی پر مشتمل سرور کی ایک افسانوی تحریر بھی ملتی ہے جو مخزن (لاہور) میں شائع ہوئی تھی۔ عہدِ طفلی اور عالمِ شباب پر سرور نے متعدد نظمیں لکھ کر قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ نظمیں پُر درد و پُر تاثیر ہیں۔ بقول پریم چند، سرور کو اگر اپنی شاعری کے انتہائے عروج پر دیکھنا ہو تو وہ نظمیں دیکھیے جن میں انھوں نے حسرت و درد کا راگ گایا ہے جس میں عالمِ طفلی اور عہدِ شباب کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ سرور کو بچوں کی نفسیات پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ دیوارِ کہن، یادِ طفلی، امید اور طفلی، بچپن، بچہ اور ہلال وغیرہ نظموں میں سرور نے بچوں کے معصومانہ جذبات کی عکاسی کی ہے۔ نظم 'امید اور طفلی' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

تو کھلونا تھی میرے بچپن کا
تجھ سے تھا ساتھ چولی دامن کا
تونے کیوں میرا ساتھ چھوڑ دیا
ہاتھ میں لے کے ہاتھ چھوڑ دیا
رات کو لوریاں سناتی تھی
دن کو جھولا مجھے جھلاتی تھی

سرور جہان آبادی کی مطبوعہ تصانیف

خونِ ناحق، مثنوی سوزِ جگر، نالۂ خوں چکاں و مثنوی سوزِ فغاں، نیرنگ قلق، دشنۂ قلق، نشترِ ماتم، شیون، ہنگامۂ محشر، وصال (مذکورہ کتابچے نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات پر مشتمل ہیں۔ یہ سبھی کتابچے اب نایاب ہیں)

جام سرور، خمخانۂ سرور، خمکدۂ سرور، پیمانۂ سرور، انتخاب کلام سرور جہان آبادی، نوائے سرور

وہ گلے سے مجھے لگا لینا
نیچی نظروں سے دل لبھا لینا
کبھی حاجت جتا کے کرنا پیار
کبھی کہنا میں تیرے رخ پہ نثار
لے کے ظالم دل و جگر تونے
پھیر لی مجھ سے کیا نظر تونے

سرور کے عہد میں شخصی مرثیوں کا رواج بھی عام ہو چکا تھا۔ سرور نے اپنے عہد کی ممتاز ادبی و سیاسی شخصیتوں کے درد انگیز مرثیے لکھے ہیں۔ یہ تمام مرثیے مسدس ہی کی ہیئت میں ہیں۔ یہی ہیئت مرثیے کے لیے زیادہ مقبول رہی ہے۔ داغ کے پھول، شیونِ داغ، نوحہ وفات محسن الملک، نوحہ وفات سوامی رام تیرتھ، نوحہ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد، قومی نوحہ وغیرہ سرور کے بہترین مرثیے ہیں۔ سرور نے ان شخصیات کے ایک ایک پہلو کو مختلف اور منفرد انداز میں نظم کیا ہے۔ 'داغ کے پھول' (مرثیۂ داغ دہلوی) کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

اے نظم تیرا عشوۂ دلجو کدھر گیا
سر چڑھ کے بولتا تھا وہ جادو کدھر گیا
شانہ وہ کیا ہوا، خمِ گیسو کدھر گیا
چوٹی کا پھول داغِ سمن بو کدھر گیا
کلیاں کدھر گئیں ترے دامانِ ناز کی
بو بھینی بھینی کیا ہوئی زلفِ دراز کی

سرور کی وطن پرستی، مناظر فطرت کی عکاسی، تہذیبی اور ثقافتی رنگ کی آمیزش نے ان کی شاعری کو اس عہد کا مرقع بنا دیا ہے۔ نظم کے علاوہ سرور نے غزلیں بھی لکھی ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ سیکڑوں رباعیات ان کی جولانیِ طبع اور فکرِ رسا کی آئینہ دار ہیں۔ جیسا کہ مذکور ہوا، سرور کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا اور بہت سا دوسروں کی نذر ہو گیا۔ اس کے باوجود جو کلام دستیاب ہے وہ اگرچہ سرور کو اردو ادب میں اعلیٰ مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی اگر ان کا سارا کلام موجود ہوتا تو وہ یقیناً ان کے شاعرانہ وقار میں اضافے کا باعث ہوتا۔

■

انتخاب کلام سرور جہان آبادی

نظمیں

بھونرے کی بے قراری

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی   نہ وہ موتیا کی ادا رہی
نہ وہ نسترن نہ سمن رہی   نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے   نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ کوئی رہے   نہ وہ قمریوں کی صدا رہی
نہ وہ سرو ہے نہ وہ آب جو   نہ وہ ہمصفیر ہیں خوش گلو
نہ بنفشہ ہے نہ وہ ناز بو   نہ وہ جعفری نہ جفا رہی
نہ وہ صبح کی ہیں تجلیاں   نہ شفق کی آہ! وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں   نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی
نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی   نہ وہ پتیاں ہیں گلاب کی
نہ ہوا میں بو ہے شراب کی   مجھے مست تھی جو بنا رہی
وہ کنول غضب کے تھے دل ربا   جہاں اڑتے تھے مرے ہمنوا
مگر اب نہ ان کی ہے وہ ادا   نہ وہ بو رہی نہ صفا رہی
لب آبجو تھی فضا غضب   وہ بہار کی تھی ہوا عجب
مرے کنج میں مجھے روزو شب   مئے بے خودی تھی پلا رہی
وہ غضب کی کو کو وہ زمزمہ   وہ سریلی درد بھری صدا
سرِ شام سرو پہ فاختہ   مجھے لوریاں تھی سنا رہی
ہیں کنول کی خشک جو پتیاں   مری خواب گہہ تھی کبھی یہاں
یہیں شب کو دے دے کے تھپکیاں   تھی نسیم مجھ کو سلا رہی
نہ گلوں میں بوئے وفا رہی   نہ وہ دل ربا ہی ادا رہی
نہ چمن رہا نہ فضا رہی   نہ وہ دن رہے نہ ہوا رہی
نہ روش ہے اب وہ سپہر کی   نہ گلوں میں بو ہے وہ مہر کی
کہ ہوا ہے گلشن دہر کی   مجھے سبز باغ دکھا رہی

دلِ بے قرار سوجا!

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سوجا   کہ گزر گئی شب آدھی، دل بے قرار سوجا
یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے   تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سوجا
یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کردے   مرے پردہ دار سوجا، مرے راز دار سوجا
مجھے خوں رلارہا ہے ترا دم بدم تڑپنا   ترے غم میں آہ! کب سے ہوں میں اشکبار سوجا
ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل   یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سوجا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں   تجھے سینے سے لگالوں، تجھے کرلوں پیار سوجا
تجھے جن کا ہے تصور ارے مست جام الفت   انہیں انکھڑیوں کے صدقے، مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے، شب غم بری بلا ہے
کہیں مرمٹے نہ ظالم دل بے قرار سوجا

غزلیں

★

شبِ وصال مزا دے رہی ہے 'تو' تیری
لبوں سے گھولتی ہے قند، گفتگو تیری

مسل، سمجھ کے دلِ درد مند کو میرے
کہ اس میں رہتی ہے بے درد آرزو تیری

تری زباں کو بگاڑا رقیبِ بد خو نے
کہ بات بات میں گالی تو تھی نہ خو تیری

لگارہا ہے حنا کون تیرے ہاتھوں میں
رُلا رہی ہے مجھے خون، آرزو تیری

ترے سکوت میں بھی اک ادا نکلتی ہے
کہ ہے چھپی ہوئی پردے میں گفتگو تیری

نہ چاک کر دلِ بے تاب کو مرے ظالم!
نکل کے ہو کہیں رُسوا نہ آرزو تیری

کبھی ہے قصد حرم کا، کبھی ہے عزمِ کنشت
کشاں کشاں لیے پھرتی ہے آرزو تیری

★

بخدا عشق کا آزار بُرا ہوتا ہے
روگ چاہت کا برا، پیار بُرا ہوتا ہے

جاں پہ آ بنتی ہے جب کوئی حسیں بنتا ہے
ہائے! معشوقِ طرحدار بُرا ہوتا ہے

یہ وہ کانٹا ہے نکلتا نہیں چبھ کر دل سے
خلشِ عشق کا آزار بُرا ہوتا ہے

ٹوٹ پڑتا ہے فلک سر پہ شبِ فرقت میں
شکوۂ چرخِ ستمگار بُرا ہوتا ہے

آ ہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت ناصح !
سچ تو یہ ہے کہ دلِ زار بُرا ہوتا ہے

موسم گرما کا آخری گلاب

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول
بیکس، غریب، فرقت احباب میں ملول
ہے کوئی غمگسار، نہ ہمدم کوئی قریں
رخصت ہوئے چمن سے رفیقان ہم نشیں
ننھی سی کوئی آہ! کلی بھی نہیں قریب
کچھ درد دل کا حال کہے جس سے غم نصیب
کملانے دوں گا تجھ کو میں تنہا نہ شاخ پر
احباب سو رہے ہیں، جہاں تیرے بے خبر
کب تک زباں پہ فرقت احباب کا گلہ
ہیں محوِ خواب مرگ جہاں تیرے آشنا
رخت سفر اٹھاؤں گا میں بھی جہاں سے جلد
چھوٹوں گا مر کے ہجر کے دردِ نہاں سے جلد
کیا لے کے کوئی آہ! کرے عمر جاوداں
یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں
جب اٹھ گئے جہان سے یاران زندہ دل
کڑیاں تری اٹھانے کو اے دردِ جاں گُسل

اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
دھندلا سا اک چراغ سحر انجمن میں ہے
بچپن کے آشنا ہیں نہ وہ خانداں کے پھول
بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول
ڈالے جو عکس پھول سے رخ کا غریب پر
جو اُس کی آہ سرد کو سن کر ہو نوحہ گر
ڈر ہے، نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو
جا تو بھی ان کے ساتھ ہم آغوش خواب ہو
اب تیری پتیاں میں بچھاتا ہوں خاک پر
تجھ کو بھی ان کے ساتھ سلاتا ہوں خاک پر
احباب مجھ سے جب مرے ہوجائیں گے جدا
تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا
سلک وفا میں جب نہ رہے دُرِّ آبدار
میری بھی بیکسی کا بنے گا وہیں مزار
جی کر غم فراق کے صدمے سہے گا کون
اس غمکدے میں آہ! اکیلا رہے گا کون

کوئل

او چمن کی اجنبی چڑیا! کہاں تھی آہ! تو
تیرے دلکش زمزے تھے سبزہ زاروں میں خموش
کھینچتی وقت سحر دل کو تری کو کو نہ تھی
موسم سرما میں اے سرمایۂ صبر و شکیب
مرحبا! اے پیکر پیک سبک گام بہار
تو ادھر آئی، فضائے گل کا دور آیا اُدھر
طائران باغ نے چھیڑا ہے ساز انبساط
پہنی ننھی ننھی کلیوں نے قبائے شبنمیں
کوئی انجم آسماں کا او سبک پرواز شوق
تو جو آنے والے موسم کا نشاں پاتی ہوئی
تیرے مقدم میں شکیب خاطر ناشاد! میں
تو چمن میں اڑ کے کیا آئی کہ آ پہنچی بہار
دامن رنگیں میں اک دوشیزۂ ناکتخدا
اور تجھ سے ہم سرودِ نغمۂ اعجاز ہے
میٹھے نغمے گانے والی او چمن کی نازنیں
اور مصفا ہے فضائے آسماں تیرے لیے
تیرے نغموں میں اثر اندوہ حرماں کا نہیں
مجھ کو قسام ازل دیتا اگر دو بال و پر

کیا کسی صحرا کے دامن میں نہاں تھی آہ! تو
آشیانہ تھا ترا گلشن میں بزم بے خروش
چھاؤں میں تاروں کی محو نغمۂ دلجو نہ تھی
بے صدا تیرا پس پردہ تھا ساز دلفریب
لے کے پھر تو گرمیوں میں آئی پیغام بہار
تونے گائے گیت اور آموں کا بَور آیا اُدھر
تیرے مقدم میں ہیں شاخوں پر ہم آہنگ نشاط
آرہی ہے کان میں تیری صدائے دلنشیں
رہنما ہے کیا ترا دلدادۂ انداز شوق
اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے یوں گاتی ہوئی
موسم گل کو بھی دیتا ہوں مبارکباد میں
گارہی ہیں چھوٹی چڑیاں سبز کنجوں میں ملار
چن رہی ہے ننھی ننھی سرخ کلیاں خوشنما
بزم قدرت میں تری گویا شریک راز ہے
ہے تروتازہ ہمیشہ تیرا کنج دل نشیں
ہے شفق جام شراب ارغواں تیرے لیے
سال میں تیرے گزر فصل زمستاں کا نہیں
اڑ کے ہوتا میں بھی تیرے ساتھ سرگرم سفر

بن کے ہم دونوں رفیق موسم جوش بہار
کرتے خوش خوش ہر برس گلگشت دشت و کوہسار

★

فقیروں پہ اپنے کرم اک ذرا کر
ترے در پہ بیٹھے ہیں دھونی رَما کر

گُسائیں ہیں ہم برج کے رہنے والے
ذرا اے شہِ حسن! ادھر دیکھ آکر

بہت دیر سے در پہ سادھو کھڑے ہیں
فقیروں پہ داتا! دیا کر، دیا کر!

پھرے تیری نگری میں ہم تیرے کارن
جگایا الکھ ہم نے دھونی رَما کر

نہیں ہم کو خواہش کسی اور شے کی
ہمیں اپنے جوبن کا صدقہ عطا کر

سرور ان کی نگری میں برسوں پھرے ہم
فقیرانہ بھیس اپنا اکثر بنا کر

رباعیات

کافور ہے دل جلوں کو تنویرِ سحر
ٹھنڈک ہے کلیجوں کی طبا شیرِ سحر
جی اٹھیں دلوں میں آرزوئیں مرکر
کیا روح فزا ہے واہ ! تاثیرِ سحر

اس باغ میں کس کو پھول چنتے دیکھا
سر خاک پہ باغباں کو دھنتے دیکھا
بلبل نے تڑپ کے جان دی اے صیاد !
نالہ نہ یہاں کسی کا سنتے دیکھا

آغاز ہے کچھ ترا نہ انجام ترا
بندوں پہ ہمیشہ لطف ہے عام ترا
مندر میں ہے 'ہر' خدا ہے تو مسجد میں
جپتے ہیں شیخ و برہمن نام ترا

اس بحر میں سیکڑوں ہی لنگر ٹوٹے
بن بن کے حباب کاسۂ سر ٹوٹے
گردابِ فنا سے کوئی بچ کر نکلا؟
شل ہو کے یہاں دست شناور ٹوٹے

محمد صہیب

تاریخ ابن خلدون کی اہمیت

تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے ابن خلدون (1332-1406) پر یہ انکشاف ہوا کہ نامور مورخین اسلام نے رطب و یابس کی پرواہ کیے بغیر واقعات کو نقل کرنے پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ان واقعات کے پس منظر میں کس طرح کے اسباب وعوامل رہے ہیں ان پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی گئی۔ تحقیق کا معیار بھی بہت پست ہے نتیجہ یہ ہوا کہ خرافات اور خودساختہ افسانے بھی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ البتہ ابن اسحٰق، طبری، ابن کلبی، واقدی اور سیف بن عمر اسدی کو ابن خلدون نے جمہور مورخین سے ممتاز قرار دیا لیکن ان کی تصنیفات بھی پوری طرح مکمل نہ ٹھہریں۔

ابن خلدون نے جب یہ صورت حال دیکھی تو فیصلہ کیا کہ تاریخ پر وہ ایک کتاب لکھیں گے جس میں اس طرح کے سقم اور نقائص نہ ہوں جو گزشتہ تاریخی کتب میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے 'کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرهم من ذوی السلطان الاکبر' تصنیف کی، جس کی شہرت عام 'تاریخ ابن خلدون' سے ہے۔ مصنف کی وسعت فکر اور دقت نظر کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہ کتاب محض تاریخ کی کتاب نہ رہ کر مختلف علوم کو بھی محیط قرار پائی۔

تاریخ ابن خلدون تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصۂ اوّل میں مقدمہ ہے جس میں مختلف علوم وفنون پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں آغاز آفرینش سے آٹھویں صدی ہجری تک عرب اقوام اور ان کی معاصر قوموں اور حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرا حصہ بربر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

ابن خلدون دنیا کے تمام مورخین سے اس حیثیت سے ممتاز و منفرد ہیں کہ ان کی کتاب نے واقعات عالم سے ہی باخبر نہیں کیا بلکہ اس سے مختلف سماجی علوم وفنون وجود میں آئے، فکر و تخیل کے نئے دریچے وا ہوئے، تحقیق و جستجو کو نئی سمت و رفتار ملی اور تاریخ سائنسی اور فلسفیانہ اصولوں سے روشناس ہوئی۔

ابن خلدون پہلے مورخ ہیں جنھوں نے تاریخ کے تسلسل اور عدم تسلسل کو وسیع و عمیق نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے نظامہائے معاشرت کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلی بار یہ سمجھایا کہ تاریخ صرف سیاسی عروج و زوال کی داستان، یا سنین یا افراد کے اقتدار، اصطلاحی الفاظ میں پولٹیکل سائنس ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تاریخ کو تاریخ بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ذریعے آبادی، اجتماعیت اور معاشرتی و معاشی نظام کو بھی سمجھا جائے۔

ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کے موجد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی جڑیں حکمت وفلسفہ میں پیوست ہیں اس لیے اس کا شمار علوم حکمت میں ہونا چاہیے۔ رابرٹ فلنٹ کے مطابق ''ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا موجد ہی نہیں بلکہ تاریخ کو سائنس کا درجہ دینے والا بانی بھی ہے۔''

ابن خلدون کے مطابق تاریخ کی غرض و غایت حیات اجتماعیت کا مطالعہ ہے۔ وہ پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے اجتماع کو ایک مستقل علم کا موضوع بنایا۔ دور حاضر میں اس علم کو عمرانیات (Sociology) کہا جاتا ہے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ انسانی بقا کے لیے اجتماع ضروری ہے ورنہ انسانی وجود اور دنیا میں آبادی پھیلانے اور انسانوں کو جانشین بنانے کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ حکما کی اصطلاح میں اجتماع کو 'مدینہ' کہتے ہیں۔ ان کے مطابق انسانوں میں طبعی طور پر مدنیت کی طرف میلان ہوتا ہے۔

ابن خلدون نے فلسفۂ اجتماع پر بحث کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی کی کہ حیوانوں میں بھی اجتماع پایا جاتا ہے لیکن انسانوں اور حیوانوں کے درمیان اجتماع کی نوعیت اور اس کی اساس میں فرق ہے۔ انسانوں میں اجتماع عقل، غور وفکر اور فطرت کی بنیاد پر ہوگا اور حیوانوں میں اجتماع عادت اور فطرت کے نتیجے میں پایا جائے گا۔

ابن خلدون کو اپنے تصور اجتماع کی وجہ سے ارسطو اور افلاطون پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ طٰہٰ حسین جنھوں نے ابن خلدون پر جرح کی ہے، انھیں بھی اس کا اعتراف ہے کہ:

''ابن خلدون صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کی تشریح اس کے وسیع ترین معنوں میں کرے اور اس معاملے میں اس کا اجتماعی خیال ارسطو اور افلاطون بلکہ زمانۂ قدیم کے مورخین سے بہت زیادہ اعلیٰ ہے۔''

ابن خلدون کے یہاں حیات اجتماعی تین ادوار سے گزرتی ہے (1) بدوی دور: ہر قوم ابتدا میں صحرا، وادیوں اور دیہاتوں میں زندگی بسر کرتی ہے (2) غزوی دور: اس دور میں صحرا میں رہنے والے کچھ ترقی کرتے ہیں اور تمدن میں اپنے سے پست اقوام سے نبردآزما ہوتے ہیں (3) حضری دور: اس دور میں یہ لوگ ترقی کرتے ہیں، ان میں تہذیب و تمدن آ جاتا ہے، شہر آباد ہوتے ہیں، قوانین بنائے جاتے ہیں اور علوم وفنون کی ترقی ہوتی ہے۔

تمدن کے سلسلے میں ابن خلدون کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک اضافی چیز ہے۔ حکومتوں کے عروج و زوال پر تمدن وثقافت کی ترقی وتنزلی کا انحصار ہے۔ آبادی کی کمی و بیشی اور خوش حالی و بدحالی پر تمدن موقوف ہوتا ہے۔ ابن

خلدون تمدن پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکومت، تمدن کی ریڑھ کی ہڈی ہے، ممالک اور آبادی کی حیثیت اس پر گوشت کی سی ہے اور محاصل کی رقم اس کی رگوں کا خون ہے۔ حکومت عوام پر دولت خرچ کرتی ہے اور وہ دولت محاصل کے ذریعے پھر حکومت کی طرف لوٹ آتی ہے اور ملک کی دولت ہمیشہ خون کے مانند گردش میں رہتی ہے۔

'اقتصادی ترقی اور ارتقا' دورِ حاضر کی اصطلاح سمجھی جاتی ہے، حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے چھ سو برس پہلے ابن خلدون اس پر دعوت فکر دے چکے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ معاشی نظام میں کس حد تک جغرافیائی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ وہ علت و معلول یا سبب و مسبب کی روشنی میں حالات کے تجزیاتی مطالعے کے قائل ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ انسانی اخلاق پر گرانی اور ارزانی کے کتنے اثرات ہوتے ہیں اور یہ کہ جو ہمارا طبعی جسمانی نظام ہے وہ کس حد تک مالیات کا رہین منت ہے۔

تاریخی واقعات و اخبار کو بیان کرنے میں کذب و افترا کا بھی احتمال رہتا ہے اور سچ کے ساتھ جھوٹ کی اس طرح آمیزش ہو جاتی ہے کہ ان کے درمیان خط فاصل کھینچنا محال ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون نے تاریخی واقعات کی تحقیق و تنقیح کے کچھ اصول اور ضابطے مقرر کیے ہیں جن کو معیار بنا کر واقعات کی تحقیق کی جاسکتی ہے اور صداقت پر مبنی معتبر تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ جارج سارٹن (George Sarton) لکھتے ہیں کہ ''ابن خلدون عمرانیات ہی کا بانی اور آدم اول نہیں بلکہ تاریخ کے اسلوب تحقیق کا بھی بانی ہے۔''

ابن خلدون نے یہ جاننے کی بھی کوشش کی کہ تاریخی واقعات کے بیان میں غلطیاں کیوں واقع ہوتی ہیں۔ انھوں نے چھ اسباب بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے تاریخی واقعات میں کذب کا احتمال رہتا ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں:

1. اختلاف آرا و مذاہب: یعنی جب ذہن مشروط نہیں ہوتا ہے تو جو بات سنتا ہے اس پر غور کرتا ہے اور اس کی تحقیق کرتا ہے اور جب ذہن کسی رائے یا مذہب کا تابع ہوتا ہے تو فوراً اس خبر کو مان لیتا ہے جو اس کی رائے یا مذہب کے موافق ہو خواہ وہ خبر جھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔
2. خبر نقل کرنے والے پر بھروسا کر لینا۔
3. مقاصد سے غفلت: راوی مشاہدہ کی ہوئی یا سنی ہوئی خبروں کے اغراض و مقاصد سے ناآشنا رہتا ہے اور اپنے گمان کے مطابق روایت کر دیتا ہے اس لیے غلطی کا امکان رہتا ہے۔
4. وہم صداقت: یہ سبب کثیر الوقوع ہے۔ اس میں راویوں پر اعتبار کر لیا جاتا ہے اور انھیں ثقہ مانتے ہوئے جھوٹ کا وہم بھی نہیں ہوتا۔
5. اشراف اور صاحبان اقتدار کو خوش کرنا اور ان کا قرب حاصل کرنا۔ خوشامدی لوگ بڑوں کی ہر بات کو خوشنما رنگ میں پھیلاتے ہیں اس طرح سے جھوٹی خبر پھیل جاتی ہے۔

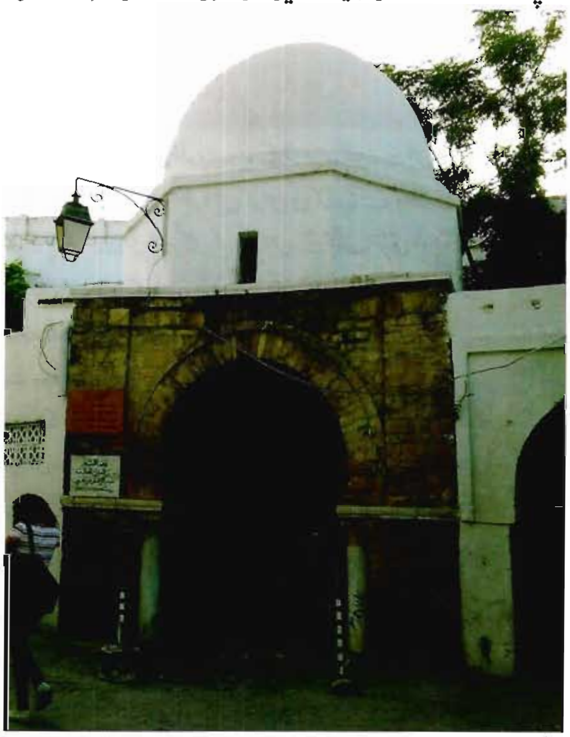

ابن خلدون کی درسگاہ

6. مذکورہ بالا اسباب میں ایک اہم سبب طبعی احوال سے ناواقفیت بھی ہے۔ طبعی احوال بدلتے رہتے ہیں اگر خبر سننے والا حادثات و حالات کی مخصوص طبیعتوں اور مخصوص تقاضوں سے واقف ہے تو اس سے اس کو خبر کی تحقیق میں بہت مدد ملتی ہے۔

یہ امر تو بالکل ثابت ہے کہ فلسفۂ تاریخ ابن خلدون کی نہ صرف ایجاد بلکہ اس میں دور تک غور و فکر اور تصنیف کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ عمرانیات کے باب میں البتہ کچھ مسلمان حکما جیسے بوعلی سینا، ابن رشد، امام غزالی، ابن ابی ربیع، یعقوب الکندی اور فارابی کی تصنیفات میں بعض ایسے اشارے بکھرے ہوئے ملتے ہیں جنھیں مجتمع کر کے ایک حد تک عمرانیات کے بعض بنیادی مسائل حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان حکما کی تصنیفات سے ابن خلدون بے خبر رہے ہوں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ انھوں نے اصول و ضوابط اور تشریحات پر مبنی اپنی اس تصنیف میں عمرانیات کو باقاعدہ علم کا درجہ عطا کیا۔ ابن خلدون کے کارنامے کی اہمیت کا پورا احساس عام نہ ہونے اور بڑی حد تک مغربی تعصب کی بنا پر بھی مغربی حلقوں میں فرانس کے مفکر اگست کونت (August Comte) کو عمرانیات کا موجد قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن اب تقریباً ایک صدی سے اور بالخصوص جارج سارٹن کی عظیم الشان تصنیف جو تاریخ علوم عرب پر مشتمل ہے، کے منظر عام پر آجانے کے بعد اس قضیے میں اب کوئی شک باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر بشارت علی جنھوں نے ابن خلدون پر تحقیق کی ہے اور ماہرین عمرانیات میں ہیں، اگست کونت کے بانی عمرانیات ہونے کے موقف پر رد و قدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگست کونت (1798-1857) ابن خلدون سے چار سو سال بعد پیدا ہوا ہے اور اس کے افکار میں کہیں بھی ایسے قضیے اور مسائل نہیں ہیں جن سے براہِ راست علم عمرانیات یا عمرانی افکار کا تعلق ثابت کیا جاسکے۔

بہر حال ابن خلدون نے عرب و عجم اور مغرب و مشرق کو یکساں طور پر متاثر کیا، تاریخ ابن خلدون کی طرف دنیا کی توجہ اس لیے زیادہ ہوئی کہ اس کے مقدمے میں مختلف علوم و معارف کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مقدمے میں ابن خلدون نے تاریخ، معاشرت، سیاست، تمدن و ثقافت اور مذہب پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے اصول و مبادیات پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ ابن خلدون کی خدمات کا اعتراف مغربی اصحاب فکر و تحقیق نے مجبوراً کیا لیکن جب کیا تو کھلے دل سے کیا۔ فلپ کے حتی (Philip K Hitti) ابن خلدون کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن خلدون نے پہلی بار تاریخ کے ارتقا کا نظریہ دنیا کے آگے پیش کیا ہے... قومی عروج و زوال کے قوانین کی دریافت اور ان کی تدوین کی سب سے پہلی کوشش ابن خلدون ہی نے کی ہے... یہ واقعہ ہے کہ ابن خلدون سے پہلے تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ایسی وسیع اور فلسفیانہ نظر یورپ والوں کا ذکر ہی کیا کسی عرب مصنف

نے بھی نہیں ڈالی تھی۔''

تاریخ وفلسفہ کے محققین نے تاریخ ابن خلدون کے مقدمے سے خوب استفادہ کیا۔ مفکرین یورپ نے اس کے علمی مباحث سے خوشہ چینی کی، مستشرقین بھی ابن خلدون کی اصابت رائے اور فکر رسا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ ابن خلدون کے فکری خطوط ونقوش پر چلتے ہوئے انھوں نے علوم وفنون کی منزلیں طے کیں۔ یورپ میں 'خلدونیات' پر ریسرچ ہونے لگی۔ ماہرین خلدونیات میں ارون روزن تھال، (Irwin Rosenthal) گاستوں بوتول، (Gaston Bouthoul) ایچ اے آر گب (H A R Gibb) والٹر جے فشل (Walter J Fischel)، آسترا ژارژ آلبیئر (Astre Georges Albert) آر مومئے (R. Maumier) وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کا میدان اختصاص 'خلدونیات' رہا ہے۔

فرانسیسی محقق کواترمیئر (Quatremere) نے مقدمے کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ چارلس عیساوی (Charles Issavi) نے مختلف موضوعات پر مشتمل ابن خلدون کے اقتباسات کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ کواترمیئر کے فرانسیسی ترجمے سے مستفاد ہے۔ ارنسٹ روزن تھال (Earnst Rosenthal) کا بھی انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ترکی زبان میں صبحی پاشا نے مقدمے کا ترجمہ کیا ہے۔

تاریخ ابن خلدون کے انتخابات مختلف زبانوں میں شائع ہوئے۔ محدود علم کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تاریخ کا ترجمہ کتنی زبانوں میں ہوا اور کب ہوا، البتہ شبلی کی نظر میں 1904 تک لاطینی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی میں تاریخ ابن خلدون کا مکمل ترجمہ نہیں ہوا تھا اور 1927 تک حکیم احمد حسین عثمانی کے مطابق یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

کابل کے امیر عبدالرحمٰن خاں نے ہندوستان میں ایک محکمۂ تراجم قائم کرنے کا ارادہ کیا، ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی افاضل کے قلم سے فارسی میں علوم و فنون کا سرمایہ منتقل کیا جائے۔ اس سلسلے میں کابل کے سفیر نے حالی، نذیر اور شبلی سے خط وکتابت کی۔ شبلی سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی درخواست کی گئی۔ علالت طبع کے سبب انھوں نے معذرت کر لی۔ مولانا حمیدالدین فراہی کے نام 3 جولائی 1899 اور نواب علی حسن خاں کے نام 9 اگست 1899 کے خط میں علامہ شبلی نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ بہر حال شبلی کے مکتوب سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ 1899 میں تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی کوشش ہو رہی تھی۔ اردو زبان و ادب کی توجہ اس سرمایۂ تاریخ کی جانب 1897 میں ہوئی، ابن خلدون کی عربی کو اردو سے متعارف کرانے کا سہرا علامہ حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی کے سر جاتا ہے۔

احمد حسین عثمانی موضع کونڈاپور، سید سراواں الہ آباد میں 1859 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حکیم بدرالدین عثمانی تھا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے مشہور اطبا میں تھے۔ احمد حسین عثمانی کی ابتدائی تعلیم سید سراواں میں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد یہ گھرانہ الہ آباد شہر منتقل ہو گیا۔ یہاں مدرسہ اسلامیہ میں احمد حسین عثمانی کا داخلہ ہوا۔ انھوں نے مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی سے حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ریاضی کی کتابیں پڑھیں۔ مزید حصول علم کے لیے کانپور کا سفر کیا اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے حلقۂ درس سے وابستہ ہوئے اور علوم کی تکمیل کی۔

جائے پیدائش ابن خلدون، تیونس

کانپور میں تکمیل کے بعد احمد حسین عثمانی نے لکھنؤ کا سفر کیا، مشہور حکیم اور طب یونانی کے ماہر استاد حکیم حیدر حسین طبیب دارالشفا شاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ احمد حسین نے حلقہ درس میں شامل ہونے کی اجازت چاہی، حکیم حیدر حسین نے کمسنی کے سبب ان کو داخلہ نہیں دیا، احمد حسین عثمانی کو علم سے شغف تھا اس لیے شکستہ خاطر نہ ہوئے اور درس گاہ کے دروازے سے لگ کر روزانہ حکیم حیدر حسین صاحب کا درس سنتے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حکیم صاحب نے اپنے شاگردوں سے چند سوال کیے مگر تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ احمد حسین عثمانی روزانہ کی طرح درس میں شریک تھے مگر درسگاہ کے باہر سے، انھوں نے حکیم صاحب سے ان سوالوں کے جواب کی اجازت چاہی۔ حکیم صاحب نے اجازت دے دی۔ مولوی احمد حسین عثمانی نے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا۔ حکیم حیدر حسین صاحب کو اس واقعے سے بہت حیرت ہوئی اور انھوں نے احمد حسین کو نہ صرف اپنی درس گاہ میں شامل کیا بلکہ اپنے قریب بٹھانے لگے۔ اس طرح مولوی احمد حسین عثمانی نے حکیم حیدر حسین کے یہاں رہ کر طب کی تعلیم مکمل کی اور سند فراغ حاصل کی۔

تکمیل طب کے بعد حکیم احمد حسین نے کلکتہ کا سفر کیا اور وہاں مطب قائم کیا لیکن والد کی علالت اور گھر کے حالات کی وجہ سے الہ آباد واپس آگئے۔ یہاں انھوں نے دوبارہ مطب قائم کیا اور علاج و معالجے میں مصروف ہو گئے۔ الہ آباد میں حکیم صاحب کو اس وقت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی جب یہاں طاعون پھیلا ہوا تھا اور عوام کے ساتھ معالجین بھی شہر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اس وقت ان کی طبی خدمات نے شہر کے لوگوں کو بہت متاثر کیا اور ان کی طرف رجوع عام ہوا۔

حکیم احمد حسین عثمانی نے خود کو مطب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ طب یونانی کے ارتقا و ترویج کی بھی انھیں فکر تھی۔ حکیم صاحب کی طب یونانی پر گہری نظر تھی، اس کی باریکیوں سے واقف و باخبر تھے، اس لیے ان کے مطب میں طلبہ بھی رہتے تھے جوان سے اکتساب فیض کرتے اور ان کی موجودگی میں طبی تجربات کرتے۔

حکیم احمد حسین عثمانی کو طبابت میں ان کی شہرت اور کارناموں سے بڑھ کر ان کی تصنیفی وتالیفی خدمات نے حیات جاوید عطا کی اور تاریخ نے ان کو مورخ ابن خلدون کے شارح اور مترجم کی حیثیت سے پہچانا۔ تاریخ ابن خلدون کے ترجمے کے علاوہ علامہ کی دو کتابیں اور بھی ہیں۔ حیات نور الدین محمود زنگی اور حیات صلاح الدین ایوبی۔

■

ماخذ: تاریخ ابن خلدون (جلد اوّل)، مصنف: عبدالرحمٰن ابن خلدون، مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی، مرتب: محمد صہیب، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سید فضل اللہ مکرم

نامہ نگار: سماج کا ایک باشعور اور ذمہ دار رُکن

اخبار کا بیشتر حصہ خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اخباری دفتر کو کئی ایک ذرائع سے خبریں موصول ہوتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی خبریں زیادہ تر خبر رساں ادارے ہی فراہم کرتے ہیں اور یہ خبریں سب اخباروں کو بھیجی جاتی ہیں۔ اگر اخبار صرف خبر رساں اداروں کی بھیجی گئی خبروں کو شائع کرے تو اخباروں میں یکسانیت پیدا ہوجائے گی حالانکہ ہر اخبار اپنی ضروریات اور پالیسی کا لحاظ رکھتے ہوئے خبروں کو شائع کرتا ہے۔ اس کے باوجود اخباروں کی انفرادیت باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے اخبار اپنے خاص وسائل سے زیادہ سے زیادہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وسائل اخبار کے اپنے عملے کے ارکان ہوتے ہیں انہیں رپورٹر یا نامہ نگار کہا جاتا ہے۔

جس شہر سے اخبار شائع ہوتا ہے اس شہر اور اس کے گردونواح کی خبروں کو جمع کرنے کا کام رپورٹر کرتا ہے۔ نئی اور تازہ خبریں جمع کرنے کا یہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ رپورٹر تازہ واقعات کی معروضی رپورٹنگ کرکے مستقبل کی تاریخ کو مرتب کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں اسی لیے انھیں معاشرے کی آنکھ اور کان کہا جاتا ہے۔ رپورٹر کا اپنا ایک مخصوص میدان ہوتا ہے وہ جس موضوع یا علم پر عبور رکھتے ہیں عموماً انھیں اسی میدان کی رپورٹنگ کی ذمہ داری دی جاتی ہے اگر شہر بڑا ہو تو مختلف علاقوں کے الگ الگ رپورٹر ہوتے ہیں۔ ہر رپورٹر کا اپنا علاقہ یا دائرۂ کار بیٹ (Beat) کہلاتا ہے۔ ان تمام رپورٹروں کی نگرانی چیف رپورٹر یا بیورو چیف کرتا ہے۔

بڑے اخبارات میں رپورٹر کا موضوعی بیٹ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی رپورٹر سیاسی رپورٹنگ کیلئے مختص ہے تو وہ صرف کانگریس پارٹی یا بی جے پی یا کسی علاقائی پارٹی کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرے گا اور متعلقہ سیاسی پارٹی اور ان کے کارکنوں پر گہری نظر رکھے گا اور ذرا سی اندرونی ہلچل کو بھی خبر کا جامہ پہنائے گا اس طرح سے جس شہر سے اخبار جاری ہوتا ہے وہاں پر کئی ایک رپورٹر کام کرتے ہیں۔ اس طرح سے اپنے بیٹ یا علاقے کی ہر طرح کی خبریں جمع کرنا اس علاقے کے رپورٹر کا فریضہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی غیر معمولی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اخبار ایک سے زائد رپورٹر کو واقعے کی رپورٹنگ کیلئے بھیجتے ہیں۔

نامہ نگار اور رپورٹر دراصل دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رپورٹر اس شہر میں خبریں حاصل کرتے ہیں جہاں سے اخبار شائع ہوتا ہے ہو اور دیگر مقامات سے رپورٹنگ کا کام نامہ نگار انجام دیتے ہیں۔ انھیں Correspondent کہا جاتا ہے۔ ایک ضلع میں کئی ایک نامہ نگار ہوتے ہیں جو اپنے مقامات کی رپورٹنگ کرتے ہیں اور ان سب کا نگران ضلعی نامہ نگار orrespondent Dist.C ہوتا ہے۔ نامہ نگار اہم خبریں تار یا ٹیلی فون کے ذریعہ بھیجتے ہیں اور نسبتاً کم اہم خبریں بذریعہ ڈاک بھیجی جاتی ہیں۔ بعض نامہ نگار ہمہ وقتی ہوتے ہیں اور بعض جزوقتی جب کہ بعض مقامات پر ایک ہی شخص کئی ایک اخباروں کا نامہ نگار ہوتا ہے۔ عام طور پر ضلعی نامہ نگاروں کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ بعض حضرات کو صرف ڈاک خرچ ہی ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اضلاع کے نامہ نگار مکمل وقت نامہ نگاری کے لیے نہیں دے سکتے تبھی تو اضلاع کی بہت سی خبریں شائع ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ مقامی زبان جیسے تلگو اخبارات کا اضلاع میں کافی اثر و رسوخ رہتا ہے اس لیے تلگو اخبارات کی رپورٹنگ کا نیٹ ورک کافی مستحکم ہے۔

نامہ نگاری ایک مشکل فن ہے جو کتابوں اور کلاس روم سے بھی سیکھی جاسکتی ہے لیکن اس کا اصل مدرسہ 'عملی میدان' ہے۔ نامہ نگار خبریں سونگھتا ہے۔ چھوتا ہے اور خبر کو دیکھا ہے اور چکھتا بھی ہے۔ چودھری رحم علی ہاشمی نامہ نگار کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

"وہ حالات زمانہ کی رفتار کو وسیع ترین معنوں میں مشاہدہ کرتا ہے اور بقیہ حصہ دنیا کے فائدے کیلئے اس کی تصویر الفاظ میں کھینچ دیتا ہے"۔

خبریں حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ نامہ نگار ہے جو اخبار کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ بیشتر اخبارات بلکہ خبر رساں ایجنسیاں بھی اپنے اپنے رپورٹر یا نامہ نگاروں کے ذریعے خبریں حاصل کرتے ہیں۔ شافع قدوائی رپورٹر یا نامہ نگار کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"رپورٹر معاشرہ کا ایک باشعور اور باریک بین مشاہد ہوتا ہے جس کا مقصد خبریں جمع کرنا اور انھیں معروضیت دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے"۔

سائنسی ایجادات سے صحافت کے معیار میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے اور اخبارات اپنے حسن میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کریں لیکن نامہ نگار کے بغیر اخبار کے وجود پر سوالیہ نشان لگ جائے گا جب تک واقعات ہیں تو پھر اظہار کے لیے لفظ ہیں اور لفظوں کا استعمال ایک فن ہے کسی واقعہ کو لفظی پیراہن عطا کر کے ہی اسے خبر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ کام صرف اور صرف نامہ نگار ہی انجام دے سکتے ہیں۔ نامہ نگاری ایک نہایت ذمہ دارانہ پیشہ ہے، جس میں تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں وقت ضرورت استعمال ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو کئی قربانیوں کا طلبگار ہے۔ یہ پھولوں کا بستر نہیں بلکہ کانٹوں کی سیج ہے۔ قلم چلانے کا فن دیکھنے میں تو آسان نظر آتا ہے مگر حقیقت میں یہ مشقت اور بھرپور جدوجہد کا متقاضی ہے۔

صحافت ایک مقدس اور معزز پیشہ ہے۔ سماج میں صحافی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ موجودہ دور میڈیا کا دور ہے۔ اس لیے نہ صرف مطبوعہ صحافت سے وابستہ افراد خود کو جرنلسٹ کہتے ہیں بلکہ ریڈیو سے وابستہ لوگ ریڈیو جرنلسٹ اور ٹی وی سے وابستہ کارکن خود کو ٹی وی جرنلسٹ کہتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سماج میں لفظ جرنلسٹ ایک معزز اور پیشہ اشراف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اخبارات نہ صرف سماج کا آئینہ ہوتے ہیں بلکہ بہتر سماج کی تشکیل و تعمیر میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ سماج اور اخبارات میں بہتر تال میل پیدا کرنے میں نامہ نگار کا اہم رول ہوتا ہے جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ لوگ سب سے پہلے نامہ نگار یا رپورٹر کو اس کی اطلاع دیتے ہیں وہ پولیس سے زیادہ نامہ نگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جس سے نامہ نگار کی سماجی پوزیشن واضح ہوجاتی ہے۔ سماج میں تغیر اور تبدیلی کی ذمہ داری صحافت پر عائد ہوتی ہے۔ نامہ نگار سماج کا نہ صرف نمائندہ ہوتا ہے بلکہ جواب دہ نقاد بھی ہوتا ہے۔ وہ سماج کا باریک بین مشاہد ہوتا ہے۔ سماج کی بہتری اور رہنمائی کے لیے وہ ہر ایک سے آگے رہتا ہے۔

موجودہ سماج میں نامہ نگار کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ سماجی واقعات کو اخبار کی زینت بناتا ہے بلکہ آج کا نامہ نگار غیر معمولی معلومات رکھتا ہے۔ خصوصاً حکومت کی مختلف پالیسیوں کا شارح بھی ہوتا ہے وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ حکومت کی پالیسیوں سے سماج کے کتنے افراد مستفید ہو رہے ہیں۔ مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے سیاسی لیڈر یا درمیانی لوگ کس طرح رشوت کا بازار گرم کررہے ہیں۔ پولیس اور عوام کے درمیان کس طرح کا ربط ہیں کہیں پولیس کسی عام آدمی کو ظلم و ستم کا نشانہ تو نہیں بنا رہی ہے۔ مختلف سماجی مسائل جیسے جہیز، بیروزگار، نوجوانوں کی بے راہ روی، تعلیمی اداروں کا استحصال ضعیف افراد اور خواتین کے مسائل کا وہ نہ صرف جائزہ لیتا ہے بلکہ اس کے محرکات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا ہے ان مسائل کے حل کیلئے متعلقہ محکموں کی توجہ اس جانب مبذول کرواتا ہے چونکہ کوئی مسئلہ جب اخبار کے صفحات کی زینت بنتا ہے تو ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ مذکورہ مسئلہ پر رائے عامہ ہموار ہونے لگتی ہے اور لوگ باشعور ہونے لگتے ہیں۔

صحافت ایک انتہائی دلکش ذریعہ روزگار ہے۔ نامہ نگار نہ صرف وقائع نگار ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے دور کے تاریخ نویس ہوتے ہیں بہترین نامہ نگار وہ ہے جو ہم عصر سیاسی اور اقتصادی حالات اور تغیرات پر نظر رکھتا ہو جو سماج کو اخبار کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہو۔

سید اقبال قادری نے اپنی تصنیف رہبر اخبار نویسی میں نامہ نگار کے مختلف انداز کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ حقائق کا ایک وسیع سمندر ہے، جس میں سے نامہ نگار کو روزانہ چند اہم بوندیں کشید کر کے پیش کرنی ہوتی ہے نامہ نگار کبھی شکار ہے تو کبھی شکاری، کبھی وہ حد درجہ فراست سے کام لیتا ہے تو کبھی اپنا مطلب نکالنے کے لیے بھولے پن کا بھی اظہار کرتا ہے۔ وہ دوستوں کا دوست ہوتا ہے اور دشمنوں سے بھی دوستی کا ہی رویہ برتتا ہے کیونکہ دشمنی اور عدم تعاون سے نامہ نگار کی ذمہ داریوں کو کافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ حالات کے اعتبار سے وہ چھوٹے موٹے سماجی اصولوں کی خلاف ورزی کر کے بھی اطلاعات اکٹھی کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے جس طریقے سے بھی ممکن ہو اطلاعات حاصل ہوں اور وہ ان معلومات کو لوگوں تک پہنچانے میں کوئی دیر نہیں کرتا نامہ نگار کا فرض صرف خبریں جمع کرنے کا ہی نہیں ہے بلکہ وہ خبر سے یا واقعہ سے سماج کو ہونے والے فائدے یا نقصان سے بھی آگاہ کرے واقعہ کا تجزیہ کرے اور اس کے اصل محرکات کا پتہ چلائے تاکہ مستقبل قریب میں ایسے واقعات کا تدارک کیا جاسکے۔

نامہ نگار کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ وہ سماج کا نقاد ہے اور سماج میں ہر مذہب اور طبقہ کے لوگ رہتے ہیں۔ ان تمام میں یگانگت پیدا کرنا نامہ نگار کا اہم فریضہ ہے۔ غیر مصدقہ واقعات اور افواہوں کو نہ صرف تردید کرے بلکہ حق اور سچ کی تبلیغ کرے نامہ نگار کا تعلق خواہ کسی مذہب سے کیوں نہ ہو۔ اسے یہ احساس ہونا چاہئے کہ اخبار سب کی ملکیت ہوتا ہے ہر زبان، مذہب اور طبقہ کے لوگ پڑھتے ہیں اس لئے متنازعہ موضوعات کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کرے۔ غیر اہم واقعہ کو غیر ضروری طور پر اہم نہ بنائے۔

ایسے محکمے جن کا راست تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ مثلاً بجلی، پانی، راشن، مارکٹ جہاں پر مختلف طریقوں سے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ نامہ نگار پر لازم ہے کہ وہ ان محکموں پر نظر رکھے نشیلی اشیا اور جسم فروشی کے کاروبار بھی مختلف محلوں میں چوری چھپے بھی کیے جارہے ہیں، جس سے نوجوان نسل دن بہ دن بگڑتی جارہی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو ملازمت کے بہانے جسم فروشی کا کاروبار کرایا جارہا ہے۔ ان حالات میں نامہ نگار کی ذمہ داری دوہری ہوجاتی ہے۔ ان غیر اخلاقی کاروبار کا قلع قمع کرنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگائے اور نوجوانوں کو ذہنی تربیت کرے تاکہ وہ کسی قسم کے استحصال کا شکار نہ ہوں کئی ایسے مواقع بھی نامہ نگار کی زندگی آتے ہیں جہاں نامہ نگار کو رشوت بھی دی جاتی ہے کہ وہ اس معاملے کو یہیں پر ختم کردے کچھ نامہ نگار چند پیسوں کے لیے اپنے مقدس پیشے کو داغدار بھی بنا دیتے ہیں بہرحال رپورٹر یا نامہ نگار پر لازم ہے کہ وہ معاشرے اور سماج کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کردے۔

کہا جاتا ہے کہ نامہ نگار کے ہاں چھٹی حس ہوتی ہے جسے حس خبر یا شامہ خبر بھی کہا جاتا ہے۔ Nose For News ایک ایسی امتیازی حس ہے جس سے نامہ نگار واقعہ کا خبری پہلو محسوس کرتا ہے اور جمع کردہ خبروں میں سے اہم خبر کا بھی انتخاب کرسکتا ہے۔ یہ خصوصیت عام آدمی میں نہیں ہوتی۔ نامہ نگار نہ صرف خبریں دیکھتا اور سنتا ہے بلکہ واقعات کو سونگھ کر خبریں ڈھونڈھ نکالتا ہے جس نامہ نگار میں شامہ خبر زیادہ ہوگی وہ صحافتی میدان میں اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

تجسس نامہ نگاری کا اہم زینہ ہے جب تک وہ تلاش و جستجو نہیں کرے گا اس وقت اسے اہم اور دلچسپ خبریں حاصل نہیں ہوں گی۔ اسے ہر معاملے کی کھوج لگانے سے دلچسپی ہو تجسس اور تفتیش سے وہ ہر طرح کے راز سے پردہ اٹھا سکتا ہے آج کل ٹی وی نامہ نگار کھوج اور تفتیش کے معاملے میں دیگر میڈیا سے کہیں زیادہ آگے ہیں مختلف اسکنڈلس کا پردہ فاش صرف اور صرف نامہ نگار کی جستجو اور کھوج کی بدولت ہی ہوا ہے۔ نامہ نگار کو ہم عصر

اخبارات، جرائد اور تحقیقی رسائل کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبروں اور دیگر اطلاعاتی پروگراموں سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔

نامہ نگار میں خبر کی پہچان کے علاوہ سوال کرنے کی اہلیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ سوال کرنا ایک فن ہے یہ ہر کس و ناکس کو نہیں آتا۔ سوال ایسا ہو کہ جواب دینے والا نہ چاہتے ہوئے بھی جواب دینے پر مجبور ہو جائے۔ سوال مختصر ہو۔ واضح ہو۔ کسی کی تضحیک پوشیدہ نہ ہو جس سے سوال کیا جارہا ہو اس پر طنز نہ ہو ورنہ وہ جواب دینے سے گریز کرے گا۔ سوال موضوع سے متعلق ہونا چاہیے۔ غیر ضروری سوالات سے گریز کرنا چاہئے وہی نامہ نگار زیادہ سے زیادہ مواد حاصل کرسکتا ہے جو سوال کرنے کے فن سے واقف ہو۔ تاکہ وہ لوگوں سے ملاقات کرکے کچھ نہ کچھ حالات، تفصیلات اور نظریات جمع کرے۔ نامہ نگار گوشہ نشین یا تنہائی پسند نہیں ہوسکتا۔ حجاب، سرد مہری، کشیدگی، کم گوئی سے احتراز ضروری ہے بلکہ وہ دلیر، گرم جوش، ملنسار، بیدار اور خوشگوار حد تک باتونی ہونا بہتر ہے۔ بات چیت کے ذریعہ خبریں اہم شخصیات کی زبان سے باہر آتی ہیں۔

نظریاتی اور اصولی اعتبار سے خبروں میں معروضیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ نامہ نگار واقعے کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ ذاتی تاثرات احساسات سے الگ رہ کر اور اظہار رائے کے بغیر بیان کرے۔ قارئین یا سامعین کے ساتھ انصاف بھی اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ خبریں اصل صورت میں ان تک پہنچیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''خبر سے میری مراد یہ ہیکہ آپ جب ازراہ کرم کسی واقعے سے مجھے مطلع کریں تو بس واقعے سے متعلق ردعمل مجھ تک منتقل کرنے کی کوشش نہ فرمائیں اور نہ یہ سعی کریں کہ واقعہ میرے احساسات و جذبات کو ایک خاص انداز میں برانگیخت کرے مطلب یہ ہے کہ خبر کو اپنی واقعی حالت میں مجھ تک پہنچنے دیں نیز خبر ایک نہایت مقدس شئے ہے۔ یہ ایک امانت ہے جو آپ کے ہاتھوں میں دی گئی ہے خبر کی حرمت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی مجرد حیثیت کو قائم رکھا جائے تاکہ جذبات اسے ملوث نہ کرسکیں۔''

چونکہ نامہ نگار بھی معاشرے کا ایک رکن ہوتا ہے اس کے اپنے جذبات و احساسات ہوتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خبروں میں سو فیصد معروضیت کو برقرار رکھ سکے؟ خبروں کی صداقت اور ان کی معروضیت کا لحاظ رکھنا نامہ نگار کے لیے لازم ہے وہ اس بات کی کوشش کرے کہ صداقت پر مبنی خبر مکمل معروضیت کے ساتھ خبریں پیش کرے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کیا ہر صداقت پر مبنی خبر اخبار کی زینت بن سکتی ہے۔

جرائم کی خبریں صحیح ہونے کی بناء پر من وعن بیان نہیں کی جاسکتیں۔ بہت سی صحیح باتیں بھی ہوسکتی ہیں جن سے معاشرے میں تشدد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو۔ قانون شکنی کے رجحان کو فروغ ملتا ہے۔ فرقہ وارانہ اور علاقہ واریت کو تقویت پہنچتی ہو۔ ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس قسم کی خبروں کی تحریر و ترسیل میں نامہ نگار کو احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی یعنی فتنہ و فساد پیدا کرنے والی سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔ لیکن آج کل ٹی وی چینل کے نامہ نگار اس معاملے میں کوئی احتیاط نہیں برتتے۔ شاہد کپور اور کرینہ کپور کا بوسہ بہت دیر تک اور بار بار دکھایا جاتا ہے کیونکہ ایک صداقت

ہے مگر اس صداقت سے اخلاق عامہ پر کس قدر برا اثر پڑتا ہے انہیں اس سے کوئی بحث نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ وہ صرف نامہ نگار ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک سماجی کارکن بھی ہوتا ہے۔ بہتر معاشرے کی تشکیل میں ممد ومعاون ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی صداقتوں سے گریز کرنے میں ہی سماج بہتری ہے۔

نامہ نگار کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ خبر کو توڑ مروڑ کر پیش کرے۔ اس سے نہ صرف صداقت مجروح ہوتی ہے بلکہ نامہ نگار کی بددیانتی کا بھی اظہار ہوتا ہے امریکہ کے مشہور صحافی Joseph Pulitzer نے یہاں تک کہا کہ خبر کی درستی ایسی ہی اہم ہے جیسے کسی دوشیزہ کے لیے اس کی عصمت یعنی کسی بھی خبر کی ایک آبرو ہوتی ہے۔ اسے ٹھیس نہیں لگنی چاہیے کسی خبر کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا گویا کسی باعصمت دوشیزہ کی آبروریزی یا عصمت دری کرنے کے مترادف ہے۔

خبریں صداقت پر مبنی ہوں اور ان کی پیشکش معروضیت کے ساتھ ہو تو نہ صرف اخبار کی اہمیت میں اضافہ ہوگا بلکہ سماج میں اخبار کے نامہ نگار بھی عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

سیاسی لیڈر، حاکم وقت، صنعتکار اور اثر ورسوخ رکھنے والوں سے نامہ نگار کبھی مرعوب نہیں ہوسکتا۔ جس دن نامہ نگار دولت مند طبقہ اور ذی اثر افراد سے مرعوب ہوگا۔ اسی دن سے صحافت اپنی اہمیت اور افادیت کھودے گی عوام کا صحافیوں پر بھروسہ اور یقین ختم ہوجائے گا۔ نامہ نگار کو بے باک، بے خوف، نڈر، باہمت، حوصلہ مند اور دور اندیش ہونا چاہیے۔ اسے اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ قلم کا بادشاہ ہے اور اس کی طاقت ناقابل گرفت ہے، محض صحافی کی بے باکی اور بے خوفی سے متاثر ہوکر نپولین نے کہا تھا ''میں سو فوجی دستوں کے مقابلے میں ایک اخبار سے زیادہ ڈرتا ہوں''۔

نامہ نگار کو متوازن اور بہترین شخصیت کا حامل ہونا چاہیے اس کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ، نرم خو اور سلجھے ہوا ذہن نامہ نگار کے علم و مرتبہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ تیز، چالاک اور حاضر جواب ہو، سماجی آداب سے واقف ہو وہ ہر طرح سے خلیق ہو، خوش وضع اور خوش طبع ہو، وہ چڑچڑا، گستاخ زبان اور ہٹ دھرم نہ ہو لوگ اس سے ملنے کے خواہشمند ہوں ایک صاف اور پرسکون ذہن صحافت کے پیشہ میں بہت مدد دیتا ہے کیونکہ ذہن صاف ہو تو مسائل واضح ہوتے ہیں اور ان کا ابلاغ آسان ہوجاتا ہے۔ نامہ نگار کی زندگی میں مشکلات اور پریشانیاں بھی آتی ہیں۔ بعض اوقات کام تیزی اور پھرتی سے کرنا پڑتا ہے حالات قابو سے باہر ہوجاتے ہیں ایسے میں نامہ نگار کے اعصاب مضبوط ہوں اور محض اپنے سکون اور سلجھے ہوئے ذہن کی مدد سے وہ تمام مشکلات پر قابو پاسکتا ہے۔ وہ تحمل و بردباری سے کام لے جذباتی ہونے کے بجائے صبر سے کام لے۔ دور اندیشی اور موقع شناسی نامہ نگار کے کئی ایک کام نکال سکتے ہیں۔ غرض اس کی شخصیت قابل اعتبار، صاف ستھری اور پروقار ہو۔

نامہ نگار کو فن نامہ نگاری سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ نامہ نگار کو مختلف ذرائع سے خبروں کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے، جن میں پریس ریلیز، پریس کانفرنس، ہاسپٹل و مردہ خانہ، ریلوے اور بس اسٹیشن، ہوائی اڈے، فائر بریگیڈ، پریس کلب، سرکاری دفاتر، سیاسی پارٹیوں کے دفاتر، بازار، محکمہ اطلاعات،

پولیس اسٹیشن، یونیورسٹی یا کالج کیمپس کھیل کود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نامہ نگار جتنا محنتی اور تلاش وتحقیق کا عادی ہوگا وہ دوسروں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور انوکھی خبریں حاصل کر پائے گا۔ خبروں کے حصول کے بعد خبروں کے تحریر کے مرحلہ میں بھی اسے طاق ہونا چاہیے ابتدائیہ نگاری Intro کے فن سے واقف ہو اور خبر کے متن کے جو مختلف مروجہ طریقے ہیں ان پر کمال حاصل ہو۔ خبر کے موضوع اور اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے طریق تحریر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ غرض صرف واقعات کی کھوج ہی نامہ نگار کا فرض نہیں ہے بلکہ کوئی بھی واقعہ اسی وقت خبر کا درجہ اختیار کرتا ہے جب تک نامہ نگار اس واقعے کو ضبط تحریر میں نہ لائے۔

نامہ نگار کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے۔ مختلف موضوعات پر اسے عبور حاصل ہو قانون، آئین، عمرانیات، سماجیات، اقتصادیات، سائنس، قانون سازی، صنعت و حرفت، کھیل کود، سیاحت اور ادب پر اچھی خاصی نظر رکھتا ہوں کیونکہ کسی بھی معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر درست نتائج نکالنے کے لیے خصوصی علمی استعداد ہی مدد ومعاون ہوتے ہیں۔

اخباری دفتر میں کئی ایک رپورٹر مامور ہوتے ہیں ان تمام کی نگرانی چیف رپورٹر یا بیورو چیف کرتا ہے یہ مختلف خبریں یا رپورٹ طلب کرنے کے لیے مختلف رپورٹروں کو مامور کرتا ہے۔ موصولہ رپورٹنگ پر نظر ثانی کرتا ہے تاکہ خبریں زیادہ مربوط اور دلچسپ ہوجائیں وہ طرز تحریر، واقعات کی پیشکشی اور ابتدائیہ نگاری میں مشورے دیتا ہے نئے رپورٹر کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔

جرائم کی خبریں جمع کرنے کے لیے جو رپورٹر مقرر ہوتے ہیں انھیں کرائم رپورٹر کہا جاتا ہے۔ عموماً مرد حضرات ہی یہ رپورٹنگ کیا کرتے تھے لیکن آج کل خواتین بھی جرائم کی خبرنویسی کے لیے متعین کی جارہی ہیں ایک جوکھم بھرا میدان ہے جہاں غنڈوں، شرپسندوں غیر سماجی عناصر، فسادیوں، چوراچکوں اور قاتلوں سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ اس لیے کرائم رپورٹر کو نہایت بے خوف و بے باک ہوکر کام کرنا پڑتا ہے۔ کرائم رپورٹر کو محکمہ پولیس، فوجداری عدالتوں کی کارگزاری اور انتظامی ڈھانچے سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی جرأت اور اہلیت ہو کہ وہ کسی بھی سطح کے پولیس افسر سے ملاقات کرکے کسی بھی جرم کی ملنے والی تفصیلات دریافت کرسکے۔ وکیلوں اور فوجداری عدالتوں کے ہر سطح کے افسر سے شناسائی رکھے۔ مختلف جرائم کی پاداش میں سزاؤں کے لئے باضابطہ قوانین اور تعزیرات ہند یا انڈین پینل کوڈ سے کما حقہ واقف ہو۔

کرائم رپورٹر کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ جرائم کی خبریں شائع کرنے کا مقصد جرائم کی روک تھام کرنا ہے۔ قارئین کو مجرموں کے ہتھکنڈوں سے واقف کروانا ہے کچھ اخبارات جرائم کی خبروں کو مرچ مسالہ لگا کر بیان کرتے ہیں۔ ایسے اخبار زرد صحافت کے دائرے میں آتے ہیں۔ نامہ نگار کی انداز نگارش سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جرائم سے نفرت کرتا ہے کہ نہ جرائم میں لذت محسوس کرتا ہے ذراسی لاپرواہی اور کوتاہی سے قارئین کو الٹا نقصان ہوسکتا ہے۔ اغوا، زنا بالجبر اور قتل وغارتگری کی رپورٹنگ احتیاط سے کریں تاکہ سماج خصوصاً نوجوانوں پر غلط اثرات مرتب نہ ہوں۔

اردو اخبارات میں کھیل کود کی خبریں کم ہی ہوتی ہیں، انگریزی اخبارات میں کھیل کود کے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ اسپورٹس رپورٹر تمام مشہور کھیلوں سے واقف

> صحافت ایک انتہائی دلکش ذریعہ روزگار ہے۔ نامہ نگار نہ صرف وقائع نگار ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے دور کے تاریخ نویس ہوتے ہیں بہترین نامہ نگار وہ ہے جو ہم عصر سیاسی اور اقتصادی حالات اور تغیرات پر نظر رکھتا ہو جو سماج کو اخبار کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہو۔

ہونا چاہیے۔ کھیلوں کی تاریخ اور کھیل سے وابستہ مختلف کپ اور ٹرافیوں سے آگاہی اسپورٹس رپورٹنگ میں معاون ثابت ہوگی۔ اسپورٹس رپورٹنگ بظاہر آسان ہوتی ہے مگر درحقیقت یہ دشوار اور محنت طلب لیکن دلچسپ مشغلہ ہے۔

سائنسی ایجادات وانکشافات کی رپورٹنگ کرنے والا نامہ نگار سائنسی نامہ نگار کہلاتا ہے۔ وہ سائنس کے کوئی ایک شعبہ کا ماہر ہوتا ہے اور دیگر شعبہ جات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ سائنسی نامہ نگار میں سائنسی خبروں کی سمجھ بوجھ، سائنسی خبروں کی تفصیلات کا حصول اور وضاحت وتشریح کے ساتھ خبر لکھنے میں مہارت کا ہونا ضروری ہے۔ سائنس کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں اور سائنسی علوم کے جدید ترین ادب کا جب تک گہرا مطالعہ نہ ہوتو سائنسی رپورٹنگ کرنا مشکل ہے۔ یہ رپورٹ عام زبان میں ہونی چاہئے نہ کہ سائنسی اور تکنیکی زبان میں ہو۔ سائنسی رپورٹنگ کا اہم مقصد عوام کو سائنسی ایجادات وانکشافات سے واقف کروانا ہے تاکہ انہیں قوم وملت کی ترقی کا اندازہ ہو اور بچوں میں سائنٹفک رجحان فروغ دینے میں بھی سائنسی رپورٹنگ مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔

موجودہ سماج میں معاشیات اور اقتصادیات کو کافی اہمیت دی جارہی ہے۔ اقتصادیات اور تجارت پر نہ صرف اخبارات شائع ہورہے ہیں بلکہ ہفتہ وار اور ماہنامے بھی جاری ہورہے ہیں۔ اردو اخبارات میں ایک آدھ صفحہ اقتصادیات کے لیے مخصوص کیا جارہا ہے لیکن اس کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بہرحال اقتصادی نامہ نگار کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی تجارت، شیر بازار پر نگاہ رکھنا ہوگا مختلف کمپنیوں کے بھاؤ، اقتصادی نشیب فراز مختلف کمپنیوں کا عروج وزوال غرض سب کچھ اقتصادی نامہ نگار کے مشاہدے اور مطالعے میں ہونا چاہئے تاکہ قارئین کو اقتصادی طور پر ہونے والی تبدیلی اور فائدے ونقصانات کا قبل از وقت علم ہوسکے۔

رپورٹر صرف خبریں ہی ارسال نہیں کرتا بلکہ ان واقعات کا پس منظر، وجوہات اور تفصیلات کے ساتھ جامع رپورٹنگ کرتا ہے ایسے مخصوص موقعوں پر اخبار مقام واقعہ پر اپنا نمائندہ خصوصی بھیجتا ہے جو جامع رپورٹنگ تیار کرتا ہے جسے Special Correspond ent بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً تجربہ کار، باشعور، دوراندیش اور باریک بین صحافی ہوتا ہے جو واقعہ کی صرف ظاہری سطح کی بیان پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیائے صحافت میں سب سے شاندار اور دل خوش کن کام نمائندہ خصوصی کا ہوتا ہے۔ کوئی بہت بڑا سیاسی واقعہ، قومی سانحہ، انتخابات، کسی اہم شخصیت کی گرفتاری، کسی محکمے، ادارے یا شعبے میں ہونے والی بدعنوانیوں کی تحقیقات وغیرہ کے سبھی امور کی وقائع نگاری نمائندہ خصوصی کے ذمہ ہوتی ہے۔

ضلعی نامہ نگار کے تحت کئی ایک نامہ نگار ہوتے ہیں جو متعلقہ ضلع کے مختلف مقامات پر مامور ہوتے ہیں۔ اردو اخبارات میں اضلاعی نامہ نگاروں کو وہ مقام نہیں دیا جاتا جو اسٹاف رپورٹر کو حاصل ہے جس کی وجہ سے بہت سے نامہ نگار جزوقتی طور پر نامہ نگاری کرتے ہیں۔ بعض نامہ نگاروں کو تو صرف ڈاک خرچ ہی دیا جاتا ہے جبکہ علاقائی صحافت میں ضلعی نامہ نگاروں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر ضلع کا ایک علحدہ ایڈیشن ہوتا ہے۔ ضلع بھر کی ہر چھوٹی بڑی خبر اس ایڈیشن کی زینت بنتی ہے۔ اردو اخباروں پر بھی لازم

ہے کہ وہ ضلعی نامہ نگاروں کی تربیت کی طرف توجہ دیں اور انہیں معقول مشاہرہ دیا جائے تا کہ وہ ہمہ وقتی رپورٹنگ کرسکیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی 70 فیصد سے زائد آبادی آج بھی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ تلگو روزنامہ اینا ڈو محض اضلاعی ایڈیشن کی بنیاد پر سرکولیشن کے اعتبار سے ہندوستان میں علاقائی صحافت کا سب سے بڑا روزنامہ بن گیا ہے۔

رپورٹر صرف خبریں ہی ارسال نہیں کرتا بلکہ ان واقعات کا پس منظر، وجوہات اور تفصیلات کے ساتھ جامع رپورٹنگ کرتا ہے ایسے مخصوص موقعوں پر اخبار مقام واقعہ پر اپنا نمائندہ خصوصی بھیجتا ہے جو جامع رپورٹنگ تیار کرتا ہے جسے Special Correspondent بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً تجربہ کار، باشعور، دوراندیش اور باریک بین صحافی ہوتا ہے جو واقعہ کی صرف ظاہری سطح کی بیان پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

سیاسی وقائع نگار بھی نامہ نگاروں کی ایک قسم ہے۔ سیاسی وقائع نگاری کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور یہ بہت مہارت چاہتی ہے۔ اس میدان میں تجربہ کار جہاں دیدہ، سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ سیاسی لیڈروں کے داؤ پیچ سے واقف اور اخباری زبان کی باریکیوں پر عبور رکھنے والے صحافی ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ مختلف الخیال سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں سے رابطے میں ایک ایسا توازن پیدا کرنا ہوتا ہے جس سے اخبار نویس سب کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ خبر سونگھنے کی جتنی اہلیت وقائع نگاری کی اس صنف میں درکار ہے صحافت کی کسی اور شاخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سیاسی وقائع نگار اپنے ملک کی سیاست کے ماضی اور حال سے بخوبی آشنا ہو اس کی اپنی شخصیت پرکشش ہو۔ فن گفتگو کا ماہر ہو۔ حفظ مراتب سے واقف ہو۔ واقعات و رجحانات کی ترجمانی اور تاویل میں دسترس رکھتا ہو۔ چہرہ شناس ہو، جری ہو، صبر کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہو اور اسے اپنے اعصاب پر پورا قابو ہو۔

سیاسی وقائع نگاری کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس میں کئی شعبے ہیں اور اعلیٰ پائے کے اخبار ہر شعبے کے لیے الگ الگ وقائع نگار مقرر کرتے ہیں۔

پارلیمنٹ یا اسمبلی یا کسی بھی قانون ساز ادارے کی کارروائی قلمبند کرنے والے کو پارلیمانی نامہ نگار کہا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے تجربہ کار نامہ نگاروں کو مقرر کیا جاتا ہے۔ اردو نامہ نگاروں کا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ پارلیمانی طریق کار، قواعد اور روایات کا مطالعہ کیا جائے تا کہ معلوم ہو کہ قانون ساز کا کام کیسے ہوتا ہے۔ بحث کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ پارلیمانی اور غیر پارلیمانی زبان میں کیا فرق ہوتا ہے۔

پارلیمانی طریقہ کار کی اصطلاحات سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے۔ ارکان کی چہرہ شناسی ضروری ہے ورنہ صحیح رپورٹنگ نہیں ہوگی۔

پارلیمانی خاکہ نگار ایوان کی فضا کا خاکہ کھینچتا ہے جب کہ نامہ نگار قانون ساز ادارے کی کارروائی قلمبند کرتا ہے۔ پارلیمانی خاکے کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں ایسے ارکان کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کبھی تقریر نہیں کرتے یا یا بحث کے وقت سوئے رہتے ہیں یا وہ ارکان جو کارروائی کے دوران اخبار پڑھتے ہیں ایسے ارکان جو پارلیمانی طریق کار سے بالکل واقف نہیں لیکن ہر مرحلے پر مداخلت کرتے ہیں۔ طویل طویل تقریریں کرتے ہیں۔ کارروائی کے دوران دلچسپ بحث، کہاوتیں لطائف غرض کسی بھی موضوع پر خاکہ لکھا جاسکتا ہے۔ Mansfield کا کہنا ہے کہ اس فن میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ پارلیمانی اسٹیج پر جو کردار موجود ہوں خاکہ نویس ان کی شخصیتوں، زندگی کے مختلف پہلوؤں، کمزوریوں، مشغلوں اور ان کے محبوب موضوعات سے آگاہ ہو خاکے کا اسلوب طنز و مزاح سے بھرپور ہو تو خاکہ دلچسپ ہوجائے گا۔

لابی (Lobby) ایوان سے ملحق اس ہال کو کہتے ہیں جہاں ایوان کے ارکان باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں اور اپنے ملاقاتیوں سے بات چیت کرتے ہیں اور چائے نوشی بھی کرتے ہیں۔ لابی نامہ نگار اس اخبار نویس کو کہتے ہیں جو اسپیکر کی اجازت سے خبریں جمع کرنے کے لیے ایوان کی لابی میں آتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام معزز شخصیتوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔ اسے سیاسیات کا گہرا درک ہو اس کا ایک ہاتھ ایک طرف سیاست دانوں کی نبض پر ہوتا ہے اور دوسری طرف قارئین کی نبض پر۔ اسی لیے لابی نامہ نگار سیاسی معاملات پر مستند رائے دے سکتا ہے۔

سفارتی نامہ نگار، سفیروں، سفارتی، قونصلوں، ہائی کمشنروں، تجارتی کمشنروں اور دوسرے ڈپلومیٹک نمائندوں سے رابطہ رکھتا ہے جب کوئی غیر ملکی وفود آئیں تو ان کے ارکان اور اخباری مشیروں سے مل کر ممکنہ معلومات حاصل کرتا ہے اس قسم کی نامہ نگاری میں محنت زیادہ ہوتی ہے لیکن بافت کم ہوتی ہے کیونکہ سفارتی گفتگو عام طور پر خفیہ رہتی ہے۔ سفارتی نامہ نگاری کی ذمہ داری سینئر صحافیوں کو سونپی جاتی ہے کیونکہ یہ ایک نہایت نازک کام ہے۔

غیر ملکی نامہ نگار ایک غیر سرکاری سفیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ملک کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے اس کا ملک بدنام ہو، یہ عہدہ بڑی ذمہ داری اور سوجھ بوجھ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کی رپورٹنگ ہر دو ملکوں کے باہمی تعلقات کا انحصار ہوتا ہے۔

جس ملک میں غیر ملکی نامہ نگار بھیجا جاتا ہے وہ اس ملک کی تاریخ اور جغرافیہ سے گہری واقفیت حاصل کرے وہاں کی تہذیب وتمدن، معیار زندگی، عام اقدار، رویوں اور رجحانات سے آشنا ہو اور اس ملک کی زبان و ادب پر قادر ہو اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں وہ اپنے ملک کے مفاد کو ترجیح دے اس لیے معمر، تجربہ کار، تعلیم یافتہ، مہذب اور نامی گرامی صحافیوں کو ہی غیر ممالک بھیجا جاتا ہے۔

برطانوی صحافی غیر ملکی نامہ نگاروں کو یہ مشورہ دیتے ہیں۔

''سچ بولنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات سچائی گالی سے زیادہ مجروح کن اور زہریلی ثابت ہوتی ہے۔ داخلی امور میں آپ ووٹوں سے کھیلتے ہیں لیکن امور خارجہ میں زندگیوں سے کھیلنے کی نوبت آسکتی ہے۔ آپ کا ایک ایک لفظ قوموں کے درمیان دوستی یا دشمنی پیدا کرسکتا ہے۔ امور خارجہ کے بارے میں لکھتے وقت غیر معمولی احتیاط سے کام لیجیے۔''

مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ نامہ نگار کے اور بھی کچھ روپ ہوتے ہیں جو عموماً بڑے اخبارات میں مامور ہوتے ہیں جیسے صنعتی نامہ نگار، تجارتی نامہ نگار، لیبر نامہ نگار، تعلیمی نامہ نگار، دینی نامہ نگار، زرعی نامہ نگار، قانونی نامہ نگار، مالیاتی نامہ نگار، تکنیکی نامہ نگار، فیشن نامہ نگار، آٹو موبائیل نامہ نگار، ماحولیاتی نامہ نگار، موسیقی نامہ نگار تھیٹر نامہ نگار، کانکنی نامہ نگار، شپنگ نامہ نگار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Syed Fazlullah Mukarram,
H.No.16-9-537, Old Malakpet, Near water tank,
Hyderabad 500036 (AP)

انٹرنیٹ سے کمائی کے جائز طریقے

ریشما انجم

اس ترقی یافتہ زمانے میں ہر وہ شخص جو انٹرنیٹ کا استعمال کرنا جانتا ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم عالمی نیٹ ورک کا استعمال حصول دولت کے لیے کیسے کیا جائے۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا مل جائے جو تھوڑی اضافی دولت کا خواہش مند نہ ہو۔ اخبارات میں ایسے اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے جن میں لوگوں کو بنا کچھ کیے انٹرنیٹ کے ذریعے دولت کمانے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے اکثر اشتہار دہندگان کا مقصد عام آدمی کی دولت کی لالچ سے غلط فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ ایسے اشتہار دہندگان یا تو اپنی فیس وصول کر کے راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں یا پھر آپ سے ایسے کام کروانا چاہیں گے جو ناجائز اور غیر اخلاقی ہیں۔

اگر آپ بھی انٹرنیٹ کو اضافی آمدنی کے ذریعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں تو پھر ایسے گمراہ کن اشتہارات کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غلط طریقے اختیار کیے بنا اور کوئی خطرہ مول لیے بغیر بھی انٹرنیٹ سے اضافی آمدنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن بنا کچھ کیے آمدنی کے حصول کی بات دل سے نکال دیجیے۔ اگر آپ کے پاس کوئی ہنر ہے، یا آپ اپنا وقت اور محنت کی قربانی دینے کو تیار ہیں تو انٹرنیٹ کی دنیا میں کہیں نہ کہیں، آپ کی خدمات اور خصوصیات کے قدرداں ضرور مل جائیں گے۔ آخرکار انٹرنیٹ سے وابستہ افراد کو بھی ہم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اگر کسی جاپانی شہری کی کوئی ضرورت کوئی ہندوستانی شخص نسبتاً کم داموں میں انٹرنیٹ کے ذریعے پورا کرسکتا ہے تو بھلا اسے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انٹرنیٹ سے پورے قانونی ڈھنگ سے اضافی دولت کمائی جاسکتی ہے بشرطیکہ آپ کے پاس کوئی اعلیٰ پیداوار، خدمات، صلاحیت یا خصوصیات موجود ہوں۔ انٹرنیٹ مارکیٹنگ کی جانکاری رہنے سے آپ کے کاموں میں مزید تیزی پیدا ہوگی۔

فری لانسنگ

فری لانسنگ کا مفہوم ہے کسی شخص یا کمپنی سے رسمی طور پر جڑے بغیر اس کا کام پورا کرنا، جو لوگ پہلے سے ہی کہیں کام میں لگے ہوتے ہیں وہ اپنے خالی اوقات میں ایسے امور انجام دیتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ موجود ہیں جنھوں نے فری لانسنگ کو ہی اپنی معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔ انٹرنیٹ پر ویب ڈیزائننگ سے لے کر، اشتہار نویسی، ٹیلی ویژن پر گراموں کی اسکرپٹ رائٹنگ، سیلس اور مارکیٹنگ، سرمایہ کاری، قانونی صلاح کاروں کی خدمات، انجینئرنگ اور مینوفیکچرنگ تک کے فری لانس پروجیکٹ موجود ہیں۔

عموماً ایسے کام پروجیکٹ کی بنیاد پر ملتے ہیں اور ہر پروجیکٹ کے لیے مخصوص رقم دی جاتی ہے ایسے پروجیکٹس میں جہاں کمپنیوں کو اچھی شرح پر اور جلدی کام پورا کروانے میں آسانی ہوتی ہے، وہیں فری لانسر کو اپنا موجودہ کام چھوڑے بنا خالی اوقات میں کچھ اضافی دولت کمانے کا موقع ملتا ہے اور نئے کام کا تجربہ بھی۔

فری لانسنگ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے کئی سائٹس موجود ہیں جن پر رجسٹریشن کروا کے اپنا کام شروع کرسکتے ہیں۔ زیادہ تر فری لانسنگ سائٹس پر نیلام میں بولی کی بنیاد پر پروجیکٹ دیے جاتے ہیں یعنی آپ کی فیس جتنی کم ہوگی کام ملنے کی امید اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ کام کی خوبی، متعلقہ شخص کی سینیریٹی (seniority)، پہچان اور دوسرے گاہکوں کے تجربات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ آپ کو ملنے والے کام کے بدلے ویب سائٹ کی طرف سے تھوڑی سی فیس جاتی ہے۔ کچھ ویب سائٹس کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے بھی فیس لی جاتی ہے۔ فری لانسروں کے لیے کچھ سائٹس حسب ذیل ہیں:

www.elance.com
www.freelancer.com
www.rentacoder.com
www.logoworks.com
www.designoutopst.com

ترجمہ، ادارت، پروف ریڈنگ

کئی ویب سائٹس ایسی بھی ہیں جو ضرورت مند کمپنیوں اور مترجمین و مدیران کے بیچ فیچ کا کام کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہنے والے ماہر مترجمین ملک و بیرون ملک سے ایسے ٹرانسلیشن پروجیکٹ حاصل کرنے لگے ہیں جو انٹرنیٹ کی عدم دستیابی کی صورت میں انھیں مل ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر آپ بھی کسی دو زبانوں پر عبور رکھتے ہیں تو آپ بھی

اضافی آمدنی کے لیے اس متبادل کو اختیار کر سکتے ہیں۔

عالمگیریت کی وجہ سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیے جانے والے دستاویزات کی تعداد اور ضرورت بڑھتی جارہی ہے اور یہ سلسلہ لمبی مدت تک چلنے والا ہے۔ ان ویب سائٹس پر مترجمین کو عموماً کام کی خوبی کی بنیاد پر فی لفظ کے حساب سے محنتانہ دیا جاتا ہے۔ کئی بار گاہک کسی خاص فارمیٹ میں ترجمہ مانگتا ہے، اس لیے مختلف سافٹ ویئر فارمیٹس کی جانکاری رکھنے والے مترجمین دوسروں سے بہتر آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ترجمہ کے مواقع فراہم کرانے والی کچھ اہم ویب سائٹس حسب ذیل ہیں:

www.proz.com
www.translatorscafe.com
www.trally.com
www.traduguide.com
www.langjobs.com
www.transquotation.com
www.elance.com
www.freelancer.com

آن لائن ٹیوشن

مغربی ممالک میں گارجینوں کے پاس اپنے بچوں کا ہوم ورک پورا کروانے کا وقت نہیں ہوتا۔ نیز اچھا اور سستا ٹیوٹر تلاش لینا معمولی کام نہیں۔ ایسے ماں باپ کے لیے انٹرنیٹ ایک اچھا معاون بن کر سامنے آیا ہے۔ وہ اس کی مدد سے اپنے بچوں کو غیر ملکی اساتذہ سے نسبتاً کم شرح پر آن لائن ٹیوشن کروا لیتے ہیں۔ جس سے دونوں ہی فریق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ انگریزی، حساب اور سائنس کے اچھے ہندوستانی اساتذہ کی موجودگی آن لائن ٹیوشن کے شعبے میں پہلے سے ہی ہے۔ اگر آپ بھی معلم ہیں یا کسی مضمون میں اچھی دسترس حاصل ہے تو گھر بیٹھے ہی ملک و بیرون ملک کے طلبہ کو ٹیوشن دے سکتے ہیں۔ اگر آپ کو ایک سے زیادہ غیر ملکی طلبہ مل جاتے ہیں تو آپ کی آمدنی سابقہ نوکری سے بھی بہتر ہو سکتی ہے۔

مختلف ویب سائٹس پر آن لائن ٹیوشن کے لیے انٹرنیٹ پر مبنی جدید تکنیک کو استعمال کیا جاتا ہے جس کے لیے پہلے اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔ خاص مضمون کے ٹیوشن کے علاوہ طلبہ کو پروجیکٹ مکمل کرنے میں مدد کرنے اور مختلف مقابلہ جاتی امتحانات کی کوچنگ جیسے مواقع بھی موجود ہیں۔ اس کے لیے ٹیوٹر کو فی گھنٹہ پانچ ڈالر سے لے کر بیس پچیس ڈالر تک مل جاتے ہیں۔ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلے بغیر محض ایک گھنٹہ کام کر کے اتنا کما لینے میں کیا برائی ہے؟ آن لائن ٹیوشن سے متعلق کچھ ویب سائٹس مندرجہ ذیل ہیں:

www.ztion.net
www.tutorvista.co.in
www.transtutors.com
www.onlinetuition.co.in
www.buddyschool.com
www.hometutorsnetwork.com

فوٹو گرافی

اگر آپ کے اندر فوٹو گرافی کی صلاحیت موجود ہے تو ویب سائٹ، نمائش، بروشر، اخبارات و مجلات وغیرہ کے لیے تصاویر کی مانگ ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ انٹرنیٹ پر

کچھ اسٹاک فوٹو گرافی ویب سائٹس موجود ہیں جو عمدہ معیار کے لاکھوں فوٹو گراف اور گرافکس کا مجموعہ تیار رکھتی ہیں۔ نشریاتی ادارے اور ویب سائٹ تیار کرنے والے ان سے اپنی پسند کے فوٹو گراف یا تصویر خرید سکتے ہیں۔ لیکن کئی مواقع پر ان ویب سائٹس کے پاس ضرورت کے مطابق فراہم کرانے کے لیے تصاویر نہیں ہوتیں۔ کسی چھوٹے گاؤں، کسی خاص واقعہ، کسی بھلا دیے گئے آدمی وغیرہ کی تصویر بھی کئی بار موجود نہیں رہتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس کئی فوٹو گراف ہیں تو آپ انھیں اسٹاک فوٹو گراف سائٹس کو بیچ سکتے ہیں۔ ویب سائٹس کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر دنیا میں بہت عام چیزوں مثلاً چمچہ، کٹوری، دروازہ، چراغ، قلم، سیاہی، کمپیوٹر، بادل، پیڑ، چھت، کھیل وغیرہ کی تصاویر کا بھی دنیا میں بہت مطالبہ ہے۔ آپ اپنے اردگرد کی چیزوں کی عمدہ معیار کی تصاویر کھینچ کر انھیں بھی ان ویب سائٹس کو بھیج سکتے ہیں۔ امریکی نیوی انسٹی ٹیوٹ جیسے کچھ سرکاری ادارے اور آؤٹ ٹریولر (www.outtraveler.com) جیسے سیاحت سے متعلق ویب سائٹس پر بھی ایسے فوٹو گرافوں کی مانگ مستقل طور پر بڑھتی جارہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی نجی ویب سائٹس بنا کر بھی اچھے فوٹو گرافس کا پورٹ فولیو (Portfolio) تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ان ویب سائٹس کو فوٹو گراف دیتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کے فوٹو گرافس میں کسی کے ٹریڈ مارک، کاپی رائٹ یا قانون کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ فوٹو گراف خریدنے والی کچھ ویب سائٹس کے نام یہ ہیں:

www.fotolia.com
www.isfockphoto.com
www.shutterstock.com
www.dreamstime.com
www.usphotostock.com
www.webshots.com

ایچ آر سروسز

کچھ کمپنیاں ان ملازمین کو حوصلہ افزائی کی رقم دیتی ہیں جو ان کی ضرورت کے مطابق نئے ملازمین کی بھرتی میں مدد کرتے ہیں۔ کچھ کمپنیاں اسی طرح کی حوصلہ افزائی کی رقم ان عام انٹرنیٹ سرفرس (Internet Surfers) کو بھی دیتی ہیں جو انھیں اچھے امیدوار کی تلاش میں مدد کرتے ہیں۔ یہ رقم پچاس سے لے کر ایک ہزار ڈالر تک ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان کے ذریعے بتلائے گئے امیدوار کا انتخاب ہو جائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پورے مہینے میں ایسے کسی ایک شخص کو بھی روزگار دہندہ کے ذریعے منتخب کروانے میں کامیاب رہتے ہیں تو اضافی آمدنی کا آپ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوکریوں کی ویب سائٹس سے لے کر مختلف فورم، سماجی نیٹ ورکنگ سائٹ اور حلقہ احباب کے بیچ اچھے ملازمین کی تلاش کی جائے۔ اس نوعیت کے کام میں وہ لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو روزگار دہندگان اور امیدوار دونوں کے ساتھ اچھا تال میل بنا کر رکھتے ہیں۔

اس شعبے سے متعلق کچھ مفید ویب سائٹس حسب ذیل ہیں:

www.referearns.com
www.zyoin.com
www.whodoyouknowfordough.com
www.bohire.com
www.wisestepp.com
www.hoojano.com
www.hiremagic.com

■

Reshma Anjum, C/o NM Ansari, Vill. & Post Sari, Vaya Kashipur, Samastipur- 848101 (Bihar)

شمس الاسلام فاروقی

پانی سے علاج

ایک قدرتی طریقہ

اس زمین پر پانی ایک معجزہ ہے جو ہائیڈروجن کے دو ایٹمس اور آکسیجن کے ایک ایٹم کے باہم ملنے سے برپا ہوا ہے۔ رب کائنات نے جب اس زمین کی تخلیق فرمائی تو یہاں ایک متعینہ مقدار میں پانی اتارا اور ہر زندہ شے پانی سے پیدا کی۔ اس سرزمین پر خشکی کے مقابلے پانی کی مقدار ستر فیصدی ہے اور انسانی جسم میں بھی اس کا یہی تناسب برقرار رکھا گیا ہے۔

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ پانی ایک ایسی دوا کے مانند ہے جو نہ صرف انسانی بیماریوں کو روکتا ہے بلکہ اہم بیماریوں کا علاج بھی کرتا ہے۔ لورین آئینسلے کے مطابق اس سرزمین پر اگر کوئی جادوئی شے ہے تو وہ پانی ہے۔ انسانی جسم میں دل جیسا اہم عضو اس وقت سے دھڑکنا شروع ہوجاتا ہے جب بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں محض بیس دن کا ہوتا ہے اور پھر اس کی آخری سانس تک دھڑکتا ہی رہتا ہے۔ دل کا دھڑکنے کے لیے بار بار سکڑنا اور پھیلنا اس پانی کی وجہ سے ممکن ہے جو اس کے خلیوں میں موجود ہوتا ہے۔ آنتوں میں نظام ہضم کے لیے پانی ہی ذمے دار ہے۔ غذا میں موجود تغذیات پانی میں حل ہوکر ہی خون میں منتقل ہو پاتے ہیں جہاں سے وہ جسم کے ایک ایک خلیے میں پہنچ کر توانائی فراہم کرتے ہیں۔

انسانی جسم میں پانی کی کمی سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص چھوٹے بچوں، بوڑھوں یا لمبی بیماری میں مبتلا مریضوں میں پانی کی کمی مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسی ہلاکت خیزی کے تجربات عام طور پر سامنے آتے رہتے ہیں۔ بزرگوں، بچوں یا مریضوں کو اگر غیر معمولی طور پر الٹیاں یا دست آجائیں تو انھیں مسلسل پانی پلانے کا مشورہ دیا جاتا ہے کیونکہ اگر یہ صورت حال دیر تک جاری رہ جائے تو اس کے مہلک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق بہت سی بیماریاں جیسے قبض، سر درد، خواتین میں حیض کی بے قاعدگی، وزن میں اضافہ، بلڈ پریشر، چکر آنا، جوڑوں کا ورم اور درد، ذہنی خلفشار، کولسٹرول میں اضافہ، آنکھوں کا جریان خون، اعضا کی کارکردگی کا معطل ہوجانا، انیمیا، سائنوسائیٹس، قلبی عارضے یہاں تک کہ قولون، ایوفیکس، جگر، پھیپھڑوں اور رحم کے کینسر کے لیے بھی پانی کی کمی ذمے دار ہوتی ہے لیکن اگر اس کمی کی طرف توجہ دی جائے تو بڑی حد تک ان بیماریوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ پانی دماغی خلیوں کو قوت دیتا اور یادداشت کو بڑھاتا ہے: دماغ کے گرے میٹر (Grey matter) میں 85% تک پانی ہوتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اگر اس میں صرف 2% کی کمی واقع ہوجائے تو یادداشت متاثر ہونے لگتی ہے اور انسانوں کی جوڑنے اور گھٹانے کی اہلیت کم ہوجاتی ہے۔ اگر جسم میں پانی کی کمی نہ ہونے دی جائے تو دماغی صلاحیتوں کو نارمل رکھا جاسکتا ہے۔

پانی قلب کی نارمل دھڑکن کے لیے ضروری: **تجربات سے** پتا چلتا ہے کہ جسم میں پانی کی کمی سے دل کی دھڑکن بے قاعدہ ہوجاتی ہے لیکن اگر اس کمی کو بحال کردیا جائے تو دھڑکن نارمل ہوجاتی ہے۔

گردے کی پتھری کے لیے پانی بے مثل دوا: حضرت عیسیٰؑ سے بھی 400 سال پہلے ہپوکریٹس (Hipocrates) نے پیشاب کی نالی میں پتھری کی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے زیادہ مقدار میں پانی پینے کی سفارش کی تھی۔ موجودہ سائنس کے مطابق بھی گردے کی پتھری سے حفاظت کا بہترین طریقہ کثیر مقدار میں پانی کا استعمال ہے۔ گردے کی پتھری سے بچنے کے لیے عام طور سے جو کا پانی تجویز کیا جاتا ہے۔

موٹاپے کا علاج پانی: زیادہ پانی پینے والے کھانا کم کھاتے ہیں اور اس طرح قدرتی طور پر ان کا وزن قابو میں رہتا ہے۔ ماہرین کے مطابق وہ لوگ جن کا وزن بڑھا ہوا ہو وہ روزانہ 5 سے 6 گلاس نیم گرم پانی پئیں اور پھر پانی کے کرشمے دیکھیں کہ وہ کس طرح ان کے بڑھے ہوئے وزن کو کم کردیتا ہے۔

ماہرین کے مطابق اگر صبح نہار منہ صرف دو گلاس تازہ پانی ہی پی لیا جائے تو وہ عام صحت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ صبح اٹھنے کے بعد پیٹ خالی ہوتا ہے اس لیے پانی کو جسم کے زہریلے مادے خارج کرنا آسان ہوتا ہے اس کے علاوہ پانی خون کو پتلا کرنے اور بدن کے اہم اعضا کو تقویت پہنچا کر انھیں چاق و چوبند رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان کی گئی بیماریوں کو روکنے میں بھی پانی بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔

اس سلسلے میں مسٹر آر جی گنگن وانی نے عوام کی بہبود کے خیال سے 'دکن کرانیکلس' نامی میگزین میں 'پانی سے معجزاتی علاج' عنوان کے تحت ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں انھوں نے 'جاپان سکنیس ایسوسی ایشن' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ پانی کے ذریعے بہت سی بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ ان میں سر درد، ہائی بلڈ پریشر، دمہ، نرخرے کی جھلی کا ورم، انیمیا، عام فالج، موٹاپا، جوڑوں کا ورم اور درد، ناک کے جوف کی سوجن، کھانسی، پھیپھڑوں کا دق، جگر کی خرابی، پیشاب اور تناسلی امراض، تیزابیت، پیچش، کانچ نکلنا، قبض، ذیابیطس، امراض چشم، بے قاعدہ حیض، لیکوریا، حلق کا ورم اور رحم و پستان کے کینسر جیسی بیماریاں شامل تھیں۔

اب سے تقریباً 2500 سال پہلے کنفیوشیس نے کہا تھا کہ کسی بھی جاندار کی صحت اس کے معدے کی صحت پر موقوف ہوتی ہے۔ ایک جدید سنت پرم ہنس یوگ آنند کا تجزیہ بھی یہی ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دن کھاتے رہنے والا شخص پیچیدہ امراض کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس

بیان کی روشنی میں رمضان کے روزے اللہ کا انتہائی کرم اور اس کی رحمت سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو صاف پانی جسم کے اندر پہنچ کر پوری طرح اس کی صفائی کردیتا ہے تاکہ نظام ہضم کی کارکردگی بڑھ جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب پانی کے ذریعے قولون اور آنتوں کی اندرونی جھلی دُھل کر صاف ہوجاتی ہے تو غذا میں موجود تغذیات کا خون میں انجذابی عمل تیز ہوجاتا ہے اور نتیجے میں جسم کے اندر صحت مند خون کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صحت مند تازہ خون جسم کے جس حصے میں پہنچے گا وہاں کی بیماریوں اور عارضوں کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

پانی کے ذریعے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ صبح اٹھنے کے فوراً بعد 1.26 کلو یا 1260 ملی لیٹر تازہ، صاف پانی پی لیا جائے۔ یہ کام منہ ہاتھ دھونے اور دانت صاف کرنے سے بھی پہلے کیا جانا چاہیے۔ اگلے پینتالیس منٹ تک کچھ بھی کھایا پیا نہ جائے۔ اس بات کا بھی خیال رہے کہ رات کو سونے سے پہلے جسم کو متحرک کرنے والی کوئی شے یا مشروب کا استعمال نہ کیا جائے۔ ایک دفعہ میں اس قدر پانی پی لینا یقیناً ایک مشکل کام ہے لیکن چند روز کی کوشش اسے آسان بنادے گی۔ ایک بار میں جس قدر بھی پانی آسانی سے پیا جاسکے پی لیں اور اس کے بعد یا تو لیٹ جائیں یا پھر ایک جگہ کھڑے ہوکر چلنے کی کوشش کریں۔ تھوڑا وقفہ دے کر باقی پانی بھی پی لیں۔ چند روز ضرور دشواری محسوس ہوگی لیکن بعد میں یہ کام آسان ہوجائے گا۔ جوڑوں کی سوجن یا درد میں مبتلا مریضوں کو پہلے ہفتے میں پانی پینے کا یہ عمل دن میں تین بار دہرانا چاہیے لیکن بعد میں صرف ایک ہی بار پانی پینا کافی ہوگا۔ پانی سے علاج کے دوران کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی پینا چاہیے۔ ساتھ ہی مشروبات وغیرہ سے بھی مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔ تجربات شاہد ہیں کہ پانی کے ذریعے حسب ذیل بیماریاں ان کے سامنے دی گئی مدت میں دور ہوسکتی ہیں۔

1. ہائی بلڈ پریشر (ایک مہینہ)
2. قبض (ایک یا دو دن)
3. ذیابطیس (ایک سے دو ہفتے)
4. کینسر (ایک مہینہ)
5. پھیپھڑوں کی دق (3 سے 9 مہینے)

اس طریقۂ علاج کو اپنانے والے ایک نوجوان کا کہنا تھا کہ پہلے روز پانی پینے کے بعد اُسے تین بار پیشاب کے لیے جانا پڑا جس کے بعد اُسے ناشتہ انتہائی ذائقہ دار اور راحت بخش محسوس ہوا۔ دوسرے دن اس کے اجابت کے مسائل حل ہوگئے اور تین مہینوں کے اندر اس کا وزن بڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس علاج کے بعد سے اب تک وہ کبھی بیمار نہیں ہوا یہاں تک کہ معمولی نزلہ اور کھانسی تک اسے نہیں ہوئی۔

علاج کی غرض سے پانی کا استعمال 'واٹر یا ہائیڈرو تھیراپی' (Water or Hydro-Therapy) کہلاتا ہے۔ پانی پی کر بیماریوں کا علاج یا روک تھام واٹر تھیراپی کا صرف ایک پہلو ہے جب کہ دوسرا ایک پہلو اور بھی ہے جس میں پانی کو جسم کے باہر سے استعمال کیا جاتا ہے۔

عام گرم پانی کے ٹب میں لیٹنے یا پھر گندھک کے چشموں سے نکلنے والے گرم پانی میں خود کو ڈبونے سے جو لطف اور راحت حاصل ہوتی ہے وہ تو ہے ہی تاہم اس عمل کے دوران نہ صرف جسم کے بہت سے درد رفع ہوجاتے ہیں بلکہ جسمانی حرکت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور بعض بیماریاں تک دور ہوجاتی ہیں۔

انسانی جسم جیسے ہی گرم پانی کے اندر جاتا ہے، اسی لمحے پانی کے فوائد اسے حاصل ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ سب سے پہلے اسے گرمائش کا احساس ہوتا ہے جس کے ساتھ ہی پانی اس کے جسم کو اوپر اچھال کر ہلکا کردیتا ہے اور وہ کسی قدر زمینی کشش سے آزاد ہوجاتا ہے اور پھر ان کے اثر سے جسم کا دورانی نظام متاثر ہونے لگتا ہے۔

گرم پانی جسم کو گرم کردیتا ہے۔ یہ عمل اوپری جلد سے شروع ہوتا ہے۔ فوراً ہی دل اپنی کارکردگی تیز کردیتا ہے اور وہ زیادہ قوت سے خون پمپ کرتا ہے تاکہ جسم کی اوپری شریانوں میں پہنچ کر بڑھی ہوئی حرارت کو نارمل کرنے کا عمل شروع کرسکے۔ اوپری شریانوں میں تیزی سے خون کا دوران وقتی طور پر خون کا دباؤ بڑھا دیتا ہے۔ گرم خون کے زیر اثر تیزی سے پسینہ آتا ہے جو عام حالت میں جلد سے نکل کر بخارات کی شکل میں فضا میں تحلیل ہونے لگتا ہے جس کے ساتھ ہی جسمانی درجہ حرارت نارمل ہونے لگتا ہے۔ لیکن گرم پانی میں ڈوبے ہوئے جسم سے پسینہ نہیں نکل پاتا اور اوپری شریانوں کا خون ٹھنڈا ہونے کے بجائے مزید گرم ہوجاتا ہے۔ یہ گرم خون جب جسم کے دوسرے حصوں میں گہرائی تک پہنچتا ہے تب وہ پورے جسم کو مزید گرم کردیتا ہے۔ اگر گرم پانی کا درجہ حرارت 104° فارن ہائیٹ تھا تو 20 منٹ کے اندر جسم کا مجموعی درجۂ حرارت 102° فارن ہائیٹ ہوجاتا ہے۔

گرم پانی میں لیٹنے والے تصدیق کریں گے کہ کچھ دیر بعد ہی بے حد راحت اور سکون کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرم خون جسم کی شریانوں میں لگاتار گردش کرتا رہتا ہے اور اس کی بڑھی ہوئی حرارت شریانوں کو پھیلا کر چوڑا کردیتی ہے جس کے سبب دوران خون زیادہ آسانی اور بغیر کسی رکاوٹ کے ہونے لگتا ہے اس کی وجہ سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر ایک بار پھر نیچے آجاتا ہے۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن اگر جسم کا کوئی عضلہ کبھی کسی تناؤ کا شکار ہوجائے تو وہ اپنے اندر موجود نسوں (Newes) اور رگوں (Blood Vessels) پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ رگوں کے اندر دوران خون میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ عضلے کو اتنی مقدار میں آکسیجن مہیا کرنے میں ناکام ہوتا ہے جتنی کہ مہیا کرنا چاہیے جس سے عضلے میں گھٹن اور درد کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ نسوں پر دباؤ پڑنے سے درد اور تکلیف میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس طرح عضلے میں تکلیف اور ناخوشگواری کا احساس بڑھ جاتا ہے لیکن جیسے ہی وہ عضلہ گرم پانی کے اندر جاتا ہے الٹا عمل شروع ہوجاتا ہے اور اسے راحت اور طمانیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ گرم پانی رگوں کو کھولتا ہے اور ان میں رکاوٹ دور ہونے سے دوران خون تیز ہوجاتا ہے جس کے زیر اثر عضلے کو آکسیجن کی خاطر خواہ فراہمی بحال ہوجاتی ہے۔ نسوں پر دباؤ جیسے جیسے کم ہوتا ہے ویسے ویسے درد اور تکلیف میں افاقہ ہونے لگتا ہے اور عضلے میں راحت اور خوشگواری کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ اگر طبی زبان میں بات کریں تو جب کوئی عضلہ تناؤ سے آزاد ہوتا ہے تو اس کے مختلف ریشوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہوجاتا ہے اور اس طرح خون کی رگوں کو خون کی ضروری مقدار وہاں پہنچانے میں بالکل دقت نہیں ہوتی۔ جسمانی تحول کے نتیجے میں عضلے کے اندر جو بھی زہریلے فاضل مادّے جیسے لیکٹک ایسڈ وغیرہ پیدا ہوجاتے ہیں خون انھیں باہر نکال کر ان کی جگہ تازہ آکسیجن اور غذا سے حاصل کیے ہوئے تغذیات وہاں پہنچا دیتا ہے جس کے ساتھ ہی عضلہ راحت اور خوشگواری کا احساس کرنے لگتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اگر گرم پانی میں جسم کو ڈبونے کے ساتھ ساتھ عضلات کی تھوڑی ورزش اور مساج بھی کرلیا جائے تو نتائج اور بھی بہتر اور دیرپا ہوتے ہیں۔ واٹر تھیراپی کا یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے بہت کارآمد ہے جو عموماً ایک جگہ بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا یا پھر کمپیوٹر وغیرہ پر کام کرتے ہیں اور جس کے باعث ان کی گردن، کمر یا ہاتھوں پیروں کے حصوں میں عضلات اکڑ جاتے ہیں۔ ■

Shamsul Islam Farooqui , 90-B, Ahata Talib, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 25

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی شاہی شادیاں

محمد قمر عالم

ہندوستان اور ایران کے درمیان تعلقات صدیوں سے استوار ہیں۔ دونوں ممالک لسانی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے کے بے حد قریبی رہے ہیں۔ آریہ النسل ہونے کے ساتھ ساتھ بود و باش، زبان و ادب اور رسم و رواج کی یکسانیت بھی قربت کی اہم وجہ رہی ہے۔ فارسی زبان مذہب اسلام کے ورود اور مسلم فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور اسی وقت سے ہندوستانی تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہونے لگی۔ جلد ہی اس نے اپنی شیرینی، لطافت، لذت اور دلکشی کی بدولت ہندوستانی تہذیب و تمدن اور سیاسی و ادبی تاریخ کو اپنے اندر پورے طور پر جذب کرلیا۔

ایران سے شعرا، ادبا، صوفیا، امرا اور شرفا نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا جس کے سبب دونوں ممالک میں باہمی تعلقات کے نئے راستے ہموار ہوئے۔ ایرانی چونکہ اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے تعلق سے بے حد متعصب واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کے باوجود اپنی تہذیب اور ثقافت کا مکمل تحفظ کیا جس کے نتیجے میں اس کے اثرات ہندوستانی تہذیب پر بھی مرتب ہوئے۔ یہی وجہ رہی کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آداب و رسومات، کھان پان وغیرہ اور زندگی کے تمام شعبوں پر فارسی زبان و ادب اور ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات نمودار ہوتے چلے گئے اور جلد ہی ہندوستانی عوام نے ان اثرات کو قبول کر کے اپنی زندگی میں شامل کرلیا۔

مغلیہ عہد حکومت میں روابط ہند و ایران عروج پر تھے۔ مغل حکمرانوں کے ذریعے ایرانی شعرا و ادبا کی سرپرستی کی بدولت ہندوستانی دانشمند طبقے اور عوامی زندگی کو بھی فارسی زبان و ادب نے خاصا متاثر کیا۔ ہندوستانی امرا اور دربار کے بڑے بڑے عہدہ دار ایرانی لباس پہنتے، فارسی زبان بولتے اور فارسی شاعری سے مکمل طور پر لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں تہذیبوں کا مرکب یہاں کے فن تعمیر، فن مصوری، فن موسیقی اور فن شاعری میں رچ بس گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں شادی بیاہ کی رسموں پر بھی فارسی زبان کے اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ فارسی شعرا نے ان رسومات کو شعری خاکہ عطا کیا جس کی وجہ سے بہت سی اہم فارسی تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ ان ہی میں سے ایک اہم نام 'مثنوی درعروسی فرخ سیر' کا بھی ہے۔

مثنوی 'درعروسی فرخ سیر' کو میر عبدالجلیل بلگرامی نے بادشاہ فرخ سیر کی شادی (جو کہ 15-1714 میں ہوئی تھی) کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اس مثنوی میں بلگرامی نے اٹھارہویں صدی کی شاہی شادی کی رسومات کا مکمل خاکہ بڑی حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شادی کی مختلف رسومات جیسے شادی کے جوڑے، کھانے، آتش بازی، موسیقی، رقص، روشنی وغیرہ کو بڑے سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ قلم بند کیا جس کی بدولت یہ مثنوی میر عبدالجلیل کے علم و فضل کا بہترین نمونہ ثابت ہوتی ہے۔

مثنوی کے بارے میں تفصیلات پیش کرنے سے پہلے میر عبدالجلیل کے مختصراً حالات زندگی رقم کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میر عبدالجلیل 1661 میں بلگرام میں پیدا ہوئے اور 1725 میں دہلی میں وفات پائی۔ والد کا نام میر احمد تھا۔ میر صاحب ایک دانشور شاعر اور انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر علم موسیقی، علم عروض و فنِ شعر بھی تھے۔ عربی، فارسی، ہندی اور ترکی زبان پر کامل دسترس تھی۔ ان کی سیادت اور علمی فضیلت کی بدولت امراء وقت بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

میر عبدالجلیل کثیر التصانیف شخص تھے۔ آپ نے فارسی زبان میں کئی اہم مثنویاں لکھیں جن میں مثنوی امواج الخیال، مثنوی درعروسی فرخ سیر، مثنوی درعروسی ارشد خاں، میر کے نوکر کی وفات پر بھی ایک مثنوی قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ میر عبدالجلیل نے خواہر الکلام کے نام سے عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان کی منظوم لغت بھی مرتب کی تھی۔ ان کی نثری تصانیف میں انشائے جلیل، رسالہ تعذیب، رسالہ موسیقی، انشائے عقد الشمیں، خلاصۃ السیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(پروفیسر نورالحسن انصاری، فارسی ادب بعہد اورنگ زیب)

'مثنوی درعروسی فرخ سیر' مغلوں کی شادی بیاہ کے مختلف رسومات پر لکھی گئی میر عبدالجلیل بلگرامی کی ایک اہم و نادر تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے ذریعے مغلیہ دور کے رسم و رواج، شاہی کھانے، شاہی شادی کے لباس، آتش بازی، موسیقی رقص، ہندی سازوں کے زیر و بم، تحفے تحائف وغیرہ سے مکمل طور پر آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ مثنوی در اصل ایک سماجی دستاویز کی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ مثنوی 'درعروسی فرخ سیر' اپنی ادبیت، صنائع، اور سماجی اہمیت کی بنا پر ہندوستان کی فارسی مثنویوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے سات قلمی نسخے مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہیں جنھیں تصحیح و تدوین کرکے استاذی المحترم پروفیسر آزرمیدخت صفوی کی دعاؤں اور راقم کی کوششوں سے 2012 میں مرکز تحقیق فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا جاچکا ہے۔

مثنوی کے عنوانات اس طرح سے ہیں: تعین کردن فوج بر راجا اجیت سنگھ و آوردن دخترش، آغاز داستان کدخدائی، رنگ آمیزی ساچق، گل افشانی حنا، نور پاشی و روشنی برات، گل ریزی پوشاک و آب داری جواہر، تذئیل، جواہر ریزی نثار، سپند سوزی مجمر، طلوع بدر شب برات از سپہر تخت رواں، کردیدن چتر بر فرق مبارک، رعد انگیزی نقار خانہ، جلوہ ریزی امیران، طمطراق چوبداران، رشحہ بیزی سقایان نخل بندی آئین، شکوہ آرای فیلان، برق جولانی اسپان، ہوا پیمائی جلو داران، شعلہ پردازی آتش بازی، تحریر مقام نغمہ، گرم افروزی رقص، ہنگامہ سازی ہزالان، حقہ بازی شب بازان، رسیدن شاہ بمشک بوی عروس و بجا آوردن رسوم، آوردن شاہ عروس را بدولت خانہ، لذت بخشی ولیمہ، سرخروی قلم در وصف پان و آخر میں خاتمہ۔

مثنوی کا آغاز بسم اللہ سے کرنے کے بعد میر عبدالجلیل

نے تمہید کے طور پر نہایت عمدہ بہاریہ اشعار کو پیش کیا ہے:

بہاری کرد گل عالم چمن شد
شگفتن عام در ہر انجمن شد
زمین را مژدہ نوروز دادند
فلک را جامہ زردوز دادند
چمن زین مژدہ دامن بر میان زد
ز گل طبل بشارت در جہان زد

(مثنوی در عروسی فرخ سیر، مقدمہ و تصحیح محمد قمر عالم، ص 33)

بہاریہ اشعار پیش کرنے کے بعد بلگرامی صاحب نے بادشاہ فرخ سیر کی مدح و توصیف بڑی شاعرانہ خوبی کے ساتھ کی ہے۔ بادشاہ کی مدح و ثنا میں بڑے پر جوش اور ماہرانہ اشعار کو پیش کرتے ہیں۔ مثنوی لکھنے کا مقصد بتاتے ہیں کہ میں نے بادشاہی سعادت و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ قیمتی اور اہم مثنوی تخلیق کی ہے۔ کہتے ہیں:

ز بحر وصف شاہنشاہِ والا — جواہر جوش کردم مثنوی را
ز ہر مصرع مبہ شکستم — سخن را سلک مروارید بستم
مرا بس خلعت تحسین شاہی — کہ باشم در سخن سنجان مباہی
بہ تحسین شہنشاہ سخن سنج — سخن گردد گہر معنی شود گنج

(ایضاً، ص 73)

تمہید اور مدح کے بعد میر عبدالجلیل اس شادی کے ہونے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ یہ شادی راجہ اجیت سنگھ کی بغاوت کے سبب وجود میں آئی۔ جب راجہ اجیت سنگھ نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تو بادشاہ فرخ سیر نے اس کو شکست دینے کے لیے 'سید حسین علی خاں' کی قیادت میں ایک فوج تیار کر کے جنگ کے لیے روانہ کی تھی۔ اس جنگ میں اجیت سنگھ کی شکست ہوئی۔ ہارنے کے بعد اس نے بادشاہ کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی تجویز پیش کی۔ فرخ سیر نے اس کی اس خواہش کو قبول کر لیا۔

مثنوی میں میر عبدالجلیل نے راجہ اجیت سنگھ کی تعریف بھی کی ہے۔ اجیت سنگھ ہندوستان کا عظیم بادشاہ ہے جس کی ملکیت سندھ تک پھیلی ہوئی ہے۔ راجہ کی قوم راٹھور ہے جو ہندوستان کی دیگر قوموں سے ممتاز ہے، اس کا نام راجہ اجیت سنگھ ہے۔ کہتے ہیں:

رئیس راجہای عمدۂ ہند
کہ ملکش می کشد تا کشور سند
رشید دودمان نسل راٹھور
کہ ممتاز است از اقران درین دور

(ایضاً، ص 48)

جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد شادی کی تیاریوں کا آغاز ہوتا ہے۔ کدخدائی یعنی شادی سے پہلے کی تیاریوں کی شروعات ہوتی ہے۔ شاہی محل میں سب لوگوں کو شادی کی تیاریوں کا آغاز کرنے کا حکم سنایا جاتا ہے۔ شادی کا سارا سامان مہیا کرنے کے لیے خزانوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ چاندی اور زرباف کے دھاگوں سے بنے عمدہ عمدہ لباس دلہن کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ عطر اور مشک سے ان کو معطر کیا جاتا ہے۔ اس وقت شادی میں رائج تمام چیزوں کو بادشاہ کے حکم سے مہیا کرایا جاتا ہے:

پس آنکہ شد پی شانِ عروسی
بحکم شاہ سامانِ عروسی
در گنج و خزائن باز کردند
کہ سامانِ عروسی ساز کردند

(ایضاً، ص 55)

آگے کہتے ہیں:

ز ہر جنسی کہ آن باب عروسی است
بزیر سقف و چرخ آبنوسی است
بحکم شاہ در سرکار والا
مہیا شد مہیا شد مہیا

(ایضاً، ص 56)

ساچق کی رسم کو بیان کرتے ہوئے بلگرامی صاحب فرماتے ہیں۔ ساچقی کے لیے سامان اکٹھا کیا جاتا ہے۔ طرح طرح کے سوکھے پھل اور لذیذ میووں سے گھڑے اور دوسرے برتن بھرے ہوئے ہیں جو کسی انسان کے خیال میں اس سے بہتر آ بھی نہیں سکتا ہے۔

معلّی ساچقی کردند سامان
کہ عشرت ریخت دلرا گل بدامان
ز اقسام نفایس آنچہ باید
ز انواع ظرایف ہر چہ شاید
ز نقل نور و اقسام فواکہ
کہ ناید در خیال کس از آن بہ

(ایضاً، ص 56)

میر عبدالجلیل مہندی کی رسم کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنی بات کو بھی مہندی کی طرح رنگین بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:

بگلزار حنا بندی در آہم
سخن راچون حنا رنگین نمایم
بہ تحریر حنائی کدخدائی
ورق چون صفحۂ گل شد حنائی
بہ زیبائی عروسی و شاہ کشتند
بہ نوبت ہچو شاخ گل حنا بند

(ایضاً، ص 57)

شادی میں مہندی کی رسومات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ دولہا، دلہن کے ہاتھوں پر مہندی لگانے سے موتیوں کی سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہتھیلیوں اور انگلیوں کو مہندی سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ انگلیوں پر مہندی کی خوبصورتی لعل بدخشاں سے بھی زیادہ چمک دار نظر آتی ہے۔ مہندی اور ساچق کی رسومات سے فارغ ہونے کے بعد میر عبدالجلیل روشنی چراغاں اور نور باشی جیسی رسموں کو نہایت سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔

شادی کی یہ رات نہایت حسین اور پُر نور نظر آ رہی ہے۔ یہ رات صبح سعادت سے بھی زیادہ روشن اور عبادت گزار و پرہیزگار دلوں سے بھی زیادہ پاک، صاف و شفاف نظر معلوم ہوتی ہے۔ ہزاروں شمع روشن ہیں ہر طرف روشنی ہی روشنی چھائی ہوئی ہے جن کی وجہ سے سارا عالم منور ہو رہا ہے۔ قندیلیں، بلوریں، جلی چراغ کے سبب محفل میں ہر طرف آرائش افزا ہے۔ ستاروں کا ایک ہجوم بھی ان تمام رنگینیوں کو دیکھنے کے لیے حاضر ہے۔ چاند کی طرح چمکتی ہوئی ہزاروں مشعلیں راستے اور گلیوں کو منور کر رہی ہیں۔ ہر طرف اس قدر چراغاں ہے کہ تمام در و دیوار سے نور کی تجلی جوشیں مار رہی ہے۔

ان تمام رسومات کو پیش کرنے کے بعد میر عبدالجلیل اب بادشاہ فرخ سیر کے دولہا بننے کی رسومات کا بیان

کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ دنیا کے تمام بادشاہوں سے افضل نیک جوان ہے۔ اب وہ اپنی بارات کی تیاری میں مکمل طور پر خوش وخرم نظر آ رہا ہے۔ بادشاہ کو دولہا بنانے کا وقت آ گیا ہے۔ دولہے کی آرائش کے تمام ساز وسامان مہیا کیے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے دولہے کے لیے اس کی پوشاک پیش کی جاتی ہے جس کی دلکشی اور خوبصورتی کا یہ عالم ہے کہ گلشن بھی اس سے گلریز ہو جائے:

شہنشاہ جہان بخش جوان بخت
کہ چون خورشید دارد از فلک تخت
طلب فرمود پوشاک دل آویز
کہ گلشن از بہارش گشتہ گلریز

(ایضاً، ص 61)

دولہے کو پوشاک پہنانے کے بعد ایک خوبصورت مرصع کمر بند جو کہ 'جوزا' ستارے سے بھی زیادہ چمکدار ہے بادشاہ کو باندھا جاتا ہے۔ شاہی زینت کے لیے اس کے ہاتھ میں خنجر بھی دیا جاتا ہے۔ خوبصورت بازو بند باندھا جاتا ہے۔ ہیرے جواہرات لگی ہوئی خوبصورت کلغی دولہے کے سر پر پہنائی جاتی ہے۔ خورشید سے بھی زیادہ چمکدار اور روشن 'جعبہ' بادشاہ کو سعادت بخش رہا ہے۔ درخشاں خوبصورت سہرہ بادشاہ کو باندھا جاتا ہے۔ سہرے کی خوبصورتی کو میر عبدالجلیل نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

درخشاں سہرہ بر سر شاہ بستند   کہ حسرت در دل انجم شکستند
عیان از سہرہ نور ارتفاعی   چو از مہر فلک خط شعاعی
شہنشہ ابر رحمت بود باران   ز سہرہ سلک مروارید باران
بغیر از سہرۂ شہ کی کسی دید   کہ انجم کرد جا بر روی خورشید

(ایضاً، ص 70)

میر عبدالجلیل بارات کا منظر بڑی دلچسپی اور خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ بارات کے جلوس میں تمام وزرا اور اعلیٰ منصب دار شامل ہیں۔ سب کے دل خوشیوں سے جوش مار رہے ہیں۔ لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ میر صاحب بادشاہ کو ماہ سے اور امیروں کو ستاروں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بارات کی روانگی کے ساتھ ساتھ گوہر وموتیوں کو دولہے پر نثار کیا جا رہا ہے۔ اس کے اوپر قیمتی جواہر سے بارش کی جا رہی ہے۔ اس قدر موتی لٹائے جاتے ہیں کہ زمین تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کی مانند ہو گئی ہے۔ نقار خانے سے خوشیوں کی آواز اٹھنے لگتی ہے اور ہر طرف گونجنے لگتی ہیں۔ برات کے آگے آگے چوبداران اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ہوئے 'دور باش وپیش شو پیش' کی آوازیں لگاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم ستاروں سے بھی زیادہ ہو گیا ہے جس کو یہ چوبدار قابو میں کیے ہوئے ہیں۔ ہر طرف پھولوں کی بارش ہوتی جا رہی ہے۔ رنگین قسم کے تر وتازہ پھولوں کی بارش کی جا رہی ہے۔ سقّے آب پاشی کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے بغل میں پانی بھری ہوئی مشک دبی ہوئی ہے جس کے ذریعے وہ اس پانی کو زمین پر چھڑکتے ہوئے چل رہے ہیں۔ ان کے آب پاشی کرنے سے زمین نے بھی زیور عروسی حاصل کر لیا ہے۔ در ودیوار بھی گلزار ہو گئے ہیں اور شہر کی فضا خوشگوار ہو گئی ہے۔ ہاتھیوں کی ایک قطار بھی آگے آگے چل رہی ہے۔ سارے ہاتھی خوشی سے جھوم رہے ہیں ان کی سونڈوں کو بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ نسل کے خوبصورت گھوڑے بھی شامل ہیں۔ گھوڑے خوشی سے ناچتے ہوئے تماشے دکھا رہے ہیں۔ جلوداران ہوا پیائی کرتے ہوئے ناچتے گھومتے ہوئے بارات کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ آتش بازی بھی خوب کی جا رہی ہے۔ میر بلگرامی صاحب آتش بازی کا بڑا حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ جب یہ آتش بازی کی جاتی ہے تو زمین یکسر چمکدار ہو جاتی ہے۔ میر عبدالجلیل آتش بازی میں استعمال ہونے والے مختلف قسم کے انار دانوں کا نام استعمال کرتے ہیں مثلاً انار دانہ، چرخی، پھولجڑی، پہوناس، ہتھ نال، ہل باروٹ وغیرہ۔

بارات دلہن کے گھر پہنچنے کے بعد ایک بڑی حسین محفل کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں باراتیوں کی خاطر داری کے لیے طرح طرح کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ قسم قسم کے کھانوں، ناچ گانوں سے محفل سجی ہوئی ہے۔ موسیقی کا ماحول بنا ہوا ہے۔ شاعر نے موسیقی کے بیان میں اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ وہ خود فن موسیقی سے آشنائی رکھتے تھے اس لیے نہ صرف مختلف سازوں کے زیر وبم کو شاعرانہ نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے ساتھ ہی تمام ہندی راگوں کے نام بھی بتا دیے ہیں۔ مثلاً دستان، تالان، سُر ترنم، امست کا مود، رام کلید، داس سری راگ، کت راگ وغیرہ۔ ان نغموں سے جو راگ نکل رہے ہیں انھوں نے دل سے چین اور عقل سے ہوش کو اڑا دیا ہے۔ موسیقی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: موسیقی کے بارہ مقام ہیں جس کے 24 شعبے ہیں اور ترتیب کے ساتھ ہر مقام سے دو شعبہ اٹھتے ہیں۔ ایک پستی سے اور دوسرا بلندی سے۔ اس کے بعد موسیقی کے دوسرے فن کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 36 آوازوں میں ترکیب کے ساتھ ہر کسی میں سے دو مقام نکل رہے ہیں:

ز موج نغمہ قوال ہنرمند   کمندی بر حصار چرخ افگند
ز شوق نغمہ جان پرور ھند   عراق آید بسیر کشور ھند
چہ خوش روئی عراق از نغمہ خوب   مغنی کرد عقل و ہوش مغلوب
بزرگ و کوچک از آہنگ محظوظ   سر انگشت نوا از چنگ محظوظ

(ایضاً، ص 113-112)

بزم رقص میں پوری گرم جوشی نظر آ رہی ہے۔ طوائفوں کے ذریعے طرح طرح کا رقص پیش کیا جا رہا ہے۔ طوائفوں کی تعریف کرتے ہوئے بلگرامی صاحب ان کے لباس اور خوبصورتی کو بڑے دلکش انداز سے پیش کرتے ہیں۔ طوائف کار چوبی کے خوبصورت لباس پہنے ہوئے رقص کر رہی ہیں۔ ان کی جبینیں صبح عشرت انگیز کی مانند، خم ابرو نوک دستہ تیز کی طرح ہے۔ ان کے ابروؤں سے عید قربان کی مبارکباد ہو رہی ہے۔ ہزالان اور حقہ بازان کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

بارات کی محفل کی تمام رعنائیوں کو پیش کرنے کے بعد میر عبدالجلیل دلہن کی رخصتی کا دلفریب منظر بڑی صلاحیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اب دولہا دلہن کو لے کر اپنے دولت خانہ میں آ جاتا ہے۔ یہ رات خوبصورت اور حسین ہوتی چلی جاتی ہے۔ زمین اور آسمان تہنیت کے پھول برسا رہے ہیں۔ میر عبدالجلیل نے دعوت ولیمہ کے منظر کا بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے:

چو در زیر سپہر آبنوسی   ولیمہ سنت آمد در عروسی
بحکم شاہ شیلانی کشیدند   چہ شیلانی فراوانی کشیدند

(ایضاً، ص 152)

دعوت میں طرح طرح کے کھانے موجود ہیں۔ ہر طرف خوشی ومسرت چھائی ہوئی ہے۔ لوگ آتے جا رہے ہیں اور شاہی کھانوں سے اپنے شکم کو سیر کر رہے ہیں۔ دعوت میں موجود کھانوں کا ذکر کرتے ہوئے میر عبدالجلیل نے مختلف قسم کے پکوانوں کے نام استعمال کیے ہیں۔ مثلاً کئی قسم کے پلاؤ، شاہی کباب، سنبوسہ، پنیر، طرح طرح کی سبزی، مربا، نان تفتان، حلوا ہای عنبر بوی وخوش رنگ، شربتہای شیریں وغیرہ۔ ان تمام کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ گرم جوشی پان کی محفل میں نظر آ رہی ہے۔ شاعر نے پان کی تعریف وتوصیف میں عمدہ اشعار پیش کیے ہیں۔ اپنی بات کو پان کی تعریف کرنے سے سرخ کرتے ہیں۔ مثنوی کے آخر میں میر عبدالجلیل بادشاہ کے لیے دعائیہ اشعار پیش کرتے ہیں۔ بادشاہ کی سلامتی، اس کی کامیابی وکامرانی کی دعا مانگتے ہیں۔

■

Mohd Qamar Alam
Dept of Persian, AMU, Aligarh - 202001 (UP)

سنیما اور شہر

شائستہ فاخری

''سنیما کیا ہے، یہ معلوم نہیں لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ ناٹکیہ ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ چترا تمک ہے، یہ سنگیت ہے، یہ ساہتیک ہے۔ تو یہ چیز باہر رکھو۔ شاید جو بچا کھچا ہے، وہ سنیما ہے''

مشہور فلم میکر منی کول نے سنیما کو کچھ اس طرح سمجھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنیما میں کچھ حد تک ڈراما بھی ہے اور فنّی باریکیاں بھی جس میں سبجیکٹ، ڈائلاگ، منظر، ٹریٹمنٹ کے ساتھ سنیماٹوگرافی، بیک گراؤنڈ اسکور، اسٹلس اور کیمرہ ورک شامل ہے۔ یہ سب مل کر ایک اچھی اسکرپٹ کی تخلیق کرتے ہیں۔ فکشن کی ایسی اڑان جس کی جڑیں زمینی ہیں۔ اس میں موسیقی بھی ہے ادب بھی۔

'نیو ویو سنیما' جو ایک تحریک کی شکل میں ابھرا تھا اس نے ادب کو سنیما کے برابر رکھا اور یہ مانا کہ موجودہ عہد اور معاشرے کے حالات کی حقیقت نگاری کے لیے لازمی ہے کہ دونوں میں تال میل ہو۔

اسے لازمی مانا جائے یا نہیں، یہ بحث کا ایک الگ موضوع ہے مگر اس سچ سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ادب اگر معاشرے کا آئینہ ہے تو سنیما بھی معاشرے کا عکس ہے۔ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے یا ہونے کے امکانات ہیں انھیں فلم میکر روپہلے پردے پر دکھانے کی ذمے داری نبھاتے ہیں۔

اس پس منظر میں ہم شہر کو بھی سنیما میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ فلمی صنعت میں ایسی سیکڑوں فلمیں بنی ہیں جن میں خاص شہر اور وہاں کی تہذیب، بول چال، کھان پان، لباس، اس مخصوص شہر کی وضعداری، زندگی کو برتنے کا نظریہ، کھیل کود، زبان و کلام پر کیمرے کا فوکس دیا گیا ہے۔ سیلولائڈ کی روشنی میں کئی ایسے شہر ہیں، جو چمکے ہیں۔ جیسے ممبئی، کولکاتا، دلّی کے بعد اب فلم میکر کی نگاہ چھوٹے شہروں اور قصبوں پر بھی پڑنے لگی ہے، جو سنیما کے لیے ایک مثبت احساس دیتا ہے۔

سنہ 1947 کے پہلے برطانوی عہد میں کلکتہ تجارتی اور ادبی طور پر ایک بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ جو شہر جس دور میں اپنے پورے فوکس پر ہوتا ہے، وجہ چاہے ادبی ہو، تجارتی ہو، تہذیبی ہو یا کسی خاص حادثے یا واقعے کی وجہ سے ہو، اس شہر کے تئیں تخلیق کار بھی اور فلم میکر بھی اپنے بڑھتے رجحان کو نہیں روک پاتے۔ اپنے شردعاتی دور میں زیادہ تر فلمیں اور ان کے گانے کلکتہ شہر میں فلمائے گئے۔ فلم کی کہانی اور ڈائلاگ بنگلہ تہذیب کو مرکز میں رکھ کر لکھے گئے۔

غبن، دو بیگھا زمین جیسی فلمیں کلکتہ شہر کو نظر میں رکھ کر ہی بنائی گئی تھیں۔ گانوں میں بھی کلکتہ شہر کا استعمال خوب خوب ہوتا تھا، جیسے ''لاگا جھلنیا میں دھکّا بلم کلکتہ پہنچ گئے'' یا ''بھوجی کی جھلنی ہرائی سرپتوا میں، بھیا مجوا اڑائے کلکتہ میں''۔

سنہ 1907 میں جے ایس مدان نے کلکتہ شہر میں دیش کا پہلا سنیما ہال 'الفنسٹن پکچر پیلس' کھولا۔ سنہ 1937 میں بھارت کی پہلی رنگین فلم 'کسان کنیا' بنی جس کی اسکرپٹ اور مکالمہ سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا۔ سنہ 1969 میں بنی فلم 'اس کی روٹی' بھارتیہ فلم کی تکنیک میں بدلاؤ کے نظریے سے ایک اہم فلم مانی گئی۔

کلکتہ شہر کے تہذیبی پس منظر کو مرکز بنا کر تیار کی گئی

ایک اور فلم 'ہاوڑہ برج' سنہ 1958 میں شری شکتی فلم کے بینر تلے بنائی گئی تھی، جس کا ایک گانا 'میرا نام چن چن چو' آج بھی اولڈ گولڈن سانگ میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔ قمر جلالی کے لکھے اس گانے کو اپنی آواز کے جادو سے جگایا تھا گیتا دت نے اور اسے موسیقی سے سنوارا تھا او پی نیر نے۔

فلم چاہے آرٹسٹک بنی ہو یا تفریح کے لیے، ہلکا پھلکا موضوع اٹھایا گیا ہو، رومانی فلمیں ہوں یا پھر کسی خاص مقصد کو لے کر بنائی جا رہی ہوں، منظر پس منظر میں انھیں موضوعات کو اٹھاتی ہیں جن کا تعلق سیدھے طور پر عام لوگوں کی زندگی سے جڑا ہوتا ہے، بات چاہے شہر کی ہو، قصبے کی ہو، کسی خاص معاشرے یا تہذیب سے جڑی ہو یا پھر اس کے تار آج کی موجودہ زندگی کے مسائل سے جڑے ہوں، سنیما میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے اس کا رشتہ کسی نہ کسی زمین سے جڑا ہوتا ہے اور یہ زمین زیادہ تر کسی شہر کا ٹکڑا ہی ہوتی ہے۔

کلکتہ شہر کے بعد فلمی صنعت کی پہلی پسند بمبئی شہر رہا ہے۔ لگ بھگ 70% فلمیں آج کی ممبئی کی فضا کو ذہن میں رکھ کر بنائی جا رہی ہیں۔ عام زبان میں اس شہر کا نام ہی 'فلم نگری' رکھ دیا گیا۔

سنہ 1960 میں مایا فلمس کے بینر تلے بنی فلم 'بمبئی کا بابو' اپنے وقت میں سپر ہٹ رہی۔ اس فلم کا ایک گانا جسے مجروح سلطانپوری نے لکھا تھا کافی مشہور ہوا۔ اس کے بول تھے 'دیوانہ مستانہ ہوا دل جانے کہاں ہو کے بہار آئی' کو ایس ڈی برمن کی موسیقی، محمد رفیع آشا بھونسلے کی آواز نے چار چاند لگا یا تھا۔

ممبئی شہر کی تیز رفتاری پر ایک اور فلم بنی 'بابے'۔ 'کہنا ہی کیا یہ نین ایک انجان سے جو ملے، چلنے لگے محبت کے جیسے یہ سلسلے' فلم کو کامیاب بنانے میں جہاں اس کا موضوع، ٹریٹمنٹ اور اداکاری بے حد اہم تھی، وہیں چترا کے گائے اس گانے نے فلم دیکھنے والوں کو اپنی کشش میں باندھ لیا تھا۔

سنہ 2007 میں ممبئی شہر پر ایک اور فلم بنی 'بابے ٹو بینک کاک'۔ یہ فلم مکتا سرچ لائٹ فلمس کے بینر تلے بنی تھی۔ مگر اس سے بہت پہلے سنہ 1972 میں محبوب پروڈکشن اس طرح کی ایک فلم بنا چکا تھا 'بابے ٹو گوا' جس کا مشہور گانا 'او مہکی مہکی ٹھنڈی ہوا یہ بتا، میرے یار کی گلی کا کیا تجھ کو ہے پتہ، ملنا ہے یار سے تو جا بابے ٹو گوا' یہ گانا تو محض فلم کی چاشنی تھی مگر سچائی یہ ہے کہ ایک لمبا دور ایسی فلموں کا رہا جس میں بابے شہر کو، وہاں کی زندگی کے مسائل

وقت کا بدلاؤ اپنے ساتھ بہت سی تبدیلیوں کو لے کر آتا ہے اور یہی تبدیلیاں شہر کا فوکس بھی بدلتی رہتی ہیں۔ نوابی سلطنت میں ایک طرف نظام حیدرآبادی تھے تو دوسری طرف لکھنؤ اور اودھ نوابوں کی شان سمجھے جاتے تھے ۔ ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب ان شہروں کی تہذیب پر بنی فلموں کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں لوگ لائن میں کھڑے رہتے تھے ، ٹکٹ بلیک میں بک جاتے تھے۔ چودھویں کا چاند، میرے محبوب، میرے حضور، پالکی، امراؤ جان جیسی فلمیں کیا کبھی بھلائی جا سکتی ہیں !

کو یا پھر وہاں کے تناؤ اور الجھنوں کو فلم کا سبجیکٹ بنایا گیا۔

'بابے ٹو گوا' نام سے چند برس پہلے ایک فلم آئی تھی، جس میں لیڈنگ رول کیا تھا راجو شریواستو نے۔ یہ ایک کامیڈی فلم تھی جسے دیکھنے والوں نے پسند کیا کیونکہ اس کا ٹریٹمنٹ ہنسنے گدگدانے والا تھا۔

اس کے علاوہ بھی ایسی بے شمار فلمیں ہیں جو ممبئی شہر کی جاگتی تصویر کو پیش کرتی ہیں۔

کلکتہ، ممبئی کے بعد اگر کوئی شہر فلم میکرس کو سب سے زیادہ متوجہ کرتا ہے تو وہ ہے دلّی۔ سنہ 2009 میں 'دہلی -6' نام کی فلم یو ٹی وی موشن پکچرس کے بینر تلے بنی جس میں لیڈنگ رول ابھیشیک بچن اور سونم کپور کا تھا۔

دلّی شہر کی گلیاں، وہاں کی چوڑی سڑکیں، گھروں کی ملی جلی تہذیب، لب و لہجہ، وہاں کی دلداری فلم بینوں کو خوب خوب بھاتی ہے۔

شہر کی زمین پر بنی فلمی اسکرپٹ میں فوک کا رنگ ایک جادوئی احساس جگا دیتا ہے۔ آج کا سنیما اس معانی میں بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ فوک موسیقی کو فلموں کے ذریعے ایک بار پھر زندہ کر رہا ہے۔ 'دہلی-6' میں ہی ریکھا بھاردواج کا گایا لوک موسیقی پر مبنی گانا 'سیاں چھوڑ دیوے، نند چٹکی لیوے، سسرال گیندا پھول، ساس گاری دیوے، دیور جی سمجھا دیوے، سسرال گیندا پھول' اس فلم کا سب سے ہٹ گانا رہا۔ اسے پرسون جوشی نے لکھا تھا، موسیقی دی تھی اے آر رحمان اور رجت ڈھولکیا نے۔

اکثر شہر کو لے کر محاورے بھی گڑھے گئے ہیں حالانکہ ان محاوروں کا بھی اپنا ایک تاریخی پس منظر ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد دلّی شہر جب سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا تو نہ صرف دانشوروں نے بلکہ فلم میکرس نے بھی اپنا فوکس اس شہر پر کیا۔

سنہ 1957 میں آر کے بینر تلے بنی فلم تھی 'اب دلّی دور نہیں'۔ یہاں تو محاورے کو فلم کا عنوان بنایا گیا۔ اس فلم کا مشہور گانا تھا 'یہ چمن ہمارا اپنا ہے، اس دیش پر اپنا راج ہے، مت کہو کہ سر پر ٹوپی ہے، کہو سر پر ہمارے تاج ہے' شیلندر کے لکھے اس گیت کو آواز دی تھی آشا بھوسلے نے اور موسیقی تھی شنکر جے کشن کی۔ فلم کے اس گانے میں، دلی شہر میں اس وقت جو سیاسی ہل چل تھی اس کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔

سنہ 2008 میں وارنر بردرس پکچرس کے بینر نے ایک فلم بنائی 'چاندنی چوک ٹو چائنا'۔ اس فلم کی کہانی بھی دلی کے چاندنی چوک سے شروع ہوتی ہے اور چائنا تک پہنچتی ہے۔ اس فلم کے لیڈنگ رول میں تھے اکشے کمار اور دیپکا پادوکون۔

بڑے شہروں مثلاً ممبئی، دہلی، کولکاتہ کو موضوع بناتے

ہوئے بھی کئی فلمیں بنائی گئی ہیں۔

وقت کا بدلاؤ اپنے ساتھ بہت سی تبدیلیوں کو لے کر آتا ہے اور یہی تبدیلیاں شہر کا فوکس بھی بدلتی رہتی ہیں۔ نوابی سلطنت میں ایک طرف نظام حیدرآبادی تھے تو دوسری طرف لکھنؤ اور اودھ نوابوں کی شان سمجھے جاتے تھے۔ ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب ان شہروں کی تہذیب پر بنی فلموں کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں لوگ لائن میں کھڑے رہتے تھے، ٹکٹ بلیک میں بک جاتے تھے۔ چودھویں کا چاند، میرے محبوب، میرے حضور، پاکی، امراؤ جان جیسی فلمیں کیا کبھی بھلائی جاسکتی ہیں!

یہ لکھنؤ کی سرزمیں، یہ رنگ روپ کا چمن، یہ حسن وعشق کا وطن، یہی تو وہ مقام ہے، جہاں اودھ کی شام ہے، جواں جواں حسیں حسیں ... ، گرودت کے بینر تلے بنی فلم 'چودھویں کا چاند'، کے لیے یہ نغمہ لکھا تھا شکیل بدایونی نے، کیا اسے آپ بھول سکتے ہیں! یا پھر میرے حضور فلم کا یہ گانا، رخ سے ذرا نقاب ہٹا دو میرے حضور، جلوہ پھر ایک بار دکھا دو میرے حضور ... اس گانے کو حسرت جے پوری نے لکھا تھا، شکیل بدایونی کا لکھا ایک اور گانا فلم پاکی کا ہے جس میں جمالیات اپنی انتہا پر پہنچی ہوئی ہے، کل رات زندگی سے ملاقات ہوگئی، لب تھرتھرا رہے تھے مگر بات ہوگئی ...

اودھ کے نوابی رنگ کو لے کر بنی فلم 'شطرنج کے کھلاڑی' کو کیا فراموش کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ فلم پریم چند کے افسانے پر بنائی گئی تھی۔ ستیہ جیت رے کی بنائی یہ فلم فلمی صنعت کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

حیدرآبادی معاشرے کے کچھ منفی پہلو کو لے کر بنائی گئی فلم 'بازار' کو کون بھول سکتا ہے، جس میں لڑکیوں کے خرید وفروخت کے مسئلے کو اٹھایا گیا تھا۔ اس فلم میں حیدرآبادی تہذیب، وہاں کے پہناوے، زبان، لب ولہجہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔

'بازار' فلم کے گانے لکھے تھے بشر نواز نے اور خیام نے موسیقی سے ان بولوں کو سنوارا تھا۔ سپریا پاٹھک، سمتا پاٹل، فاروق شیخ اور نصیر الدین شاہ نے اس فلم میں اہم رول ادا کیا تھا۔

بدلتے وقت کے ساتھ فلمی صنعت کا رجحان آہستہ آہستہ چھوٹے شہروں اور قصبوں کی طرف بڑھنے لگا۔

بنارس شہر کی پہچان وہاں کی گلیوں، گھاٹوں اور بولی سے ہوتی ہے۔ بنارسی پان کا نام آتے ہی پان نہ کھانے والے لوگ بھی کھانے کے لیے مچل اٹھتے ہیں۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بنارسی پان کو دور دور تک شہرت دلوانے میں فلموں کا رول اہم رہا ہے۔

'کھئی کے پان بنارس والا' گانا بجتے ہی منھ میں ایک خاص انداز سے چباتے ہوئے پان کی سرخی لیے امیتابھ بچن کی تصویر آنکھوں کے سامنے ناچ اٹھتی ہے۔

سنہ 2006 میں سیتو کریئیشنس کے بینر نے ایک فلم بنائی 'بنارس'۔ بنارس کی پہچان اپنی خاص تہذیب کی وجہ سے تو ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی کلاسیکل موسیقی میں بھی اس کا مضبوط بیک گراؤنڈ رہا ہے۔ بنارس کے گھاٹ، بسم اللہ خاں کی شہنائی کو کیا کبھی فراموش کر پائیں گے۔ 'بنارس' فلم میں ایک کلاسیکل گانا تھا 'باز وبند کھل کھل جائے، کھل کھل جائے مورا جیا گھبرائے'۔ اس گانے کی گہرائی میں اترا جائے تو پرانے بنارس کی ایک خاص خوشبو ہمیں ملے گی جو وہاں کی پرانی تہذیب کے ایک خاص گوشے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

'واٹر' فلم بھی بنارس شہر کے مسائل کو لے کر بنائی گئی تھی۔ حالانکہ ان فلموں سے پہلے ہی 'النکار چتر اپروڈکشن' نے اس شہر پر 'بنارسی بابو' نام کی فلم بنائی تھی۔ اس فلم میں راجیندر کرشن کا لکھا ایک گیت 'ہمارا نام بنارسی بابو' ایک زمانے میں بنارس واسیوں کی پہچان بن گیا تھا۔

کشمیر کی وادیاں، پرکشش فضا، وہاں کا پس منظر پہاڑ، جھرنے جھیل، کشمیری لوگوں کے پہناوے، زبان بولی وغیرہ کو روپہلے پردے پر اتارنے کی کوشش سے فلم میکرس خود کو کیسے بچا سکتے تھے۔

سنہ 1964 میں شکتی فلمس کے بینر تلے 'کشمیر کی کلی' ایک سپر ہٹ فلم بنائی گئی جس میں سری نگر کی ڈل جھیل کا اتنا خوبصورت استعمال کیا گیا کہ وہ جھیل رومانیت کی ایک علامت سی بن گئی۔ اس فلم کے لیڈنگ رول میں تھے شمی کپور اور شرمیلا ٹیگور۔

فلم 'مشن کشمیر' اور 'فنا' جیسی مشہور فلمیں بھی کشمیر سے جڑی تھیں۔ حالانکہ ان فلموں میں وہ پس منظر نہیں تھا جو 'کشمیر کی کلی' میں فلمایا گیا تھا کیونکہ سنیما سیدھے طور پر اپنے عہد سے جڑے ہوتے ہیں۔ آج کشمیر کی فضا میں وہ رومانیت نہیں رہ گئی جو سنہ 1964 میں بنائی گئی فلم میں دکھائی گئی تھی۔ آج وہاں خوف، دہشت، تشدد، غیر محفوظ ہونے کا احساس اور بارود کی مہک پھیلی ہے۔ اس مہک میں کشمیر کی کلی کی خوشبو کہیں کھو چکی ہے۔

اس کے علاوہ '36 چائنا ٹاؤن'، 'این ایوننگ ان پیرس'، 'چک دے انڈیا'، 'چائنا ٹاؤن'، 'چائنا گیٹ'، 'انڈین بابو'، 'جس دیش میں گنگا بہتی ہے' وغیرہ ایسی فلمیں ہیں جو کمرشیل ہوتے ہوئے بھی کسی نہ کسی موضوع یا مسئلے کو بھی اٹھاتی ہیں۔ یہ موضوع ہوا میں نہیں تیرتے ہوتے بلکہ زمین سے جڑے ہوتے ہیں۔ زمین شہر کی بھی ہوسکتی ہے، کسی گاؤں یا قصبے کی بھی۔

'سنیما اور شہر' کی بات مکمل نہیں ہوگی اگر آخر میں ہم 'گینگس آف واسع پور' کا ذکر نہ کریں۔ مسائل پر بنائی جا رہی فلموں میں جھارکھنڈ اور بہار کا نام بھی تیزی سے سامنے آیا ہے۔ واسع پور جھارکھنڈ کی وہ جگہ ہے جو تشدد کا عنوان بن چکی تھی۔ فلم میکر نے بڑی مہارت سے کمرشیل رنگ دیتے ہوئے بھی وہاں کے غنڈہ راج سے جڑے مسئلے کو فلمایا ہے۔ انوراگ کشیپ کی اس فلم میں 1940 سے لے کر 90 کی دہائی تک کے واقعات کو دکھایا گیا ہے۔ یہ فلم جب بن کر تیار ہوئی تو پانچ گھنٹوں سے بھی زیادہ کی تھی اس لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ریلیز کیا گیا۔ فلم کو ناظرین نے زبردست اداکاری، نئے موضوع اور موسیقی کے لیے کافی پسند کیا۔

فلموں پر اپنی گہری نظر رکھنے والے Ingmar Bergman کی اس رائے سے ہم اپنی بات ختم کرنا چاہتے ہیں کہ 'فلم ایک خواب کی طرح ہے، فلم موسیقی کی طرح ہے، کوئی بھی فن براہِ راست ہمیں ہمارے شعور تک نہیں پہنچا سکتا۔ فلم ہی وہ ذریعہ ہے جو ہمارے جذبات کو چھوتے ہوئے ہمارے اندر کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے'۔

◘

Shaista Fakhri, C-9, Radio Colony, Auckland Road, Allahabad-211001

عظیم اقبال

آپ میں سے بہتوں نے کبھی نہ کبھی دُم دار ستارہ (Comet) ضرور دیکھا ہوگا۔ جنھوں نے اسے دیکھا نہ ہوگا انھوں نے اس کا نام یقیناً سنا ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ ہر سال چھوٹے، چھوٹے دُم دار ستارے نظامِ شمسی سے ہوکر گزرتے ہیں، لیکن عام لوگوں کو وہ دکھائی نہیں دیتے۔ تقریباً ہر دس سال کے وقفے میں کوئی دم دار ستارہ اتنا روشن ہوجاتا ہے کہ وہ مشاہدین کو نظر آسکے۔ انھیں گریٹ کامیٹ (Great Comets) سے موسوم کرتے ہیں۔

پہلے روشن دم دار ستاروں کے نظارے سے عوام میں عموی، طور پر اندیشے پیدا ہوجاتے تھے اور اُنھیں بدشگونی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ حال میں ہیل بوپ کامیٹ 1997 میں نمودار ہوا تو Heaven's Gate فرقہ کے افراد نے اجتماعی خودکشی کرلی تھی۔

اکیسویں صدی کا گریٹ کامیٹ (C/12006P1 (Mc Naught) جنوری 2007 میں دکھائی دیا تھا، جو گزشتہ 40 سالوں میں نمودار ہونے والا روشن ترین دم دار ستارہ تھا۔ پہلی دفع 1969 میں مشاہدہ میں آنے کے بعد دم دار ستارہ Churyumov Gerasimenko سال 2015 میں پھر نمودار ہوگا۔ دوربین کی ایجاد کے قبل یہ کہنا دشوار تھا کہ دُم دار ستارے کہاں سے آتے ہیں اور آہستگی سے کہاں نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

ارسطو (322-384 ق م) میں اپنی کتاب 'Meterology' میں دم دار ستاروں سے متعلق جو کچھ کہا تھا، مغربی سوچ اس کے زیرِ اثر تقریباً دو ہزار برسوں تک رہی۔

ارسطو نے انھیں ہمارے نظامِ شمسی کے حصے کے بطور نہیں مانا تھا۔ ارسطو کے بقول اوپری کرہ ہوا (Upper Atmosphere) میں گرمی اور سوکھے پن کے سبب وقتاً فوقتاً شعلے بھڑکتے تھے۔ انہی شعلوں کو ارسطو نے دم دار ستاروں کے بطور لیا تھا۔ دیگر سیارچوں (Meteors) اور کہکشاؤں (Milky Ways) کے وجود کے لیے بھی ارسطو کا نظریہ یہی تھا۔

آئزک نیوٹن (Isaac Newton 1642-1727) نے دم دار ستاروں کو کٹتے ہوئے ٹکاؤ، ٹھوس اجسام (Compact Solid, Durable Bodies) بتایا، جن کے مدار ترچھے (Oblique) ہیں۔ ان کی دُموں کو بھاپ کے جھرنوں (Vabour Streams) سے موسوم کیا، جنھیں آفتاب سے گرمی ملتی ہے اور ایندھن کی فراہمی ہوتی ہے۔

اپریل 2011 میں یونیورسٹی آف اریزونا کے سائنس دانوں نے کامیٹ وائلڈ—2 میں رقیق پانی کی موجودگی کی توثیق کی۔ اس سے یہ اصول کے دم دار ستاروں میں بہت زیادہ گرم ہونے کی استطاعت نہیں ہوتی کہ ان کے برفانی حصے ضائع ہوجائیں، نادرست نکلی۔

دی یوروپین روزیٹا پروب (The European Rosetta Probe) ۔ 2013 میں دُم دار ستارے Churyumov Gerasimeko کے مدار میں رسائی حاصل کرکے اس کی سطح پر ایک مختصر لینڈر (Lander) اُتارے گا تاکہ یہ درستگی سے دریافت ہوسکے کہ دم دار ستارے آخر کس مادے سے تشکیل پاتے ہیں۔

بے کراں آسمان کی مانوس فضا میں جب کوئی نامانوس شے نظر آجائے تو اُسے دیکھ کر اس کی حقیقت جاننے کے بجائے بیشتر لوگ وسوسوں کے شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کی فطری ضعیف الاعتقادی عود کر آتی ہے اور وہ سراسیمہ ہوجاتے ہیں۔ دُم دار ستاروں کے ظہور سے ایک ایسا ہی ماحول بنتا ہے۔

بیتی صدی کے آخری ایام میں ایک نیا دُم دار ستارہ دکھائی دیا۔ یہ بیسویں صدی کا ایک اہم ترین دم دار ستارہ تھا۔ اس دُم دار ستارے کا نام دو سائنس دانوں کے نام پر ہیل بوپ (Hale- Bopp) رکھا گیا تھا۔ نومبر 1996 سے ہی یہ آسمان میں چمکنے لگا تھا۔ اس دُم دار ستارے کو دوربین کے بنا بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ سیارہ مشتری (Jupiter) کے راستے سے دور اس دُم دار سیارے کی دریافت دو امریکی شوقیہ خلائی سائنس دانوں نے کی تھی۔ ایلن ہیل Allen-Hale اور تھامس بوپ (Thomas Bopp) نے یہ دریافت 23 جولائی 1995 کو کی تھی۔ یکم اپریل 1997 سے یہ دم دار ستارہ مزید روشن ہوگیا۔ پھر یہ آفتاب کی جانب گامزن ہوگیا ہے۔

خلائی سائنس دانوں کی پیش گوئی تھی کہ اس دم دار ستارے کی دم نیلی، سبز ہوجائے گی۔ مزید بڑی اور چمکیلی دکھائی دے گی۔ ہبل ٹیلی اسکوپ سے اس دُم دار ستارے کا مطالعہ کیا گیا۔ دراصل یہ دُم دار ستارہ برف اور دھول کا تودہ تھا۔

ہیل بوپ دم دار ستارہ زمین سے سات خلائی اکائی کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم یاد دلادیں کہ ایک خلائی اکائی 14 کروڑ 96 لاکھ 3 ہزار 500 کیلومیٹر ہوتی ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دونوں خلائی سائنس دانوں نے الگ الگ مقامات سے اس دم دار ستارے کو دیکھا۔ نیومیکسکو میں ایلن ہیل نے اپنی سولہ انچ کی دوربین سے ایجی ٹیریم ستاروں کی انجمن میں اس دُم دار ستارے کو دیکھا۔ اُس رات تھامس بوپ نے بھی ایری زون کی فضا میں اپنی 17.5 انچ قطر کے دوربین سے اسے دیکھا۔

'خلائی سائنس دانوں کو اس فاصلے پر دُم دار ستارے کی چمک سے کافی حیرت ہوئی۔ ان کے خیال میں گزشتہ 20 سالوں میں نمودار یہ روشن ترین دم دار ستارہ تھا۔ اس دُم دار ستارے کو آفتاب کے قریب پہنچنے میں تقریباً ڈیڑھ سال لگ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔

اس دریافت کے دو ہفتے بعد خلائی سائنس دانوں نے شمار کیا کہ دم دار ستارہ آفتاب کا ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً 4 ہزار سال لیتا ہے۔ خلائی سائنس داں برائن سائنس کے بقول یہ دُم دار ستارہ 1811 کے گریٹ کامٹ جیسا ہی تھا۔ اس کی دُم ایک خلائی اکائی کے مساوی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہیلی بوپ جیسے روشن دم دار ستارے آسمان میں شاذ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ سارے دُم دار ستارے دُم دار نہیں ہوتے۔ اپنے سفر کے دوران کوئی ایسا دم دار ستارہ آفتاب سے پرے جاتے ہوئے محض ایک غیر شفاف برف کا گولہ (Dirty ICE Ball) ہوتا ہے۔ اس برف کے گولے میں جو منجمد گیسیں ہوتی ہیں۔ ان میں امونیا، میتھین اور کاربن ڈائی آکسائڈ خاص ہیں۔ ان میں گرد بھی ہوتی ہے۔ آفتاب کے قریب پہنچنے پر اس ستارے کی دم دکھائی دیتی ہے۔ شمسی توانائی دم دار ستارے کے بالائی حصہ (Coma) کو گرم کردیتی ہے، اور گیسوں میں بھاپ بننے کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ آفتاب سے دور رہتے وقت یہ گیسیں ٹھوس ذرات میں منجمد ہوجاتی ہیں۔ شمسی توانائی کے زیرِ اثر یہ گیسیں کافی پرکشش چمکدار دُم بنالیتی ہیں۔ کچھ دم دار ستاروں کی دُم اس قدر روشن ہوجاتی ہے کہ یہ دن کے وقت بھی دکھائی دیتی ہے۔ دُم دار ستارے کی دُم ہمیشہ آفتاب سے دوسری سمت میں ہوتی ہے۔

ایڈمنڈ ہیلے (Edmond Halley) نے ثابت کیا کہ دُم دار ستارے نظام شمسی کے حصے ہیں۔ سیاروں کے مدار دائرہ نما ہوتے ہیں۔ جب کہ دُم دار ستاروں کے مدار کافی پر پیچ ہوتے ہیں۔ اسی سبب دُم دار ستارے کبھی کبھی آفتاب کے بالکل قریب آجاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ آفتاب سے بے حد دور بھی چلے جاتے ہیں۔

1995 میں ہیلے کا دُم دار ستارہ نمودار ہوا۔ 1996 میں ہیا کوٹا کے (Hya Kutake) دُم دار ستارہ ظہور پذیر ہوا۔

قابل ذکر ہے کہ شومیکر لیوی (Shoemaker Levy) مشتری کے 9 دُم دار ستاروں کے خاندان کا ہی ایک رکن تھا۔ اس دم دار ستارے کے 21 ٹکڑے مُشتری سیارے پر ٹوٹ کر بکھر گئے۔ جولائی 1994 میں یہ حادثہ ہوا۔ اس حادثہ کا براہِ راست نظارہ ٹیلی ویژن پر نشر ہوا تھا۔ ناظرین دم سادھ کر رہ گئے تھے۔ بعد میں خلائی مطالعہ سے پتہ چلا کہ 8 جولائی 1992 کو یہ دم دار ستارہ، سیارہ مشتری سے محض 43,000 کیلومیٹر کے فاصلے سے گزرا تھا۔ یہ فاصلہ اس قدر کم تھا کہ اس بسیط سیارے کی قوتِ کشش سے اس دُم دار ستاے کے ٹکڑے ہو گئے۔

دُم دار ستارے کی دم کی لمبائی ایک سے 10 کروڑ کیلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ دُم اس کی وجہ تسمیہ نہیں ہے۔ اب تک پیمائش کی گئی سب سے بڑی دُم 1843 کے گریٹ کامیٹ کی 30 کروڑ کیلومیٹر یعنی زمین اور آفتاب کے درمیانی فاصلے سے دوگنی لمبی تھی۔ دُم دار ستارہ جیسے ہی آفتاب کی جانب بڑھنے لگتا ہے، اس کی دم کی طوالت بڑھتی جاتی ہے۔ آفتاب سے دور ہٹتے وقت یہ دم مختصر ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔

جب بھی دم دار ستارہ آفتاب کی گردش کے بعد لوٹتا ہے، اس کی جسامت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے بننے اور سکڑنے کے عمل کے دوران بہت سی دھول اور گیس خلا میں پھیل جاتی ہے۔ ہیلی دم دار ستارہ اپنے آفتابی سفر کے دوران اپنے وزن کا دس ہزارواں حصہ کھو دیتا ہے۔ یعنی کل دس ہزار گردشوں کے بعد یہ نابود ہو جائے گا۔ یہ دم دار ستارہ ہر 76 سال کے بعد آفتاب کا چکر لگاتا ہے۔ اس حساب سے اس کی کل عمر ہوئی 760 ہزار سال یا ساڑھے سات لاکھ سال۔ آئندہ یہ سال 2071 میں دکھائی دے گا۔

ہمارے نظام شمسی کی عمر 450 کروڑ سال پیمائش کی گئی ہے۔ اگر دُم دار ستاروں کی پیدائش 450 کروڑ سال قبل ہوئی ہوتی تو تقریباً سارے دم دار ستارے اپنی عمر پوری کر کے نابود ہو چکے ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ دم دار ستارے آج بھی شان سے گھومتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دم دار ستاروں کی عمر نظام شمسی سے کم ہے۔ ان کی پیدائش بہت بعد میں ہوئی ہے۔

سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کچھ لاکھ سال پہلے ہی وجود میں آئے تو اس کے قبل وہ کہاں تھے؟ اس سوال کا جواب 1950 میں ڈچ خلائی سائنس داں جین اُورٹ (Jane Oort) نے دیا۔ ان کے بقول آفتاب سے 75 کھرب کیلومیٹر (آفتاب اور زمین کے فاصلے کا پچاس ہزار گنا) دور برفیلی چٹان ڈھیر (Qocky Tass) ایک دائرہ نما علاقہ ہے۔ اسے اورت کے بادل (Oort Cloud) سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ علاقہ ہی دم دار ستاروں کی جائے پیدائش مانا گیا ہے۔

قریب سے گزرتا ہوا کوئی ستارہ جب ان ڈھیروں کو متاثر کرتا ہے تب کوئی ڈھیر اس بادل کو خیر باد کہہ کر اندرونی نظام شمسی میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان ڈھیروں میں تو کچھ مشتری اور زحل (Saturn) جیسے بڑے سیاروں سے ٹکرا کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ کچھ اپنا راستہ بدل کر نظام شمسی سے ہی باہر نکل جاتے ہیں۔ باقی ماندہ ڈھیر آفتاب کی جانب بڑھتے ہوئے دم پیدا کر کے اس کی گردش کرنے لگتے ہیں۔

1949 میں آئرلینڈ کے سائنس داں ایج ورتھ اور 1951 میں خلائی سائنس داں گیراڈ کوئیپر نے تجویز دی کہ ہمارے نظام شمسی کے باہری حصے میں 'نیپ چن' اور 'پلوٹو' سیاروں کے پرے چٹانی ٹکڑوں کی ایک چپٹی پٹی (Flat Belt) ہونی چاہیے۔ یہ پٹی کافی گھنی رہتی ہوگی۔ اس لیے اس کے ٹکڑے آپس میں مل کر سیارے نہیں بن پائے ہوں گے۔ آفتاب سے اتنی دور ہونے کے سبب ان کا درجۂ حرارت کافی کم ہوگا اور دُم دار ستارے کے مرکزی حصے کی طرح یہ ٹکڑے برف اور منجمد گیسوں سے بنے ہو سکتے ہیں۔ یہی چوڑی پٹی کوئیپر بیلٹ کہلائی۔ کوئیپر نے مانا کہ مختصر عرصے کے (200 سال سے کم وقفہ سے نظر آنے والے) سارے دم دار ستارے اس کوئیپر بیلٹ سے ہی نکلتے ہیں۔

کافی وقت تک کوئیپر بیلٹ کا تصور متنازعہ بنا رہا۔ 1987 سے کوئیپر بیلٹ کی دریافت میں لگے خلائی سائنس داں ڈیوڈ جیوت اور 'جیوں لؤ' کو 30 اگست 1992 کو ملا ایک سیارہ نما ڈھیر۔ اس ڈھیر کی دریافت کی گئی یونیورسٹی آف ہوائی میں واقع 2.2 میٹر لمبی دوربین سے، دھیمی رفتار سے گامزن یہ ڈھیر سیارہ پلوٹو سے بھی دور تھا آفتاب سے اس کا فاصلہ 6 ارب کیلومیٹر پایا گیا۔ یہ فاصلہ آفتاب اور زمین کے فاصلے کا 40 گنا ہے۔

200500 کیلومیٹر جسامت کے اس ڈھیر کا نام رکھا گیا۔ 1992QB۔ چند مہینوں بعد مارچ 1993 میں 1992QB جیسا ایک دوسرا ڈھیر دریافت ہوا، جسے 1993 FU, کہا گیا۔ یہ ڈھیر بھی آفتاب سے 6 ارب کیلومیٹر دور تھا۔ تاہم یہ پہلے ڈھیر کے مخالف سمت میں تھا۔ ایسا قیاس کیا گیا کہ یہ دونوں ڈھیر کوئیپر بیلٹ خاندان سے ہی متعلق ہیں۔

1995 تک کل 32 تودوں کی تلاش کی جا چکی تھی۔ یہ سبھی تودے زمین کے مدار پر تھوڑا خمیدہ ہیں۔ یہ خم مختصر عرصے کے دم دار ستاروں کے خموں کے مساوی ہے ان سب کی جسامت 100 سے 400 کیلومیٹر تک ہے۔

یوں تو تلاش شدہ تودوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، لیکن ان کی موجودہ تعداد سے کوئیپر بیلٹ کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سبھی تودے، نیپچن، کے مدار سے باہر واقع ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'نیپچن' ہی اس پٹی (کوئیپر بیلٹ) کی اندرونی سرحد طے کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کوئیپر بیلٹ میں 100 کیلومیٹر سے بڑی جسامت کے کم از کم 35000 تودے ہیں۔

نیو میکسکو دارالتجربہ کے ایک اہلکار کے حوالے سے بتایا گیا کہ اگر ایک کیلومیٹر قطر کے کسی دُم دار ستارے سے زمین کی ٹکر ہو جائے تو اس سے جو توانائی پیدا ہوگی وہ ہیروشیما پر گرائے گئے جوہری بم (6 اگست 1955) سے پیدا شدہ توانائی سے 15 لاکھ گنا زیادہ ہوگی۔ اس ٹکر سے جو لہریں پیدا ہوں گی وہ سابق نیویارک ٹریڈ سینٹر (420 میٹر) جتنی اونچی ہوں گی اور سمندر کے دونوں کناروں تک پہنچ جائیں گی۔ بحر اٹلانٹک سے نکل کر پانی سارے فلوریڈا کو ڈھک لے گا۔ اس سے جو بھاپ پیدا ہوگی۔ وہ برفیلے بادلوں کو جنم دے گی اور اس سے برسہا برس تک آفتاب کی شعاعوں کا گزر نیچے نہیں ہو سکے گا۔

1980 میں 'سائنس' میگزین میں شائع شدہ ایک خبر کے بموجب 10 کیلومیٹر قطر کا ایک دم دار ستارہ زمین سے 65 ملین سال پہلے ٹکرایا تھا—

■

Azim Iqbal, Adabistan, Ganj No One
Bettiah - 845438 (Bihar)

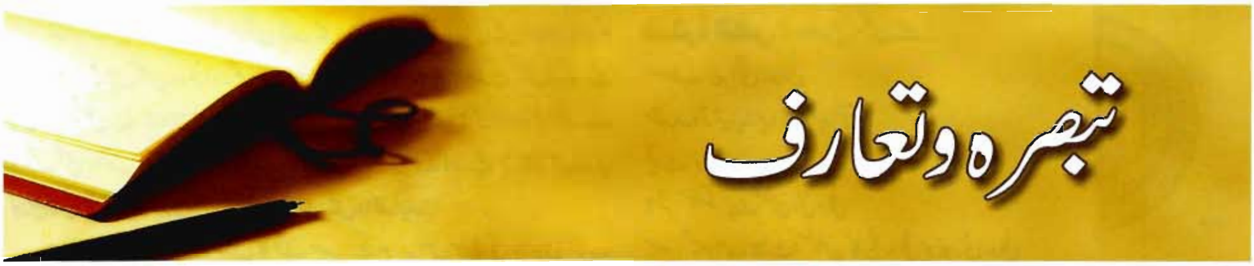

تبصرہ وتعارف

اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس

مرتبین: اومکار کول، مسعود سراج
صفحات: 280، قیمت: 73 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: جاوید اقبال، G-1، سنگم وہار، نئی دہلی

تعلیم وتدریس کے بدلتے پس منظر میں بالخصوص زبان وادب کی تدریس بہت ہی اہمیت کی حامل ہے اور یہ ایک بڑا مشکل، پیچیدہ اور محنت طلب کام ہے۔ اردو ادب کی تدریس پر گزشتہ چار پانچ دہائیوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں تاہم تدریس کے جدید طریقوں اور تقاضوں، نیز تدریسی حکمت عملیوں سے ہم آہنگ کتاب کی شدت سے کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اب محض الفاظ کے معنی، لفظوں اور جملوں کی نحوی وصرفی تراکیب بتا دینے سے کام نہیں چلتا۔ اب ضرورت ہے کہ ادب کی تدریس میں وہ سائنٹفک طریقے اور حربے اپنائے جائیں جن سے اسباق میں دلچسپی اور معنویت کا اضافہ ہو۔ جو طلبہ میں مختلف اصناف ادب کی شناخت کا شعور پیدا کریں اور ان میں اچھے برے ادب کی تمیز پیدا کرنے کی صلاحیت ابھاریں۔ اسی مقصد کے تحت سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجیز میسور اور شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک ورکشاپ اگست 1999 میں بعنوان 'ادبیات شناسی' منعقد کیا گیا جس میں مندرجہ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھ مختلف اصناف ادب کے تعارف اور تدریسی طریقۂ کار پر مضامین لکھوائے گئے۔ زیر نظر کتاب انھی مضامین کا مجموعہ ہے۔

پیش نظر کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں نثر، نظم، غزل کی تقریباً ان تمام اہم اصناف کو شامل کیا گیا ہے جو درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان تمام اصناف کی تعریف، تشکیل اور ارتقا کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس ضمن میں معروضیت، جامعیت اور اختصار کو ترجیح دی گئی ہے۔ شاید اسی لیے تمام اصناف پر گفتگو کرنے کے لیے اہم اور صاحب قلم اساتذہ کو ہی دعوت دی گئی ہے جس میں پروفیسر مغنی تبسم، مہ نور زمانی، رشید علی، آغا مرزا محمود، سید اعجاز حسین، ممتاز زرینہ، سیدہ یاسمین فاطمہ، لئیق صلاح اور محمد ضیاءاللہ شامل ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے 'اردو غزل تحسین وتدریس' کے عنوان سے غزل کی تعریف، تشکیل اور تاریخ اور اس کی تدریس میں معاون ضروری نکات کی نشاندہی کی ہے۔ مضمون کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ بے حد سہل اور آسان لفظوں میں لکھا گیا ہے اور اصطلاحات کی تعریف آسان لفظوں میں کی گئی ہے۔ کنایہ، مجاز مرسل اور استعارہ وغیرہ کی تعریفوں کو عام طور پر علم بیان کی کتب میں اس طرح پیچیدہ بنا دیا جاتا ہے کہ طالب علم کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے۔ مضمون نگار نے مختلف صنعتوں کی تعریف ایک ایک جملے میں اتنی آسانی سے کر دی ہے کہ طالب علم، استاد، کسی الجھن کا شکار نہیں ہوسکتا۔ دیگر مضمون نگاروں نے بھی سادگی، سلاست، اختصار اور جامعیت کا پورا خیال رکھا ہے۔ مگر اصناف کی تعریف، تاریخ اور تشکیلی عناصر کے بیان میں قلم کاروں نے جس تفصیل اور وضاحت سے کام لیا ہے تدریسی نکات اور خصائص کے بیان میں وہ فیاضی نہیں ملتی۔ جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ان اصناف ادب کی تدریس کرتے وقت طلبا کی ذہانت اور ثانوی سطح پر اہمیت کی حامل اصناف ادب کو ذہن میں رکھیں اور ان اصناف کے مشہور ومعروف فن پاروں کا عمومی ذکر بھی کریں۔ رباعی، قصیدہ، داستان، ناول، ڈراما، مرثیہ، تنقید اور مکتوب پر لکھے گئے مضامین کے آخر میں جہاں اختصار کے ساتھ ہی سہی تدریسی نکات بیان کر دیے گئے ہیں وہیں مثنوی، غزل، تذکرہ، انشائیہ اور تحریکات کے متعلق مضامین میں صرف معلومات کی فراہمی پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ تمام مضامین کے آخر میں تدریسی نکات اور طریقۂ کار کے کچھ اوصاف بیان کر دیے جاتے۔ اس کے باوجود کتاب کی افادیت کم نہیں ہوتی کیوں کہ یہ اردو ادب کی تدریس پر کتابوں کی کمی کو دور کرتی ہے۔

قومی اردو کونسل شکریے کی مستحق ہے جس نے اساتذہ کی ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ کونسل کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اچھی، مفید اور کارآمد نصابی وغیر نصابی کتابیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کرے، اس لیے مختلف علوم وفنون پر اس نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی اردو دنیا میں بھرپور پذیرائی ہوتی ہے۔

ابتدائی اردو

مرتبین: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، تبسم نقی
صفحات: 98، قیمت: 40 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عزیز احمد خان، G-50 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان کی تاریخ بہت عظیم رہی ہے۔ اس ملک میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں نے ترقی کی۔ اردو زبان نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، جمالیات اور قومی یکجہتی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بلا تفریق مذہب تمام لوگوں کی زبان رہی ہے۔ ہندوستان میں آج اردو کی جو صورت حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اکثریت کا ایک مخصوص طبقہ اردو کو ہر حال میں ہندوستان سے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ صوبے جو اردو تہذیب کے نمائندے تھے آج وہاں اردو کی صورت حال یہ ہے کہ نئی نسل اردو رسم الخط سے نابلد ہے تہذیب وتمدن تو دور کی بات ہے۔ اتر پردیش، دہلی اور دیگر صوبوں میں اردو کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ ایسے نازک وقت میں مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں نے اردو کی ترقی اور بقا کے لیے سرگرم ہو کر میدان عمل میں قدم رکھا۔ خاص طور سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے جو مختلف اسکیمیں اور کورس شروع کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اردو زبان کو عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول کرنے، تابناک ماضی میں اردو جڑوں کی کھوج اور اس کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم کنار کرنے کے لیے کونسل سرگرداں ہے۔

تمام مسائل کے باوجود آج بھی ملک میں بیشتر افراد بول چال میں اردو زبان کا استعمال کرتے ہیں لیکن وہ اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے قومی اردو کونسل نے 2001 میں ششماہی سرٹیفکیٹ کورس شروع کیا تاکہ اردو رسم الخط سے وہ لوگ بھی واقف ہوسکیں جو اردو ادب کو دوسری زبانوں کے ذریعے پڑھتے ہیں۔ یہ کورس کافی مقبول ہوا اور کئی ہزار لوگوں نے اس میں داخلہ لیا۔

زیر بحث کتاب مذکورہ کورس کا ایک حصہ ہے اور یہ اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں 12 اسباق ہیں جو اردو کی بنیادی ساختوں اور لفظیات پر مبنی ہیں۔ ان اسباق میں روزمرہ کی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد طلبہ مختلف حالات اور سلسلۂ بیان میں ان الفاظ کا آسانی سے استعمال کرسکیں، معیاری اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں اور کسی کے سامنے اپنی بات موثر انداز میں کہہ سکیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں 15 اسباق شامل ہیں۔ طلبہ کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں چھوٹے چھوٹے پیراگرافس کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس حصے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں عام موضوعات، سوانح عمری اور اردو شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

عام موضوعات کے تحت امتحان کا خوف، تندرستی ہزار نعمت، کشمیر کی سیر جیسے اسباق شامل ہیں۔ حب الوطنی کے تحت ہمارا ملک، ترانۂ ہندی اور شہید وطن اشفاق اللہ خاں شامل ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اردو کی اکثر اصناف کی تعریف نہایت ہی سلیقے کے ساتھ پیش کی گئی ہیں مثلاً ڈراما، افسانہ، غزل وغیرہ۔ ساتھ ہی ساتھ مشاہیر فن جیسے افسانہ نگار پریم چند، نظم نگار علامہ اقبال اور غزل گو غالب کی سوانح پیش کی گئی ہے جس سے اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایک سبق 'اردو زبان کا ارتقا' شامل ہے۔ اس میں نہایت ہی اختصار مگر جامع انداز میں اردو کے ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اردو کے مشکل الفاظ کو نہیں سمجھ پاتے ہیں اس لیے مشکل الفاظ کے معنی ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں دیے گئے ہیں۔ فہرست میں کتاب کا آخری سبق 'شہید وطن اشفاق اللہ خاں' شامل ہے لیکن شاید جلد سازی کے دوران یہ سبق چھوٹ گیا جو ایک بڑی خامی ہے۔

اسی طرح سے سبق 26 'اردو زبان کا ارتقا' بھی مکمل نہیں ہے۔ امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ان خامیوں کو دور کرلیا جائے گا۔ اردو ڈپلوما کورس کا بنیادی مقصد طلبہ اور دیگر اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کی اس سمت میں رہنمائی کرنا ہے کہ وہ خود مختارانہ طور پر اردو زبان وادب کا مطالعہ کرسکیں اور اگر طلبہ کورس میں شامل پہلی اور دوسری کتاب کا مطالعہ بہتر طریقے سے کرتے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ نہ صرف کورس میں شامل منتخب نثر ونظم کو پڑھنے کے قابل ہوجائیں گے بلکہ اردو کی دیگر کتابوں کو بھی آسانی سے پڑھ سکیں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا اردو کی اشاعت میں یہ کورس ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ایک کڑی یہ کتاب ہے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی اگر کسی مجبوری کے تحت باضابطہ داخلہ لے کر نہیں سیکھ سکتا تو ان کتابوں کو خرید کر ذاتی طور پر مطالعہ کرکے اس قابل ہوسکتا ہے کہ وہ اردو زبان کی بنیادی باتوں کو سمجھ سکے اور اردو شاعری، کہانیوں وغیرہ کا مطالعہ کرسکے۔ کتاب کی چھپائی وغیرہ بہتر ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو سیکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

تذکرۂ الٰھی (دو جلدیں-تین حصے)

مصنف: میر الٰہی ہمدانی

مقدمہ وترتیب: پروفیسر عبدالحق

قیمت: 500 روپے

ناشر: مینسکرپٹ مشن، نئی دہلی

مبصر: شمیم احمد، سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

'تذکرۂ الٰہی' کی دریافت اور اشاعت علمی دنیا کا بیش بہا انکشاف ہے۔ تقریباً چار سوسال سے یہ گنجینۂ گہر گم نام اور اشاعت سے محروم تھا۔ صرف دو ایک تذکروں میں اس کا بہت مختصر حوالے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق کو آفریں ہو کہ انھوں نے اس نایاب و نادر قلمی نسخے کو طباعت سے آراستہ کیا۔ میر الٰہی ہمدانی ہجرت کرکے 1021ھ میں ہندوستان وارد ہوئے۔ وہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار سے وابستہ تھے۔ شاعری میں ان کا بڑا مقام اور احترام تھا۔ بیش از بیش تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کے احوال ومقام قلم بند کیے ہیں۔ شاہ جہاں کے گورنر ظفر خاں کے ساتھ 1042ھ میں کشمیر گئے اور وہیں 1064ھ میں سپردِ خاک ہوئے۔ ان کے شعری مجموعے (خطی نسخے) کئی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

تذکرے کی پہلی جلد (واحد قلمی نسخہ) پروفیسر عبدالحق کی تحویل میں ہے۔ دوسری جلد متوسطین دور کے قلم کاروں پر مشتمل ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ برلن کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ میر الٰہی ہمدانی نے تین حصوں میں تذکرے کا خاکہ مرتب کیا تھا۔ متقدمین متوسطین اور متاخرین۔ پہلا حصہ مکمل کیا تھا۔ دوسرا حصہ ناتمام تھا اور تیسرے حصے کی نوبت نہیں آئی۔ پروفیسر عبدالحق نے 1974 میں اس اہم نسخے کا تعارف کرایا تھا۔ اس وقت سے دوسرے نسخوں کی تلاش میں تھے جو نہیں مل سکا۔ آخر کار انہوں نے مجبوراً خطی نسخوں کے عکسی اشاعت پر اکتفا کیا۔ جسے مرکزی حکومت کے شعبے مینسکرپٹ مشن نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کرکے طباعت واشاعت کی ایک شان دار مثال قائم کی ہے۔ متقدمین شعرا وادبا کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں تقریباً سات سو صفحات ہیں اور پانچ سو سے زائد اندراجات ہیں۔

تینوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد گیارہ سو کے قریب ہے۔ میر الٰہی ہمدانی تقی اوحدی (مصنف لباب الالباب) کے معاصر اور دوست تھے۔ اس کے ساتھ عوفی کے تذکرے سے بھی میر الٰہی نے استفادہ کیا ہے۔ ان تینوں تذکرہ نگاروں کو اگر ایک صف میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فارسی تخلیق وتزئین کا مرکز ایران تھا۔ مگر انتقاد واعتراف کے پیمانے ہندوستان میں وضع کیے گئے۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ سرزمین ہند سے سیراب ہوتی۔

'تذکرہ الٰہی' کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ کیوں کہ اس میں ایرانی شعرا وحکما کے دوش بدوش ہندوستان کے فن کار اور اکابرین علم ودانش کے احوال موجود ہیں۔ مختلف علوم اور فنون کے کارشناسوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ بعض معاصر واقعات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ اہلِ تصوف کی ایک کہکشاں موجود ہے۔ خواتین فن کاروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ غرض معلومات کا یہ ایک کشکول ہے۔ اس تذکرے کی اشاعت سے تاریخ و تبصرے کی نئی راہیں پیدا ہوں گی۔ گم گشتہ ثقافتی سرمایہ کی بازیافت پر پروفیسر عبدالحق کو خراجِ تہنیت پیش کرتا ہوں۔

مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اوّل

نام مرتب: مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 467، قیمت: 325 روپے، سنہ اشاعت: 2012
ناشر: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کا کانگر، کا کانگر، نئی دہلی
مبصر: عتیق الرحمٰن
این 80 سی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صرف ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ عالم اسلام کے قد آور اور بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ اصلاً عربی و فارسی زبان و ادب کے ادیب و انشا پرداز اور قادر الکلام شاعر تھے، آپ کے دور میں سرکاری زبان فارسی تھی، لیکن قرآن وحدیث کی زبان عربی تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے عربی اور فارسی زبان ہی میں تصنیفی وتحقیقی کام کیا ہے گرچہ آپ کے دور میں اردو زبان مروج تھی۔ آپ کے صاحبزادگان اردو میں کام کر رہے تھے جس میں آپ کی ترغیب شامل تھی۔

قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسرار وحکم، علم عقائد، تصوف اور ترجمہ نگاری کے موضوعات پر آپ کی اہم کتابیں ہیں۔ حضرت شاہ صاحب علوم شریعت ہی کے عالم نہیں تھے بلکہ عمرانیات وسیاسیات اور اقتصادیات کے بھی ماہر تھے۔ پیش نظر کتاب 'مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد اوّل' دراصل حضرت شاہ صاحب کی کتاب ہمعات، سطعات، لمعات، الطاف القدس اور الخیر الکثیر کا مجموعہ ہے جس کے مرتب مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب ہیں، جو ایک جید عالم اور علوم ولی اللّٰہی کے رمز شناس ہیں، مولانا قاسمی نے تصوف وسلوک سے متعلق حضرت شاہ صاحب کی متعدد کتابوں کو تقدیم، تصحیح، تنقیح اور تحشیہ کے ساتھ بڑے اہتمام وسلیقہ سے شائع کیا ہے اور اہل علم کو نئی صدی کا ایک عمدہ وقیمتی تحفہ دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے تصوف کے مسائل میں صدیوں سے جو اختلافات ونزاعات تھے۔ ان کے درمیان میں بھی تطبیق وتوفیق دینے کی مخلصانہ سعی بلیغ کی ہے یہ حضرت شاہ صاحب کا تجدیدی کارنامہ ہے۔

ہمعات، سطعات، لمعات، الطاف القدس اور خیر کثیر یہ تمام اہم کتب ورسائل تصوف کے رموز واسرار اور علوم ومعارف پر مشتمل ہیں حضرت شاہ صاحب علماً وعملاً صوفی تھے۔ آپ کا پورا خانوادہ تصوف سے تعلق رکھتا لیکن آپ متصوفین اور نام نہاد صوفیوں کے خلاف بھی تھے۔

'ہمعات' اصلا فارسی میں تھی اس کا عمدہ سلیس ترجمہ کیا گیا ہے جس کے مترجم پروفیسر محمد سرور ہیں۔ اس کتاب میں تصوف کی تاریخ، اس کا فلسفہ اور اس کے مختلف ادوار کا ذکر ہے اور تصوف کے مراتب ومقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ 'سطعات' یہ حضرت شاہ کی دوسری اہم تصنیف ہے جو تصوف کے غوامض ومشکلات کے حل، اصطلاحات کی تشریح وتفصیل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی اصلاً فارسی میں تھی جس کا عمدہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ تصوف وسلوک کے موضوع پر ایک نادر ونایاب کتاب ہے۔ کوئی بھی اہل دل اس سے مستغنی وبے نیاز ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے اس کے مطالعہ کے بغیر رموز تصوف کو سمجھنا ممکن نہ ہوگا۔ 'لمعات' بھی ایک اہم تصنیف ہے اس میں تصوف کے حقائق ودقائق اور تعارف بیان کئے گئے ہیں جس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ 'الطاف القدس' یہ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث کا ایک اہم رسالہ ہے جس میں تصوف کے لطائف وحقائق اور اعضاء وجوارح پر بحث کی گئی ہے۔ آخری کتاب 'الخیر الکثیر' ہے یہ کتاب بھی تصوف اور دیگر اسلامی علوم وفنون کے معارف ولطائف پر مشتمل ہے۔ اس میں قرآنی سورتوں کے ناموں کے معانی اور جملہ عربی حروف کے معانی ومطالب بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب از خود علمی خزانوں کا نادر ونایاب مجموعہ ہے۔

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے بڑی محنت وکاوش سے ان کتابوں کو اپنے گرانقدر مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اس کا دوسرا حصہ جلد ہی شائع کیا جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ امام شاہ ولی اللہ جلد اول تصوف وسلوک کی دنیا میں قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور عوام وخواص کے تزکیۂ باطن اور صفائی قلب کا باعث ہوگا اور اہل علم ودانش کے لیے دلچسپی کا سامان ہوگا۔

ٹیگور شناسی

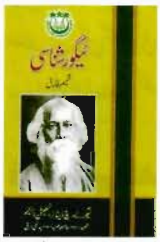

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 168، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم،
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
مبصر: مشکور معینی، معرفت طارق رسول، E-206، برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'ٹیگور شناسی' شمیم طارق کی تازہ ترین کتاب ہے جو ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ کتاب میں شمیم طارق نے اپنے موضوع پر جامع گفتگو کے پیش نظر کل پندرہ ابواب قائم کیے ہیں۔ دراصل مصنف کا مقصد ٹیگور کے مجموعی خد وخال کو پیش کرنا ہے نہ کہ ٹیگور کے فکر وفن پر ناقدانہ بحث کرنا۔

کتاب کے پہلے باب میں 'ٹیگور اور ان کا عہد' کے عنوان کے تحت مصنف نے ٹیگور کے دور کے حالات، سماجی اقدار، اس دور کی ادبی شخصیات اور بنگلہ زبان وادب میں رائج افکار ونظریات کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔ اس رمز سے ہم سب واقف ہیں کہ ٹیگور جس عہد میں پیدا ہوئے وہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحران کا دور تھا۔ ملک میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک نئی زبان اور نئی تہذیب آہستہ آہستہ مگر موثر طریقے سے ہندوستانی ذہنوں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی پیدائش ایک ایسی ریاست یعنی بنگال میں ہوئی جہاں ملک کے دوسرے علاقوں کے مقابلے سو سال قبل ہی نئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ بنگالی قوم مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی زبان وادب کی خوبیوں سے آشنا ہو چکی تھی۔ لہٰذا ٹیگور کو بنگلہ زبان وادب کے ساتھ انگریزی ادب کو سمجھنے میں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ حالانکہ ٹیگور نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر اس کے باوجود انھیں انگریزی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ ٹیگور کے علم وبصیرت میں ان کے خاندان کا بڑا دخل ہے۔ ان کے والد دیوندر ناتھ ٹھاکر اپنے زمانے کے ممتاز دانشور اور عالم تھے۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر حافظ شیرازی سے بہت متاثر تھے۔ والد کے توسط سے رابندر ناتھ بھی حافظ شیرازی سے روشناس ہوئے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ٹیگور کی مزاج سازی میں حافظ کا بڑا دخل رہا۔ بلکہ حافظ کے وسیلے سے ٹیگور کی شاعری میں تصوف کا رنگ نمایاں ہوا جو بنگلہ قارئین کے لیے اچھوتا تو نہیں تھا مگر اس کی حسیت میں انوکھا پن ضرور تھا۔ ان تمام مضمرات پر شمیم طارق نے اپنی کتاب میں کہیں ضمنی تو کہیں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ٹیگور کی پیدائش، خاندان، بچپن، تعلیمی سفر، شادی بیاہ، سیر وتفریح، تخلیقی سفر اور تصوراتی نکات کو زیر بحث لایا گیا ہے تاکہ قارئین کے سامنے ٹیگور کا اجمالی خاکہ پوری طرح اجاگر ہوسکے۔

ایک مختصر سی کتاب میں ٹیگور کے فکر وفن کا مکمل احاطہ کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ ٹیگور کا فن کسی ایک فن پارے میں جذب نہیں کہ جس پر آسانی سے دسترس حاصل ہو جائے۔ ان کی فکر کا کوئی مخصوص دائرہ نہیں تھا لہٰذا انھیں کسی خاص زاویے سے دیکھنا یا ان کے فن کو پرکھنا ادبی نقطۂ نظر کے لحاظ سے جائز نہیں ہے۔ ٹیگور کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ناول نگار، مصور، گلوکار، ماہر تعلیم اور فلسفی تھے۔ ادب کی کوئی ایسی صنف نہیں کہ جس میں ٹیگور نے تجربہ نہ کیا ہو۔ گویا ٹیگور کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ان کی تمام اصناف کا مطالعہ کیا جائے اس میں مصوری اور موسیقی بھی شامل ہے۔ شمیم طارق نے پیش نظر کتاب میں ان کے تخلیقی سفر کا بھرپور اور مدلل جائزہ پیش کیا ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے اصناف کے زمرے میں رکھ کر ہر صنف پر مدلل گفتگو کی ہے۔ جس سے قاری کو ٹیگور فہمی میں کافی مدد ملتی ہے، ساتھ ہی ٹیگور کے ادبی جہات اور نظریۂ فکر وفن سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔

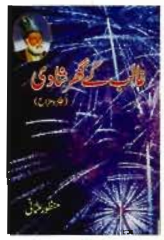

غالب کے گھر شادی

مصنف: منظور عثمانی

صفحات: 168، قیمت 88 روپے، سنہ اشاعت: 2012

پبلشرز: مکتبہ آنش، بیت الرحمہ

17 غفور نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

مبصر: فاروق احمد، ای 66، شاہین باغ، ابوالفضل پارٹ II، نئی دہلی

غالب کے گھر شادی 168 صفحات پر مشتمل منظور عثمانی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ منظور عثمانی تصنیف وتالیف کی دنیا میں اب کوئی نیا نام نہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ایام سبکدوشی کی فرصتوں کی صدا سے شروع ہوتی ہے اور پھر پرلطف، دلچسپ، سبق آموز مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مضامین میں کثیر السسرال، مزاح نگاروں کے یہاں کتوں کی مقبولیت، ماسٹر مائنڈ، جوتوں کی برسات، مجھے میری بیوی سے بچاؤ جیسے جاذب نظر عناوین شامل ہیں۔ ساتھ ہی مجتبیٰ حسین، اسد رضا، رؤف خوشتر، شمیم عثمانی جیسی کچھ شخصیات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اور اخیر میں مختصر کوائف پر اپنی بات ختم کر دی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں اقبال مجید کا پیش گفتار کتاب اور مصنف دونوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔

مضامین کتاب اس قدر دلچسپ ہیں کہ واقعتاً آپ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے البتہ ہنسنے کے فوری بعد ایک سبق بھی محسوس کریں گے۔ مثلاً کثیر السسرال کے یہ جملے پڑھیں' کہتے ہیں مہمان اپنے ساتھ برکتیں لاتا ہے لیکن اللہ مغفرت کرے برکت اللہ خاں مرحوم کی وہ فرمایا کرتے تھے کہ'' چڑیوں کا کھایا کھیت اور سسرال کا کھایا گھر کبھی پنپتا نہیں۔'' اسی طرح غالب کے گھر شادی میں منظور عثمانی نے اردو کے کاروباریوں کو برسیاں منانے کی تقریب کے تعلق سے صلاح تک دے ڈالی ہے کہ'' ذمہ داران کو ایک اور بے لوث صلاح یہ بھی ہے کہ برسی کسی ماہ بھی پڑے لیکن یہ ہنگامہ مارچ کے مہینے میں بپا ہونا چاہیے کیوں کہ سنا ہے کہ مالی سال کے آخر میں اردو پر کیا ہوا صرفہ بڑا بابرکت اور زود ہضم ثابت ہوتا ہے اور ہنگامہ خیز بھی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس رکھا کیا ہے۔''

اہم بات یہ ہے کہ کتاب میں مصنف نے اردو کی زبوں حالی اور ریسرچ اسکالروں کی تحقیق میں عدم دلچسپی اور قارئین کے قحط کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ 'خلد بریں سے غالب کا خط' میں رقمطراز ہیں''... اب پڑھنے لکھنے کا چلن اٹھ چکا ہے، اب اہل علم ایسے دھلے دھلائے آراستہ پیراستہ نظر آتے ہیں گویا دوکانِ مشاطہ سے تازہ بہ تازہ برآمد ہوئے ہوں۔ صفائی، ستھرائی کا اسقدر خیال کہ گرد آلود کتابوں کو چھونے تک کو روادار نہیں۔''

انہوں نے 'شوہر کی مناجات پولیس کے دربار میں'، 'مجھے میری بیوی سے بچاؤ'، 'لاچار چار سے دوچار'، 'مزاح نگاروں کے یہاں کتوں کی مقبولیت' اور 'ہوشیار! اندر خطرناک کتا ہے' جیسے مضامین لکھے ہیں اور ساتھ ہی 'عصری زندگی کا آئینہ دار طنز ومزاح' بھی لکھ دیا ہے۔ منظور عثمانی نے 'مساسٹر مائنڈ' میں ملک وسماج کے تحفظ سے کھلواڑ اور لاپرواہی برتے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے پولیس محکمہ میں درآید ماسٹر مائنڈ بنانے کے ایک خاص رجحان کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں'' ہمارا دعویٰ ہے کہ ارسطو اور سقراط نے اتنے ماسٹر مائنڈ نہ بنائے ہوں گے جتنے ہماری فاضل پولیس نے، جس کے سر پر ہاتھ دھر دیا ماسٹر مائنڈ بنا کر چھوڑا۔''

کتاب کے آخری صفحات میں مصنف نے 'کلام مومن بزبان مومن'، 'چیپ شاہ صاحب'، 'ننھا اداکار'، 'تیرہواں سوار' لکھ کر اپنی گھریلو کشتی کے نئے سواروں کا والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے اور ان کے ذریعہ سماج کے کچھ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح کتاب طنز ومزاح کی ترقی کی سمت میں جاری پیش رفت کا ایک سنگ میل ثابت ہوسکتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع شدہ اس کتاب میں کوئی خاص تکنیکی خامی نظر نہیں آئی، دیدہ زیب ٹائٹل، بہتر تحریر وترتیب اور ہارڈ بائنڈنگ نے کتاب کو اور بھی عمدہ بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کتاب ہر لحاظ سے قاری کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

معاشرتی معاشیات

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی

صفحات: 232، قیمت: 225 روپے، سنہ اشاعت: دسمبر 2012

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دلی

مبصر: خلیق الزماں نصرت، ایم اے، ایم کام، سابق بینکر

میں معاشیات بی کام سے ہی پڑھ رہا ہوں۔ ایم کام میں بھی یہ سبجیکٹ تھا۔ میرے ادب سے جڑنے کے بعد کسی اردو کے مصنف نے معاشیات کو سمجھانے کے لیے کوئی کتاب لکھی ہو یہ میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ ہاں علامہ اقبال کے مقالے پر چند مقالات پڑھے تھے۔ علامہ اقبال خود بھی معاشیات کے ماہر تھے۔ ان کے بہت سارے شعر میں معاشیات کی جھلک ملتی ہے۔

اطہر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے برسوں بعد مجھے معاشیات سے جڑنے کی طرف راغب کیا ہے۔

عام زندگی میں معاشیات سے ہمیں واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ معاشیات سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی حاجتیں بے شمار ہیں جیسے چاول، دال، مشین، کپڑا، تعلیم وغیرہ ہیں لیکن تمام حاجتوں کی یکساں ضرورت نہیں پڑتی ہے آدمی اپنی ضرورت اور اپنی آمدنی کے مطابق اپنی حاجت پوری کرتا ہے۔ ان کی خواہشیں تو بے شمار ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی چادر دیکھ کر پیر پھیلاتا ہے جو چیز ہماری آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے ہم اس کی خواہش تو کرتے ہیں مگر اپنی ضرورتوں میں شامل نہیں کرتے ہیں۔ ہم روٹی کپڑا، مکان اور تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں ہاں تعلیم سب کی ضرورت نہیں ہے، کچھ خاص لوگ تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ معاشیات سے ہی ہمیں ملک کی قومی پیداوار یا قومی آمدنی کا صحیح تناسب معلوم ہوتا ہے۔ معاشیات کے ہی اصولوں پر چل کر

بینکوں کے سرمائے کا تناسب معلوم ہوتا ہے۔ معاشیات کے مطالعے میں ہی جو ڈاٹا تیار ہوتا ہے اسی سے حکومت اپنی پالیسی بناتی ہے۔ ایسے ڈاٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ عوام کی تعلیم، صحت، اور رہائش وغیرہ پر کتنا خرچ کیا جائے۔

معاشیات کا پہلا سبق ہے چیزوں کی قیمتوں کے چڑھنے پر طلب کم اور گرنے پر زیادہ ہوتی ہے۔ بہر حال سید اطہر رضا بلگرامی قابل مبارکباد ہیں انھوں نے معاشیات جیسے خشک موضوع پر اردو میں اپنی کتاب 'معاشرتی معاشیات' لکھی ہے۔ اب اس کا حشر کیا ہوگا یہ تو وہ خود جان چکے ہوں گے۔

اس کتاب میں ان کے کئی مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی رسالے میں چھپتے رہے ہیں۔ کئی غیر مطبوعہ مضامین بھی ہیں۔ کتاب میں دلچسپی قائم کرنے کے لیے اطہر صاحب نے اقبال اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں کا معاشیات سے ڈانڈا ملایا ہے۔ معاشیاتی اصول کو واضح کرنے کے لیے جگہ جگہ نظمیں پیش کیے گئے ہیں ایک برمحل شعر کا بھی ذکر ہے:

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

اقتصادیات بھی معاشیات کا ایک حصہ ہے۔ مصنف نے علامہ اقبال کا یہ شعر خاص طور پر ابتدا میں نوٹ کروا دیا ہے۔ واقعی یہ شعر علم معاشیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شعر عام لوگوں کی نظر سے دور رہا ہے۔ علامہ اقبال معاشیات کے بھی ماہر تھے۔ ان کا ایک شعر حوالے میں دیا گیا ہے:

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خم دار کی نمائش مزید و کجدار کی نمائش

مجموعی طور پر کتاب قابلِ مطالعہ ہے مگر بہت کم لوگ اسے پڑھیں گے۔ اس کے بارے میں صاحبِ کتاب زیادہ نہ سوچیں تو بہتر ہوگا۔

شارب ردولوی: (ادبی سفر کے پچاس سال)

مُرتبہ: ڈاکٹر حسن مثنّٰی
صفحات: 328، قیمت: 300.00 روپے، سنہ اشاعت: 2012
ناشر: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد
مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف
علّامہ اقبال اسٹریٹ سنبھل، یوپی 244302

زیرِ تبصرہ مجموعہ ملک کے معروف قلم کاروں کی تحریروں سے آراستہ ہے۔ جو شارب صاحب کی شخصیت اور ان کے فن و خدمات کو منظر عام پر لانے کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ جیسا کہ خود مرتب کتاب میں لکھتے ہیں:

''پیش نظر کتاب 'شارب ردولوی: ادبی سفر کے پچاس سال' انھیں صفات و کمالات کے تنقیدی اور تاثراتی بیان پر مشتمل ہے۔ جو ان کے قریبی دوستوں، عزیزوں اور ادب کا شستہ ذوق رکھنے والے ادبا و ناقدین نے سپرد قلم کیے ہیں۔'' (کتاب مذکور ص 9)

کتاب میں سب سے پہلے ''اعتراف'' عنوان کے تحت مرتب نے کتاب کی غرض و غایت اور اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد شارب صاحب کے کوائف دیئے گئے ہیں۔ جو اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ ان کے ذریعہ ان کے ذاتی حالات سے آگاہی ہونے کے ساتھ ہی ان کی تخلیقات اور ان کو ملنے والے ادبی اعزازات سے بھی تعارف حاصل ہوتا ہے۔ بعدہٗ کتاب کے مشمولات کو چند گوشوں میں منقسم کرنے کے بعد مختلف قلم کاروں کی تحریروں کو پیش کیا گیا ہے۔ جن میں تاثر و تنقید عنوان کے تحت حفیظ نعمانی، عارف نقوی، پروفیسر محمد مثنّٰی رضوی، علامہ حسن عباس فطرت، ڈاکٹر شہزاد انجم، فاروق ارگلی، ابراہیم احمد علوی، ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی، ارشاد امروہوی اور ''شارب ردولوی بحیثیت ناقد'' عنوان کے ضمن میں پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر منور حسن کمال، ڈاکٹر سید محمد ارشد رضوی، ڈاکٹر عرشیہ جبیں، ڈاکٹر سید الفت حسین، ڈاکٹر ریشماں پروین، حسن مثنّٰی۔ 'مرثیہ کی تنقید' عنوان کے تحت پروفیسر اعجاز حسین، ڈاکٹر حسن عباس، ڈاکٹر وسیم حیدر ہاشمی، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر نشاں زیدی، گوشہ ''اندازِ بیاں یوں بھی'' کے ذیل میں پروفیسر فاروق صدیقی، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر محسن رضا نقوی، اس کے بعد 'ادبی مکالمہ' کے تعلق سے حسن مثنّٰی اور ڈاکٹر عرشیہ جبیں کی تحریروں کے بعد آخر میں 'خاکے' کے عنوان سے پروفیسر مجتبٰی حسن، شاہ نواز قریشی، نصرت ظہیر اور اسد رضا کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ملک کے مایۂ ناز اہلِ قلم کی تحریروں سے سجا ہوا ایسا حسین گلدستہ بن گئی ہے۔ جس میں تحقیق و تنقید کے حسین و خوبصورت پھول اپنی خوشبوئے جاں فزا سے قارئین کی مشام جاں کو معطر کر رہے ہیں۔

یہ کتاب معنوی اعتبار سے اعلیٰ معیار کا عمدہ نمونہ ہونے کے ساتھ ہی صوری اعتبار سے بھی نہایت نفیس کاغذ، عمدہ کتابت، دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت ٹائٹل کی حامل ہونے کی وجہ سے ظاہری و باطنی خوبیوں کا حسین امتزاج ہے۔

امید ہے اردو ادب کے شائقین بالخصوص تحقیقی و تنقیدی ذوق رکھنے والے باشعور قارئین اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور شامل کتاب مضامین کے ذریعہ شارب صاحب اور ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ناشر کے علاوہ کتاب میں دیے گئے دہلی اور پٹنہ کے تین اور پتوں پر سے بھی یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔ کتاب کی جملہ خصوصیات اور اس کے ظاہری و باطنی اعلیٰ معیار کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں پُر وقار اضافے کا باعث ہوگی اور باذوق قارئین سے ستائش و مبارکباد حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔

کوائف و حقائق

مصنف: مختار بدری
صفحات: 164، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: دسمبر 2012
ناشر: تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، 24، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چنئی
مبصر: ڈاکٹر عبید الرحمٰن طیب
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب مختلف النوع مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ مصنف نے ایک قابل قدر کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مختلف ادبیات کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث پر بھی مصنف کی گہری نظر ہے۔ مزید برآں وہ معلومات عامہ، سائنس اور طب کے بحرِ ذخار دکھائی دیتے ہیں۔ مضامین بڑے دلچسپ اور قیمتی معلومات سے پر ہیں۔

مصنف نے جو بھی عنوان باندھا اس سے متعلق اپنے فکر و نظر کو ایک حسین جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف اس کے جملہ متعلقات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اگر سائنسی بات چھڑ گئی تو معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن

وحدیث سے جو بھی حوالے ملتے ہیں انھیں اپنے مضمون میں موتیوں کی طرح پرو دیتے ہیں۔ تاریخ وسیرت کے ذخیرے سے گاہے گاہے صحابہ کرام اور بزرگان دین کے موثر واقعات رقم کرتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ موضوع سے متعلق جو بھی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان کا ضرور تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ قاری کے لیے نہایت مفید شے ہے۔ شائقین اس موضوع پر مزید مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'سفر ہے شرط' اس عنوان کے تحت سفر کی اہمیت وافادیت بیان کرنے کے بعد دنیا کے پہلے سفر نامے کا ذکر کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں'' ہیروڈوٹس کو دنیا کا سب سے اولین سفر نامہ نویس کہا جاتا ہے۔ اردو میں غالباً یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ' عجائبات فرنگ' پہلا سفر نامہ ہے جو 1947 میں لکھا گیا۔ پھر اردو میں جو بھی سفر نامے لکھے گئے ان کے نام مع صاحب کتاب کے درج کردی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن کتابوں کے عنوان میں یہ لفظ آیا ہے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ صرف ان ناموں کی فہرست 13 صفحات (43 تا 5) پر مشتمل ہے۔' خط وکتابت'، 'زنداں اور کالا پانی' وغیرہ اسی نوعیت کے مضامین ہیں۔

ایک اور مضمون بڑے حسین پیرائے میں لکھا ہے عنوان ہے' چندا او چندا'۔ مصنف بڑی خوبصورتی کے ساتھ چاند، اس کی روشنی کی بات شروع کرتا ہے۔ پھر چاند کی گردش اور پہلے انسان نے چاند پر کب قدم رکھا اسکا تذکرہ کیا۔ چاند سے متعلق بعض احادیث جیسے شق قمر پھر رویت ہلال اور چاند گرہن کے بارے میں خامہ فرسائی کرتے ہوئے فلم وادب کی دنیا کی سیر کرتے ہیں جس میں قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ بعض اشعار بھی نقل کیا ہے مثلاً' چودہویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو' (شکیل بدایونی) اور پھر ان اردو کتابوں کا اندراج ہے جن کے نام چاند یا چاندنی پر رکھے گئے ہیں۔

یوں تو سارے ہی مضامین ادب کا شہ پارہ محسوس ہوتے ہیں لیکن کچھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں جیسے' آنسو کون پونچھے'، 'شگون'، 'رنگ بھرنا'، 'ایک انگوٹھی جو زندگی بدل ڈالے'، 'زنداں اور کالا پانی'، 'سکہ چلتا ہے'، 'موت جو پیچھا نہ چھوڑے'، 'لہو پکارے گا'، 'خوشبو' اور' خط وکتابت' وغیرہ۔ بعض مضامین میں سائنسی معلومات کی بھرمار ہے۔ مثلاً 'بجلی کی کوند' اسی طرح بعض پر طب کا گہرا سایہ ہی نہیں بلکہ یہ خالص طبی مضامین معلوم پڑتے ہیں مگر فائدہ ودلچسپی سے خالی نہیں مثلاً' جڑواں بچے'، 'طب، طبیب، مرض اور علاج وغیرہ۔ آخر میں ایک طویل مضمون' عددوں کی دنیا' ہے جو قاری کے لیے بڑا صبر آزما ہے۔

مصنف نے اس بات کا بھی اہتمام والتزام کیا ہے کہ ہر عنوان سے متعلق اردو کے محاورے بھی درج کردے جو یقیناً اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

بہر حال یہ اردو شائقین کے لیے ایک مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ یہ قاری کے معلومات میں نہ صرف اضافہ کرے گی بلکہ اس میں تنوع پیدا کرے گی اور نئے آفاق اور راہیں اس کے لیے وا کرے گی۔ اس کے لیے مصنف بجا طور سے ہم سب کی طرف سے شکریے اور داد تحسین کے مستحق ہیں۔

تانیثی فکر کی جہات

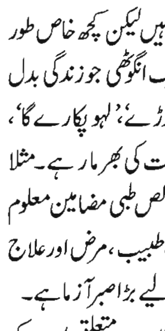

مصنف: ڈاکٹر آمنہ تحسین

صفحات: 252، قیمت: ۔ 300 روپے، سنہ اشاعت: 2012

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: جاں نثار معین، ریسرچ اسکالر

ڈپارٹمنٹ آف ویمنس ایجوکیشن، مانو، حیدرآباد

تانیثی مفکر ڈاکٹر آمنہ تحسین موجودہ دور کی منفرد محققہ، ممتاز ناقدہ اور' تانیثیت' کی علمبردار خاتون ہیں۔ تانیثی فکر اردو ادب کے بہ نسبت انگریزی میں زیادہ ہے۔ اردو قلم کاروں نے باقاعدہ مختلف اصناف کے ذریعے بہترین تانیثی افکار پیش کیے ہیں۔ لیکن 'تانیثی فکر' پر باقاعدہ کوئی تصنیف قابل قبول منظر عام پر نہیں آئی۔ مصنفہ نے اپنے فہم و ادراک اور وسیع النظری سے تانیثی فکر کے مختلف جہتوں سے حقائق کی راست آگہی، اصل معنی کی تلاش اور جدید افکار کی عکاسی کی ہے۔

مصنفہ نے' تانیثی فکر کی جہات' کے آغاز سخن میں لکھا ہے' تانیثی فکر' کو ایک ایسا خاص نقطۂ نظر یا طرز احساس قرار دیا جاسکتا ہے جو خواتین کے مسائل اور ان کے تشخص کی بحالی سے جڑا ہے۔ یہ طرز احساس دراصل اس فکر کی نمائندگی کرتا ہے جو خواتین کی خاندانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی حیثیت کی بہتری اور شعبہ ہائے حیات کی تمام سطحوں پر صنفی امتیازات کے خاتمہ کی کوششوں کے لیے سماج میں بیدار ہوئی۔ اس مخصوص افکار اور کوششوں کے پیش نظر یہی مقصد رہا کہ' عورت' کو بہ حیثیت' انسان' کے وہی حقوق اور مقام ومرتبہ ملے جو کسی بھی سماج میں مردوں کو حاصل ہے۔ (ص 13)

محترمہ ڈاکٹر آمنہ تحسین کی کتاب' تانیثی فکر کی جہات' موضوع پر پہلی باضابطہ کتاب ہے۔ جو نہایت عرق ریزی، محنت ومشقت اور باریک بینی سے تانیثی فکر ایک منفرد زاویے سے اجاگر کرتی ہیں۔ مضامین میں حسب ضرورت اشعار کا استعمال بھی کیا ہے مثلاً:

دلی بہت حسین ہے دلکش ہے لکھنؤ
لیکن کچھ اور ہی ہے ہمارے دکن کی بات (بانو طاہر سعید)

حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہل دل، اہل نظر، اہل قلم سے پوچھو (عزیز النساصبا)

یہ تخلیق تانیثی فکر کے متنوع جہات کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک نمونہ' صدیوں سے چلی آرہی فرسودہ خام خیالی وروایات کو علم کے نور سے تبدیل کیا جائے۔ (ص 14)' اس عمل کی اجتماعی جدوجہد ہی تانیثیت کا بنیادی نکتہ ہے۔ مصنفہ نے قدیم وجدید ادب میں تانیثی فکر کو اپنے مطالعہ وجستجو کا موضوع بنا کر عالمانہ جائزہ لیا ہے۔

مذکورہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں آغاز سخن کے ساتھ تیرہ مقالے ہیں۔ ان مقالوں میں خواتین ادب کے ہر گوشے میں تانیثی افکار پیش کیا گیا ہے۔ حصہ دوم۔ تاثرات پر مبنی ہے جس میں متفرق مضامین ہیں۔ یہ تنقیدی مضامین تانیثی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس تخلیق کی بنیادی فکر ایسی خواتین ہیں جو مرد سے کمتر مخلوق یعنی دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور پدری نظام کی وجہ سے تاریخ سے گمنام ہیں۔ ان خواتین کی قربانیوں کی آگہی کرنا ہے۔ اسی لیے مصنفہ نے انتساب بھی' گمنام خاتون تخلیق کاروں کے نام' کیا ہے۔

' تانیثی فکر کی جہات' تصنیف کا اسلوب معیاری، طرز نگارش دل کش، زبان وبیان نقص سے پاک، اس فکر پر لکھی جانے والی یہ پہلی معتبر کاوش ہے۔' تانیثی فکر کی جہات' خواتین کی فکر کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ کتاب تانیثی فکر اور ادبی مضامین کا جامع تجزیہ ہے۔ اسے تانیثیت کی گائیڈ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان دنوں مصنفہ ڈپارٹمنٹ آف ویمنس ایجوکیشن، شعبہ تعلیم نسواں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں Assistant Professor کی حیثیت سے' تانیثیت' کی تدریس دے رہی ہیں اور خواتین کے مسائل پر لکھ رہی ہیں۔

محترمہ نے' تانیثی فکر کی جہات' مبسوط ومربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ان کے تنقیدی نگارشات وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کا نتیجہ ہے۔ وہ سادہ، عام فہم اور بیانیہ

اسلوب میں یدطولیٰ رکھتی ہیں۔ سرورق نہایت جاذبِ نظر ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ مصنفہ نے طلبا اور اساتذہ کی ایک دیرینہ خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کتاب پر بہت محنت کی ہے۔ یہ تخلیق ایک تربیتی معلوماتی کتاب ہے۔ ایک اور خوبی 'نسائیت' پر عالمانہ بحث ہے تاکہ ہر فرد خواتین سے عزت واحترام سے پیش آئیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود تصنیف کا صرف نصف حصہ تانیثی فکروں پر محیط ہے باقی ادبی ہے مکمل کتاب تانیثی جہات پر مبنی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ اس کے برعکس کتاب دیدہ زیب ٹائٹل، شاندار کاغذ پر طباعت اور قیمت مناسب ہے۔

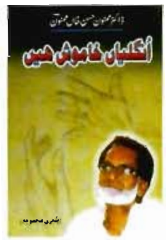

انگلیاں خاموش ھیں

مصنف: ڈاکٹر ممنون حسن خاں ممنون

صفحات: 208، قیمت: 200، سنہ اشاعت: 2012

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی 92

مبصر: ریحانہ فاطمہ، F-148/1، شاہین باغ، نئی دہلی 25

مذکورہ کتاب ڈاکٹر ممنون حسن خاں ممنون کا شعری مجموعہ ہے۔ یہ 208 صفحات کی کتاب ان کی شاعری اور شعری رجحانات کا غماز ہے۔ انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز اور رشتوں کی شکست کی کھل کر عکاسی کی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

محفوظ ہیں وہ آج بھی زخموں کی شکل میں
احباب نے دیے ہیں جو تحفے الگ الگ

ڈاکٹر ممنون نے شعوری یا غیرشعوری طور پر اپنی تحقیقی اساس کو مستحکم کیا ہے، بے جا لفظی گری کے بجائے انھوں نے سیدھے انداز میں زندگی کی سچائی کو اپنے تجربات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

شانے جھکائی ہیں مسائل کے بوجھ نے
کیسے میں اپنے بوجھ کو کسی سے بڑا کہوں

غزل ایک ممتاز صنف شاعری ہے۔ اس کی اردو ادب میں اس قدر اہمیت ہے کہ بیشتر شعرا نے اپنے اظہار خیال کا وسیلہ غزل کو بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اردو شاعری کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔

ڈاکٹر ممنون کے شعری مجموعہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے اشعار میں ایک شاعر کی بصیرت اور پختہ ذہن کا علم ہوتا ہے۔ مصنف کے اسلوب اور طرز ادا کی شگفتگی نے کتاب کے وزن وقار اور معیار میں اضافہ کیا ہے۔

آج کے ہندوستان میں بیٹیاں محفوظ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ممنون نے اس سانحہ پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے۔ کس طرح ایک بیوہ اپنی بیٹی کے لیے اس ظالم زمانے سے دہشت زدہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دہشت زدہ ہے اہل ہوس کے ہجوم سے
گھر میں جو ایک بیٹی ہے بیوہ کے سامنے

میں سمجھتی ہوں کہ شعر ایسا ہو جو پڑھنے کے بعد سیدھا دل میں اتر جائے اور شاعر کے جذبات وخیالات کا اظہار بھی ہوجائے۔ ڈاکٹر ممنون کے اس شعری مجموعہ کی وہی خوبی ہے ان کے کلام میں پرواز ہے گہرائی ہے، روانی ہے۔ انھوں نے اس مجموعے میں متعدد بار آسمان، خوشبو، سمندر، پرندے، اڑان وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اس سے ان کے خیالات کی گہرائی کی عکاسی ہوتی ہے اور انھوں نے ایک فن کار کی نظر سے دیکھا ہے۔ قارئین کے لیے یہ دعوتِ فکر بھی ہے۔

ڈاکٹر ممنون کے اس شعری مجموعے کے لیے اردو دنیا ان کی ممنون ہے اور وہ قابل مبارک باد ہے۔ مغربی یوپی کا علاقہ روہیل کھنڈ بھی شعر و ادب کے لیے مشہور رہا ہے۔ پٹھانوں کی اس بستی میں بھی علم و ادب کی شمعیں ہمیشہ روشن رہی ہیں۔ اور یہ سلسلہ اس قدر دراز ہوا ہے کہ پٹھانوں کی یہ علم دوست شبیر حسن خاں جوش تک پہنچتی ہے۔ جنھوں نے غزلوں کی زلف گرہ گیر کو خوبصورتی سے سنوارا ہے اور اسے ایک نیا انداز نئی فکر دی ہے۔ ڈاکٹر ممنون کی شاعری بھی اپنے اندر ایک وسیع دنیا رکھتی ہے اور اس دنیا میں انسانوں کے مسائل اور دورِ حاضر کی صورت حال کے ساتھ ساتھ دوسرے مخلوقات اور قدرتی مناظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے غزل کے کئی شعبہ حیات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

مذکورہ مجموعہ کو دبستانِ روہیلکھنڈ میں ایک گراں قدر اضافے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے اور امید کی جانی چاہیے کہ اس کا سلسلہ اور دراز ہوگا۔

کتاب کا پیش لفظ جناب قمر رئیس، جناب ڈاکٹر خالد حسین خاں نے تحریر کیا ہے۔ خالد صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ لفظ بہ لفظ کیا ہے۔ انھوں نے خوشبو، آسمان، پرندے وغیرہ الفاظ کتنی جگہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان سب کو اپنے ذہن میں قید کیا ہے۔ کتاب کے پس پشت پر شمیم شاہ جہاں پوری اور نعیم شاہ جہاں پوری کی تحریر ہے۔ ان ادبی فن کاروں کے تاثرات کتاب کی ظاہری اور مصنوعی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

دبستانِ شاہ جہانپور کے ادب کے منظرنامے میں ڈاکٹر ممنون ایک معتبر شخصیت ہیں۔

مصنف کی زبان ستھری اور سلیس نظر آتی ہے۔ پوری کتاب میں اور شعروں میں لفظیات بے حد متناسب اور پیچیدگی سے پاک ہے۔ اسی انداز نے ان کے شعری مجموعے کو قابل قدر بنایا ہے۔

کتاب کی اشاعت وطباعت خوبصورت ہے۔ قیمت مناسب ہے اور ڈاکٹر ممنون نے ہر خاص وعام کا خیال رکھا ہے۔

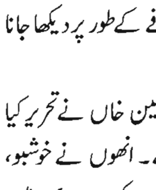

جدید اردو مثنوی فن اور فکری ابعاد

مصنف: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 507، قیمت: 205 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: کتابی دنیا، دہلی

مبصر: طیب فرقانی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ظفر انصاری ظفر کی حالیہ منظر عام پر آئی کتاب 'جدید اردو مثنوی-فن اور فکری ابعاد' قومی کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں 1874 سے 2002 تک کے عرصے میں لکھی گئی مثنویوں کا فنی اور فکری جائزہ لیا ہے۔

507 صفحات کی اس ضخیم کتاب کے نام میں ہی صرف جدید کا لفظ نہیں ہے بلکہ کتاب بھی جدید ہے اور موضوع بھی جدید ہے۔ کل پانچ ابواب پر مشتمل کتاب کے آخری دو ابواب میں مصنف نے، جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہوتا ہے، جدید اردو مثنوی کے فنی اور فکری ابعاد کا خوب صورت اسلوب و انداز میں ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

جدید مثنوی سے مراد ایسی مثنویاں ہیں جو 1857 کے انقلاب کے بعد کے زمانے میں لکھی گئیں۔ اس سلسلے میں جن مثنوی نگاروں کا ذکر آیا ہے وہ ہیں حالی، آزاد، شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، جمیل مظہری،

سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، اختر انصاری، عبدالمجید شمس، علامہ سریر کابری اور اسلم بدر۔ ان کے علاوہ ذکی احمد، قمر واحدی، ابرار کرت پوری، جوش ملیح آبادی، شیخ احمد علی اور مرزا ہادی رسوا کا ذکر بھی آیا ہے۔ مصنف نے عامر عثمانی کی مثنوی 'شاہنامہ اسلام جدید' کا ذکر بھی کیا ہے جو ان کو دستیاب نہ ہوسکی۔ ان میں وہ مثنوی نگار بھی ہیں جن کو ہم مثنوی نگار کی حیثیت سے کم ہی جانتے ہیں جیسے مرزا ہادی رسوا۔ لیکن پورے مطالعے میں حالی، آزاد اور شبلی کو محوری حیثیت حاصل ہے۔

کتاب کا پہلا باب 'مثنوی: بحیثیت فن' اس لحاظ سے اہم ہے کہ مصنف نے اس میں مثنوی کی تعریف تو کی ہے ساتھ ہی مثنوی عموماً جن سات بحروں میں لکھی گئی ہے ان کی تقطیع مع مثال پیش کی ہے اور یہ مانا ہے کہ مثنوی کے لیے صرف سات یا نو بحریں ہی خاص نہیں ہیں بلکہ اس میں اجتہاد وانحراف کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مصنف نے اس پہلے باب میں مثنوی کی صنفی حیثیت کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے اور شمیم احمد کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ ''جدید شاعری کے فروغ کے بعد جو مثنویاں مثلاً حالی، شبلی، آزاد، اقبال، سردار جعفری، جاں نثار اختر وغیرہ نے لکھی ہے، صحیح معنوں میں ان کی صنف مثنوی نہیں ہے بلکہ مثنوی کی ہیئت میں وہ مختلف موضوعات پر مبنی نظمیں ہیں۔'' مصنف نے کتاب کے آخری باب میں لکھا ہے کہ حالی اور شبلی بنیادی طور سے نقاد ہیں اور جب خود انھوں نے اپنی مثنویوں کو مثنوی کہا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں نظم کہنے والے؟

کتاب کا دوسرا باب 'اردو میں مثنوی کی روایت' اور تیسرا باب 'اردو ادب کا دور جدید' ہے۔ یہ دونوں ابواب طوالت، بساطت اور تفصیل کے اوصاف سے پیراستہ ہیں اور مصنف کے وسیع مطالعے اور عرق ریزی کا پتہ دیتے ہیں لیکن یہ دونوں ابواب غیر متوازن ہیں۔ مثال کے طور پر مثنوی کا سنہ تصنیف اور مثنوی نگاروں کا سنہ ولادت و وفات دینے میں کسی خاص قاعدے کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ سید اشرف جیسا مثنوی نگار جس کا ذکر شمالی ہند اور دکن کے بیشتر تذکروں میں ملتا ہے، کی ولادت و وفات کی تاریخ مصنف نے نہیں لکھی ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ تاریخ پردہ خفا میں ہے۔ جب کہ اس کی مثنوی کا سنہ تصنیف درج ہے۔

اسی طرح تیسرے باب میں پرارتھنا سماج جیسی کم معروف اصلاحی تحریک کا ذکر تو آیا ہے لیکن جماعت اسلامی تحریک کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو وہابی تحریک کا بانی بتایا گیا ہے جس سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ کمپوزنگ کی غلطیاں بھی انھیں دو ابواب میں زیادہ ہیں۔ تصدق حسین شوق لکھنوی کی عرفیت نواب مرزا کی بجائے نواز مرزا کمپوزنگ ہوگیا ہے۔ اسی طرح ان کی مثنوی بہار عشق کا سنہ تصنیف 126ھ مطابق 1849 اور مثنوی زہر شوق کا سنہ تصنیف 1269ھ مطابق 1872 درج ہے۔ ان میں یا تو 1872 غلط ہے یا 1849۔ بنگلہ بتنگر اور بارات برات کمپوز ہوا ہے۔

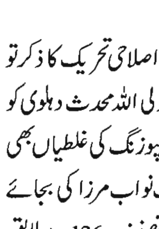

ذوقی : فن اور شخصیت

مصنف: شیفتہ پروین

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2012

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: محمد اسداللہ، ماڈل اسکول، چندن پٹی، لہریا سرائے، دربھنگہ

'ذوقی فن اور شخصیت' (بھوکا ایتھوپیا کے آئینے میں) شیفتہ پروین کی پہلی کتاب ہے۔ لیکن اس پہلی کتاب میں جس طرح شیفتہ پروین نے بھوکا ایتھوپیا کے حوالے سے ذوقی کی شخصیت اور فن کا اجمالی جائزہ لیا ہے، اس کی تعریف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔

ذوقی ان قلمکاروں میں سے ایک ہیں جن کی حیران کردینے والی تخلیقات قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی طرح انفرادیت کی حامل ہیں اور اس کا تذکرہ بھی شروع ہوچکا ہے۔ اسی کتاب سے دو مثالیں دیکھیے:

''جیسے منٹو کا اپنا اسلوب، اپنا آہنگ تھا— یا پھر قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، منٹو یا بیدی کے پاس اپنا ٹریٹمنٹ اور اپنا مخصوص رنگ وآہنگ ہے، یہ آہنگ اس عہد کے بعد نئے تخلیق کاروں کی شناخت میں معاون ثابت نہیں ہوسکا۔ لیکن ذوقی کے نام کو چھپا کر بھی ان کی کہانیاں پڑھ جائیے تو آپ چیخ کر کہہ دیں گے کہ ارے یہ تو ذوقی کی کہانی ہے— ذوقی کے یہاں سب سے خاص بات یہ ہے کہ بیک وقت ان کی کہانیوں میں تاریخ و فلسفے کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے— ایک طرف ان کی کہانیاں جہاں تہذیبوں کی کشمکش، ثقافت وتمدن کے عروج وزوال کو اپنا موضوع بناتی ہیں، وہیں ان کا سیدھا رشتہ مستقبل کے اندیشوں سے بھی رہتا ہے—'' (پروفیسر شہزاد انجم)

''میرا اپنا ماننا ہے کہ افسانوی ادب میں۔ قاضی عبدالستار، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو جس قسم کی انفرادیت حاصل ہے ویسی ہی انفرادیت آج کے افسانوی تناظر میں مشرف عالم ذوقی کو حاصل ہے۔ وہ سنگین سے سنگین ترین موضوع پر افسانے لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی کہ ہے نئے صارف سماج اور ایڈوانس کلچرل سوسائٹی میں جس قسم کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ وہ مسائل عموماً اولیت کے ساتھ ذوقی صاحب کے افسانوں ہی میں ابلاغ پاتے ہیں۔'' (آفاق عالم صدیقی)

شیفتہ پروین کی نثر خوبصورت ہے۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محض ایک طرفہ بیان کو تنقید کا حصہ نہیں بناتیں بلکہ اس کی جگہ وہ اپنے اظہار بیان کے لیے Reasoning کو تلاش کرتی ہے۔ گو یہ کتاب صرف 160 صفحات پر مشتمل ہے مگر اس کے باوجود ذوقی کی پیدائش سے لے کر ان کے ادب تخلیق کرنے تک جو تفصیلات یہاں ملتی ہیں، وہ ذوقی کے فن کو بہت حد تک جاننے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ بھوکا ایتھوپیا مشرف عالم ذوقی کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا اور اس کی زیادہ تر کہانیوں کے پیچھے ترقی پسندانہ رنگ غالب تھا۔ شیفتہ نے اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مشرف عالم ذوقی کا سوانحی خاکہ ہے۔ دوسرے حصے ہم عصر افسانہ اور افسانہ نگاروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں ذوقی کے فن کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے اور چوتھا حصہ بھوکا ایتھوپیا کے تنقیدی مطالعہ پر مبنی ہے۔

ذوقی آج فن افسانہ کی ان بلندیوں پر ہیں جہاں ان کے برابر دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ جس طرح وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے موضوعات میں وسیع تر فکر اور گلوبل گاؤں کے مسائل کو سامنے لاتے ہیں، وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ شیفتہ نے جس طرح بھوکا ایتھوپیا کے حوالے سے ذوقی حیات وفن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، وہ اس لیے بھی متاثر کرتا ہے کہ شیفتہ نے ذوقی کی زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بڑے فنکار کا مطالعہ آسان نہیں ہوتا اور وہ بھی آج کے ماحول میں کسی ریسرچ اسکالر سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ کسی بڑی شخصیت کی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کا سنجیدہ مطالعہ بھی تحریر میں لایا جاسکتا ہے۔ ذوقی کی مکمل شخصیت کو سمجھنے کے لیے بھی اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ شیفتہ پروین مبارکباد کی مستحق ہیں کہ ذوقیات، کے سلسلے میں انھوں نے اپنی طرف سے ایک نیا گوشہ کھولنے کی کوشش کی ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اس کتاب کو مقبولیت ملے گی۔

عالمی اردو نامہ

اردو کادربار سجا ہے

'دوسری عالمی اردو کانفرنس' لاهور، میں شریک مندوبین کا ایک منظر

ایکسپریس میڈیا گروپ کے تحت ہونے والی دوسری عالمی کانفرنس جو 13-12 اکتوبر شہر لاہور میں ہوٹل آواری ٹاورز میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا باقاعدہ آغاز ایکسپریس میڈیا گروپ کی اسٹرینگ کمیٹی کے رکن جناب احفاظ الرحمٰن کی افتتاحی تقریر سے ہوا، جس میں سادہ، مگر واضح الفاظ میں اِس سرگرمی کے مقاصد، تقاضے اور اہمیت بیان کی گئی۔ تقریر کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں اور دنیا بھر سے آئے ہوئے ماہر لسانیات، دانش وروں اور اہل علم نے اپنے مقالات پڑھے۔

افتتاحی خطبے کی نظامت جناب احفاظ الرحمٰن نے کی۔ پہلے سیشن 'اردو رسم الخط کے مسائل' پر گفتگو شروع ہوئی جس کی صدارت برطانیہ سے آئے ہوئے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے کی۔ معروف ماہر لسانیات، ڈاکٹر عطش درانی کے علاوہ دیگر مقررین میں ڈاکٹر تاش مرزا (ازبکستان)، ڈاکٹر خلیل طوقار (ترکی) اور ڈاکٹر محمود الاسلام (بنگلہ دیش) شامل تھے۔ اس سیشن میں یادگار گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر عطش درانی نے تحفظ اردو کے لیے اسے جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ساتھ ہی خدشہ ظاہر کیا کہ اگر ہم نے رسم الخط کو کمپیوٹر دوست نہیں بنایا، تو اس زبان کو شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل توقار نے اردو رسم الخط میں تبدیلی کے امکانات کو رد کر دیا۔ ڈاکٹر محمود الاسلام نے رسم الخط کو زبان کی روح قرار دیا۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا کہنا تھا کہ اردو کا رسم الخط انتہائی دل کش ہے، اسے ہر صورت باقی رہنا چاہیے۔ انھوں نے اردو کا مستقبل روشن قرار دیا۔

دوسرے سیشن کا عنوان 'دیگر پاکستانی زبانوں سے اردو کی ہم آہنگی' جس کی صدارت ممتاز ادیب، عبداللہ حسین نے کی، مقررین میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر معین نظامی، ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر نجیبہ عارف جیسے اہل علم شامل تھے۔

تیسرے سیشن کا عنوان 'عام فہم زبان' جس کی صدارت ڈاکٹر شمیم حنفی نے کی۔ مقررین میں پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر شاہ محمد مری، ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ (چین) اور اشفاق حسین (کینیڈا) جیسی شخصیات شامل تھیں۔

چوتھے نشست کا اہتمام کیا گیا جس کا عنوان 'اردو پر دیگر زبانوں کے اثرات' تھا۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر لدمیلا ویسیلیوا (روس) نے کی۔ مقررین میں ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر نعمان الحق، ڈاکٹر آصف فرخی، ڈاکٹر شاداب احسانی اور عطیہ سید شامل تھے۔ تمام مقررین نے اپنے مقالات پیش کیے۔

سلیم راز نے کھل کر اظہارِ خیال کیا اور کہا ہمارے اہل قلم کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے عوام کو اجتماعی جدوجہد کا راستہ دکھائیں۔ ساتھ ہی انھوں نے پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کی تجویز دی۔ اسد محمد خان نے علامتی کہانی کے انداز میں اپنا مقالہ پیش کیا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ زاہدہ حنا نے اپنے مقالے میں موضوع کا سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ بڑی خوبی سے جائزہ لیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے موضوع سمیٹتے ہوئے۔

آخری اجلاس 'بھارت میں اردو' ممتاز فکشن نگار انتظار حسین کی صدارت میں ہوا۔ مقررین میں ڈاکٹر شمیم حنفی، زبیر رضوی، اصغر ندیم سید اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر شامل تھے۔

مذکورہ سیشنز میں اسٹیج سیکریٹری اور کمپرنگ کے فرائض، عالیہ شاہ اور پروفیسر ڈاکٹر کامران نے احسن طریقے سے ادا کیے۔ آخر میں جناب احفاظ الرحمٰن نے تین قراردادیں پیش کیں، جن کی حاضرین نے بھرپور انداز میں تائید کی۔ اس کے بعد مندوبین کو شیلڈز اور سندہائے اعتراف تقسیم کی گئیں۔

پریس ریلیز، اقبال خورشید، ایکسپریس اردو، 21 اکتوبر 2013

نیویارک

انٹرنیٹ ایڈریس عربی، چینی اور دوسری زبانوں میں بھی

نیویارک : انٹرنیٹ کے ضابطہ کاروں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پہلی بار غیر لاطینی رسم خط کے علاوہ دوسری زبانوں کے خط میں بھی انٹرنیٹ کے ڈومینز کی منظوری دے دی گئی ہے جس کے بعد ہزاروں نئے ڈومینز سامنے آئیں گے۔ انٹرنیٹ کے ضابطہ کار ادارے آئی کین (آئی سی اے این این) کا کہنا ہے کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں یہ نئی تبدیلیاں وسیع پیمانے پر ہونے والی اس توسیع کا حصہ ہیں جو 'ڈاٹ کام' اور 'ڈاٹ اورگ' جیسے موجودہ 22 ڈومینز کے علاوہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ کسی بھی ویب ایڈریس میں ہمیں بعد میں ڈاٹ کام اور ڈاٹ اورگ جیسے الفاظ نظر آتے ہیں۔ ادارے نے چار نئے ٹاپ لیول ڈومین کا اعلان کیا ہے جس کے تحت اب چینی، روسی اور عربی رسم خط میں بھی ڈومینز ہوں گے۔ 'گیم' کے لیے چینی حروف والے ڈومینز نظر آئیں گے جب کہ عربی خط میں 'ویب' اور 'نیٹ ورک' ہوں گے تو سائرلک یا روسی رسم الخط میں 'سائٹ' اور 'آن لائن' ڈومینز ہوں گے۔ عربی زبان میں ویب کے لیے جو لفظ استعمال ہوگا وہ 'شبکۃ' ہے جب کہ چینی زبان میں گیم کے لیے ?? کا استعمال ہوگا اور روسی میں آن لائن کے لیے لفظ کا جب کہ ویب سائٹ کے لیے لفظ کا استعمال ہوگا۔ امریکہ میں قائم انٹرنیٹ کے ضابطہ کار ادارے آئی کین کے جزک ڈومین شعبے کے صدر اکرم عطاء اللہ کا کہنا ہے کہ 'انٹرنیٹ کی آمد کے بعد انٹرنیٹ ڈومین کی دنیا میں آنے والی یہ سب سے بڑی تبدیلی ہے۔' انھوں نے کہا کہ 'آنے والے چند ہفتوں اور مہینوں میں ساری دنیا سے نئے ڈومین کے لیے نام آئیں گے جس سے دنیا کے لوگ، برادریاں اور کاروبار ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملیں گے جس کا کبھی ہمیں خیال بھی نہ ہوا ہو۔' عالمی خبر رساں ادارے کے مطابق اکرم عطاء اللہ نے کہا کہ 'اس توسیع کا ایک مقصد یہ ہے کہ ڈومین کی اعلیٰ سطح پر لوگوں کی گوناگوں پسند اور رنگارنگی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔' انٹرنیٹ کے ضابطہ کاروں کا کہنا ہے کہ 60 دنوں کی 'سن رائز' مدت کے بعد نئے ڈومینز کا رجسٹر کرانا تمام لوگوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ یہ امید کی جارہی ہے کہ اب ہزاروں کی تعداد میں نئے ڈومینز سامنے آئیں گے۔ فی الحال آئی کین 1800 سے زیادہ نئے ڈومینز کے ناموں پر غور کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ جس ڈومینز کی مانگ ہے وہ ہے 'ڈاٹ شاپ' جب کہ انتہائی مخصوص ڈومین 'ڈاٹ موٹر سائیکلز' کی بھی مانگ ہے۔ اس نئی تبدیلی کے ساتھ اب ٹریڈ مارک والی کمپنیاں اپنے نام کا ڈومین بھی شروع کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایپل، مٹسوبیشی اور آئی بی ایم جیسی بڑی کمپنیوں نے بھی ڈومین کے لیے درخواست دے رکھی ہے جب کہ انٹرنیٹ کی دنیا کی بڑی کمپنی گوگل نے 100 سے زیادہ ناموں کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 25 اکتوبر 2013

فرینکفرٹ اردو پنجابی مشاعرہ

فرینکفرٹ: گزشتہ دنوں جرمن شہر فرینکفرٹ میں پنجابی ادبی سنگت اور اردو جرمن کلچرل سوسائٹی کے زیر انتظام ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں پاکستان کے علاوہ کویت، متحدہ عرب امارات، انگلستان اور جرمنی سے اردو کے معروف شعرا نے شرکت کی۔ جرمنی میں اردو بولنے والی آبادی کی تعداد زیادہ نہیں، مگر اردو سے محبت کرنے والے وقتاً فوقتاً مشاعروں اور ادبی نشستوں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ان مشاعروں کا ایک مقصد تو اچھے اشعار سننے کے مواقع پیدا کرنا اور اپنے ذوق ادب کی تسکین ہوتا ہے مگر ایک اور مقصد مشرقی روایات و اطوار سے کم روشناس نئی نسل تک اپنے زبان و ادب کی شائستگی اور شگفتگی سے منتقلی بھی ہے۔ اس مشاعرے کی نظامت، جرمنی میں ادبی پروگراموں کے انعقاد میں سرگرداں اردو جرمن کلچرل سوسائٹی کے سربراہ عرفان احمد خان نے کی جب کہ صدارت ڈاکٹر عبدالغفور قریشی کو سونپی گئی۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 26 اکتوبر 2013

دوحہ قطر

عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ

دوحہ: عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم 'مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر' کے زیر اہتمام دوحہ شیرٹن ہوٹل کے السلوئ ہال میں 17 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم اور عالمی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ہندوستانی سفارت خانے کے سربراہ سنیل تھاپلیال کے ہاتھوں تاحیات اردو زبان و ادب کی گراں قدر اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ہندوستان سے ممتاز فکشن نگار نند کشور وکرم اور پاکستان کی نامور فکشن نگار نثار عزیز بٹ کو پیش کیا گیا۔ مجلس فروغ اردو ادب کے چیئرمین محمد عتیق نے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہندوستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پاکستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین مختار مسعود کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس فنکشن کے انعقاد میں خصوصی تعاون کے لیے وزارت ثقافت وفنون وتراث، دوحہ قطر کا شکریہ ادا کیا۔ محمد عتیق نے بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن (مرحوم) کی ہر دلعزیز شخصیت، ان کے عزم و استقلال اور ان کی لازوال خدمات کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ جاوید ہمایوں نے ایوارڈ یافتگان اور شاعروں کا خیر مقدم کیا۔ ہندوستانی سفارت خانے کے سربراہ سنیل تھاپلیال نے کہا کہ بیرون ممالک میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد سے اردو کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے اور اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوگا۔ نظامت کے فرائض فرتاش سید اور سید فہیم الدین نے ادا کیے۔ اس تقریب میں ایوارڈ یافتگان کی خدمات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ایک یادگاری مجلّہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ 17 ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب پذیرائی پروفیسر پیرزادہ قاسم کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد دی اور مجلس فروغ اردو ادب کی کوششوں اور حسن انتظام کو سراہا۔ آخر میں گلزار دہلوی کی صدارت میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی نظامت انور جلال پوری نے کی۔

دوحہ میں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب کا گروپ فوٹو

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 نومبر 2013

کمپیوٹر مراکز کے 10 ہزار طلبا کو روزگار سے جوڑا جائے گا

• کونسل کپل سبل کی شکرگزار: وسیم بریلوی • شروعات 50 مراکز سے ہوگی: خواجہ اکرام الدین

نئی دھلی: وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی، حکومت ہند نے قومی اردو کونسل کو ایک نیا پروجیکٹ تفویض کیا ہے۔ جناب کپل سبل نے خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے اردو بولنے والے علاقے اور افراد کو روزگار سے جوڑنے کے لیے اس پروجیکٹ کو منظوری دی۔ یہ پروجیکٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانک اور انفارمیشن ٹیکنالوجی (NIELIT)، چنڈی گڑھ کے باہمی اشتراک سے شروع کیا جائے گا، اس پروجیکٹ کے ذریعے پورے ہندستان میں موجود قومی اردو کونسل کے CABA-MDTP کے مراکز میں تعلیم حاصل کررہے 10 ہزار طلبا کو الیکٹرانک اور اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جائے گا۔

اس عظیم مقصد کی تکمیل اور مربوط لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے ہندوستان بھر سے ماہرین کو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں مدعو کیا گیا۔

پہلی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال دیوالی کی مبارکباد کے ساتھ کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کی اب تک کی کارگزاریوں کا مقصد اردو کے طلبا کو ماڈرن تکنیک سے جوڑ کر زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا نہ صرف اس عہد کی ضرورت ہے بلکہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑنا ہمارا اولین فرض بھی ہے اردو زبان سے جڑے ہر ایک فرد کے لیے یہ ایک اہم قدم ہے۔ اس پروجیکٹ کے لیے وائس چیئرمین نے جناب کپل سبل کا شکریہ ادا کیا، جن کی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے یہ پروجیکٹ ملا۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اس خاص موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب کونسل اپنے کمپیوٹر سینٹروں میں کمپیوٹر اور اردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار سے جڑی الیکٹرانک تعلیم اور ٹریننگ کا بھی اہتمام کررہی ہے۔ یہ ہمارے لیے بہت ہی فخر کی بات ہے کہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی مہم پر ہمارا کارواں رواں دواں ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم اردو کے ہر ایک طالب علم کو

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانک اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے اشتراک سے منعقدہ میٹنگ کا منظر

روزگار کے بہتر مواقع فراہم کریں اور ان میں خودشناسی اور خوداعتمادی کو فروغ دیں اور قومی اردو کونسل نے فروغ انسانی وسائل کے mandate کے مدنظر انسانی وسائل کی دستیابی کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ انھوں نے سینٹرل انفارمیشن ٹیکنالوجی اور وزیر موصوف جناب کپل سبل کا شکریہ ادا کیا۔

میٹنگ کی ابتدا میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر محترمہ شمع کوثر یزدانی نے کونسل کا ایک مختصر تعارف پیش کیا اور اس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔

اس پروجیکٹ "Skill development in Electronic Hardware" کی شروعات پہلے 50 سینٹروں میں کی جائے گی۔ 10 ہزار اردو طلبا اس ٹریننگ کا حصہ ہوں گے۔ ہر سینٹر سے 40 طلبا کو داخلہ دیا جائے گا کونسل کے CABA-MDTP سینٹروں میں پہلے سے کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کررہے طلبا کو خودکفیل بنانے کے مقصد سے یہ تربیت دی جارہی ہے۔ یہ تربیتی پروگرام ہندوستان میں ابتدائی طور پر پانچ ریاستوں یوپی، بہار، جھارکھنڈ، جموں کشمیر اور دہلی میں شروع کیا جائے گا۔ اس میں خاص کر معاشی طور پر کمزور اور محدود وسائل سے دوچار، دیہی علاقوں میں بسنے والے اردو طلبا توجہ کا مرکز ہوں گے۔ اس پروجیکٹ کا سب سے بڑا فائدہ اس طبقے کو پہنچے گا جو خود اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ NIELIT نے ایک ایسا نصاب تیار کیا ہے جس کے ذریعے فوری روزگار مل سکے گا۔

ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے ماہرین کے مفید مشوروں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہم ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرانا چاہتے ہیں جہاں اردو طلبا خودکفیل بن سکیں۔ آج کی اس میٹنگ میں جے این یو کے ڈاکٹر ڈی کے لوبیال، ڈاکٹر اے کے دیویدی، ڈائرکٹر NIELIT، چنڈی گڑھ، ڈاکٹر ایم پی پلئی، ڈائرکٹر NIELIT، کیرالہ، ڈاکٹر سنجیو گپتا، جوائنٹ ڈائرکٹر NIELIT، نئی دہلی، پروفیسر سی کے دیویدی، NIELIT الہ آباد، جناب ڈی کے جین، NIELIT، پنجاب، جناب روہت مہرہ، نئی دہلی، جناب بی رویندر، نئی دہلی، ڈاکٹر محمد یوسف، نئی دہلی، جناب اے خاں، نئی دہلی، جناب سید محمد احمد، جناب تبریز احمد، نئی دہلی، محترمہ سنیتا گوئل، ایڈیشنل ڈائرکٹر NIELIT، چنڈی گڑھ، ایم آئی صدیقی اور قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ، جناب فیروز احمد، جناب اجمل سعید نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 نومبر 2013

اردو کونسل کے کمپیوٹر مراکز کو آن لائن کیا جائے گا: خواجہ محمد اکرام الدین

نومبر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند۔ اردو زبان کو کمپیوٹر اور روزگار سے جوڑنے کے مقصد سے ملک بھر میں CABA-MDTP کے نام سے کمپیوٹر مراکز چلا رہی ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلے ان مراکز کی تعداد 467 ہے۔ 26 ریاستوں اور ایک Union Territory سمیت 203 اضلاع میں کونسل ان مراکز کے توسط سے اردو کمپیوٹر مہم کو آگے بڑھا رہی ہے۔ مراکز

اردو کونسل میں کمپیوٹر مراکز کے ذمہداران کے ساتھ میٹنگ کا منظر

کی اس تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے کونسل نے جولائی 2013 میں 45 نئے مراکز ملک کی مختلف ریاستوں میں قائم کیے ہیں۔ ان مراکز کے ذمے داران کی آج پہلی میٹنگ 'فروغ اردو بھون' میں منعقد ہوئی، جس میں یہ خوشخبری دی گئی کہ کونسل NIELIT، چنڈی گڑھ کے اشتراک ایک آن لائن سافٹ ویئر سسٹم فراہم کرے گی تاکہ تمام مراکز کو اس سسٹم سے جوڑا جا سکے۔ اس سسٹم کے تحت مراکز کے ذمے داران، رجسٹریشن، اساتذہ کی تقرری، داخلوں سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ آن لائن سسٹم اور کونسل کی جانب سے فراہم کردہ کمپیوٹرس میں اگر تکنیکی خرابی آتی ہے تو کونسل اپنے انجینئرس فراہم کرائے گی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ نئے مراکز انچارج اردو کمپیوٹر مہم کو آگے بڑھانے میں کونسل کی بھرپور معاونت کریں گے۔ ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے مراکز کے ذمے داران سے خطاب کرتے ہوئے کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے کہا کہ تمام سینٹر انچارج اپنے فیصلے بذات خود نہ لیں بلکہ ایک مانیٹرنگ کمیٹی قائم کریں اور اپنے تمام فیصلوں میں شفافیت لانے کے مقصد سے کمیٹی سے صلاح و مشورہ کریں۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ کمپیوٹر سینٹرز انچارج اپنے حساب کتاب اور دیگر کارکردگی سے متعلق تمام تر تفصیلات و اطلاعات اس آن لائن سسٹم کے ذریعے کونسل تک پہنچائیں۔ انھوں نے کہا کہ تمام مراکز کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرایا جاتا ہے لہٰذا تمام سینٹرز انچارج اپنے دستاویزات بالخصوص حاضری رجسٹر کارپس فنڈ سے متعلق کاغذات، کیش بک اور لیزر بک کو درست رکھیں اور ضروری معلومات بھی معائنہ ٹیم کے سامنے پیش کریں۔

میٹنگ میں ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے سینٹرز کے ذمے داران نے ان ہدایات اور ان اقدام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ کونسل کی تمام تر شرائط کا نفاذ اپنے مراکز میں کریں گے، کیونکہ آج کمپیوٹر ڈپلومہ کی فیس کے نام پر بڑی بڑی رقم وصول کی جاتی ہیں، جبکہ کونسل نے دیہی علاقوں میں صرف -/250 روپے ماہانہ اور میٹرو پولیٹن شہروں میں -/500 روپے ماہانہ فیس متعین کی ہے۔ جس کی بنا پر بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات کونسل کے CABA-MDTP پروگرام سے جڑ رہے ہیں۔

میٹنگ میں NIELIT، چنڈی گڑھ کے دیپک واسن نے اساتذہ کی تقرری امتحانات اور آن لائن سسٹم سے متعلق ضروری تفصیلات پیش کیں۔ NIELIT، کے دیگر ٹیکنکل اسٹاف کے علاوہ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، اجمل سعید، ریسرچ اسسٹنٹ انتخاب عالم اور ڈاکٹر محمد قاسم انصاری سمیت دیگر اسٹاف نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2 نومبر 2013

کمپیوٹر ٹکنالوجی اور ہنرمندی کے کورسیز سے جڑے بغیر اردو والوں کے لیے روزگار کی راہیں آسان نہیں

اردو کونسل ٹیکنیکل کمیٹی کی میٹنگ میں وسیم بریلوی اور خواجہ محمد اکرام الدین کا اظہارِ خیال

نئی دھلی: 8 نومبر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کے زیر اہتمام ٹیکنیکل کمیٹی کی میٹنگ 'فروغ اردو بھون' میں منعقد ہوئی، جس میں اردو کو کمپیوٹر ٹکنالوجی اور روزگار سے جوڑنے کے متعدد پہلوؤں پر غور و خوض کیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں انھوں نے کہا کہ یہ عہد کمپیوٹر ٹکنالوجی کا ہے اور اردو والوں کو اس سے جڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل نے ملکی سطح پر کمپیوٹر مراکز قائم کر کے اردو والوں کو اس ٹکنالوجی سے جڑنے کی راہیں ہموار کر دی ہیں اور اب تک ان مراکز سے کونسل کو بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ نتائج اردو کے روشن مستقبل کی ضامن ہیں۔

NIELIT چنڈی گڑھ اور متعدد ٹیکنیکل اداروں کے ذمے داران و ماہرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل نے ٹکنالوجی کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور مزید کامیابی کے لیے کونسل کوشاں ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کونسل کے 467 کمپیوٹر مراکز ملک کے طول و عرض میں قائم ہیں جہاں بڑی تعداد میں طلبہ CABA-MDTP کورس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان تمام مراکز کی نگرانی اور ان سے باخبر رہنا

اہم ترین ادبی کتابوں کی اشاعت اردو کونسل کی اولین ترجیح: خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی: 7 نومبر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو کی ہمہ جہت ترقی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے مقصد سے اردو زبان و ادب کی اہم ترین کتابیں شائع کرتی رہی ہے۔ اب تک کونسل ایک ہزار سے زائد مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کر چکی ہے بالخصوص سالِ رواں میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ جن میں زبان و ادب کے کلاسیکی سرمائے سے لے کر عہد حاضر کے ادبی موضوعات شامل ہیں۔ کونسل کی ان تمام اشاعتی خدمات کو ملکی و بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔ اس مشن کو مزید آگے

قومی اردو کونسل میں لٹریچر پینل کی میٹنگ کا منظر

بڑھاتے ہوئے کونسل کے زیر اہتمام ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد 'فروغ اردو بھون' میں کیا گیا، جس میں تقریباً سو سے زائد مسودات و کتابوں پر غور و خوض کیا گیا۔ اردو ادب پینل میٹنگ کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین جناب پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔

پینل کے تمام اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل ملک کے مصنفین ادیبوں و شاعروں کی معیاری کتابوں کو اپنے اشاعتی ایجنڈے میں شامل کر کے شائع کرتی رہی ہے اور مالی تعاون بھی دیتی ہے تاکہ اردو کتابوں کو فروغ دیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ رواں سال کے دوران اب تک ادب پینل کے تحت تیرہ نئی اہم ترین کتابیں کونسل سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں کلیات میر، کلیات مصحفی، کلیات جوش، کلیات سجاد ظہیر، کلیات عبد الماجد دریابادی کے علاوہ کئی اہم ترین تصانیف شامل ہیں۔ ممبران نے اس بات پر بھی کونسل کی توجہ مبذول کرائی کہ نصابی کتابوں کی بہت کمی ہے اس لیے کونسل نصابی کتابوں کو شائع کرے۔ اس سلسلے میں جلد ہی ایک میٹنگ بلائی جائے گی تاکہ ایک جامع فہرست تیار کی جا سکے اور اشاعتی کام شروع کیا جا سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حالیہ بین الاقوامی کانفرنس کے دوران عالمی سطح پر اردو کتابوں کے تبادلے پر زور دیا گیا تھا جس کے پیش نظر 'مجلس ترقی ادب' پاکستان نے کئی اہم مطبوعات کے تعلق سے کونسل سے رجوع کیا ہے۔ پینل اراکین نے اس قدم کی ستائش کی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی سمیت متعدد اراکین نے کہا کہ کونسل 'مجلس ترقی ادب' پاکستان سے شائع معیاری اور اہم ترین کتابوں کو اپنے اشاعتی ایجنڈے میں شامل کرے اور اس سلسلے میں مزید پیش قدمی کرے تاکہ اردو طلبہ و قارئین زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے مزید کہا کہ کونسل اپنے اشاعتی پروگراموں میں مزید شفافیت لائے گی۔ میٹنگ میں نادر و نایاب ریڈیائی اردو پروگراموں کو بھی اشاعتی ایجنڈے میں شامل کرنے پر غور و خوض کیا گیا۔

میٹنگ میں پروفیسر انور پاشا، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، پروفیسر سید مسعود سراج، ڈاکٹر محبوب اقبال، ڈاکٹر مشتاق احمد نے شرکت کی اور زبان و ادب سے متعلق زیر غور کتابوں و مسودات پر اپنی آرا پیش کیں۔

علاوہ ازیں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، ریسرچ اسسٹنٹ محمد انصر، ڈاکٹر قاسم انصاری سمیت کئی لوگوں نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 نومبر 2013

قومی اردو کونسل کی میٹنگ میں کمپیوٹر ٹکنالوجی اور ہنرمندی کو جوڑنے کی تدبیر پر غور کرتے شرکا

ایک مشکل ترین عمل ہے اس لیے جلد ہی ان تمام مراکز کو آن لائن سسٹم سے جوڑ دیا جائے گا تاکہ مراکز کی کارکردگی بالخصوص ماہانہ رپورٹ، امتحانات، داخلے اور دیگر امور کی معلومات کونسل کو براہ راست حاصل ہو سکے۔ انھوں نے ماہرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کے بھرپور تعاون اور مدد کی بنا پر ہی کونسل اس میدان میں کامیابی حاصل کر سکی ہے۔ کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے ٹیکنیکل کمیٹی کی اب تک کی کارکردگی اور گزشتہ میٹنگوں کی روشنی میں لیے گئے اقدام سے اجلاس سے واقف کرایا اور مستقبل قریب کے منصوبوں کی تفصیلات پیش کیں۔

NIELIT چنڈی گڑھ کے سسٹم انالسٹ جناب دیپک واسن نے آن لائن سسٹم کی تکنیکی باریکیوں پر روشنی ڈالی انھوں نے کہا کہ اس سسٹم کی مدد سے طلبہ بھی اپنا فیڈ بیک کونسل کو بھیج سکیں گے۔ میٹنگ میں نیشنل انفارمیٹک سینٹر کے عہدیدار جناب دیوان ہیوم خان کے علاوہ اے خان پروفیسر سید جمیل، ڈاکٹر لوبیال، بادشاہ خان، NIELIT چنڈی گڑھ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سنجیو گپتا، ڈاکٹر ایس اطہر حسین، ڈاکٹر رضوان الرحمٰن، محمد انوار خاں کے علاوہ کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری سمیت متعدد اسٹاف کے دیگر عہدیداران نے شرکت کی۔ پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 نومبر 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو ایک تہذیب کا نام ہے: حفیظ رحمانی

سیتاپور: اردو کسی زبان کا نام نہیں بلکہ اردو ایک تہذیب کا نام ہے اور جب کسی تہذیب پر زوال آتا ہے تو پورا معاشرہ منتشر ہوجاتا ہے۔ معاشرہ کے منتشر ہونے کے جو اثرات سماج میں رونما ہوتے ہیں ان کا حل تلاشنا ناممکن سا ہوجاتا ہے۔ مذکورہ بات قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے صدر جلسہ مشہور شاعر وصحافی مست حفیظ رحمانی نے قصبہ خیرآباد میں کہی۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کی لڑائی سے لے کر آج تک اردو نے جس طرح قومی یکجہتی کو فروغ دیا ہے کسی دوسری زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ وہی زبان ہے جس نے تمام مذاہب کے رہنماؤں کی شان میں قصیدے پڑھے ان کی عظمت کے پرچم بلند کیے اور تمام مذہب وملت کو مضبوطی کے ساتھ ایک دھاگے میں پرونے کا کام انجام دیا ہے۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا آفتاب عالم ندوی نے کہا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑا جانا چاہیے۔ جلیس احمد ایڈوکیٹ نے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اردو کو پرائمری سے مڈل کلاس تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جانے کی وکالت کی۔ دوسری زبانوں کی طرح سے ہی سرکاری اسکولوں میں اردو کی درسی کتب بھی بچوں کو مہیا کرائی جانی چاہیے تاکہ اس میں پیدا ہونے والا امتیاز ختم کیا جاسکے۔ سیمینار میں عبدالقیوم انصاری، انوار سیتاپوری، ڈاکٹر عزیز خیرآبادی، سلیم اختر، شاکر علی، آشیش مصرا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کے اختتام کے فوراً بعد منعقدہ شعری نشست میں مقامی و بیرونی شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ سیمینار ومشاعرہ کی کامیاب نظامت مجاز سلطانپوری ومولانا اطہر کملاپوری نے بحسن وخوبی انجام دی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم اکتوبر 2013

اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب

جلگاؤں: یہاں ادارہ شاہین لائبریری کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مہاراشٹر راجیہ ساہتیہ اردو اکادمی کے اشتراک سے دو روزہ محفل شعر وافسانہ، رسم رونمائی اور 'اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب' موضوع کے تحت سیمینار کا انعقاد ہوا۔ اردو مراٹھی محفل شعر وافسانہ میں نمائندہ افسانہ نگار وشعرا نے منتخب تخلیقات پیش کیں۔ رشید قاسمی، قیوم اثر، معین الدین عثمانی، وحید امام، مشتاق کریمی، ڈاکٹر نسیم دیشمکھ، علی انجم رضوی، سہیل اختر رحمانی اور مراٹھی کے افسانہ نگار گوپی چند دھنکر نے اپنی

'اکیسویں صدی میں اردو زبان وادب' کے تحت منعقدہ پروگرام کا منظر

کہانیاں اور افسانے پیش کیے۔ شکیل انجم، اخلاق نظامی، مشتاق ساحل، اشوک کوتوال اور نامدیو کولی نے شعری کاوشیں پیش کیں۔ سلام بن رزاق نے تمام افسانوں اور کہانیوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے انھیں آج کے دور کی کہانی اور افسانے سے تعبیر کیا۔ سلیم شہزاد، خورشید حیات، عظیم راہی، نورالحسنین اور دیگر معزز افراد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں وحید امام کے افسانوی مجموعے 'لخت لخت زندگی' کی رونمائی سلام بن رزاق کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے بعد مقالہ خوانی کے دور میں شیخ یامین رفیق نے 'خاندیش میں اردو نثر کا ارتقا' موضوع کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو افسانہ آج اور کل کے آئینے میں عنوان پر خورشید حیات نے افسانے کے ادوار پر اظہارِ خیال کیا۔ نورالحسنین نے اپنے مقالے میں ناول نگاری کی مختصر تاریخ بیان کی۔ تیسرے اور آخری اجلاس کا اولین مقالہ سجاد حیدر نے بعنوان 'اردو تنقید منزل بہ منزل' پیش کیا۔ ڈاکٹر عظیم راہی نے 'اردو میں افسانچے کی روایت' موضوع کے تحت افسانچے کی موجودہ صورت حال ومسائل سے آگاہ کیا۔ مدیر بیباک احمد عثمانی نے اپنا مقالہ 'اردو کی ادبی صحافت ایک جائزہ' پیش کیا۔ محمد فاروق اعظمی نے صدارتی خطبے میں تمام مقالوں کا تجزیہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' نئی دہلی، 13 نومبر 2013

'بہار میں اردو غزل' پر سیمینار

دربھنگہ: مقامی ملت کالج دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے دو روزہ سیمینار بعنوان 'بہار میں اردو غزل- سمت و رفتار' منعقد ہوا جس کی صدارت شاعر وادیب ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے کی جب کہ مہمان خصوصی انچارج وائس چانسلر ڈاکٹر ایس آئی جھا نے کی اور پروفیسر اسلم آزاد اور وجے پرساد سنگھ (رجسٹرار ایل این ایم یو) نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے اس موضوع پر سیمینار کی ضرورت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ملت کالج کی یہ روایت رہی ہے کہ نئے موضوعات کو تلاش کرکے اسکالرس کو اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے۔ پروفیسر اسلم آزاد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ایسی تعلیم دی جارہی ہے جو صارفی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ نئی نسل اپنی زبان اور تہذیب وروایت سے ناواقف ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے خود اردو والوں کو سرگرم رہنا ہوگا کیونکہ سرکاری کرم فرمائیوں پر کوئی زبان زندہ نہیں رہتی ہے۔

انھوں نے اپیل کی کہ ہمیں اپنی زبان کی حفاظت یہودیوں کی طرح کرنی چاہیے کہ وہ کم تعداد میں رہ کر بھی صدیوں تک اپنی زبان کی آبیاری کرتے رہے اور زندہ رکھا ہے۔ جب کہ مہمان خصوصی پروفیسر ایس آئی جھا نے کہا کہ اس طرح کے پروگراموں سے درس گاہوں میں تعلیمی مزاج پیدا ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسری زبانوں اور علوم پر بھی اس طرح کے پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ ہر زبان اور علوم کے اساتذہ طلبہ سرگرم رہیں۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے اپنا خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے بہار میں اردو غزل کی سمت و رفتار کا جائزہ لیے جانے کو ضروری قرار دیا۔ کیونکہ اردو غزل کی ارتقا میں بہار کے شعرا نے جو اہم کردار ادا کیے وہ سامنے آئے اور اس کا مناسب مقام متعین ہو۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر افتخار احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔ پروگرام میں طلبہ واساتذہ سمیت سیکڑوں کی تعداد میں اندرون و بیرون بہار کے دانشوران نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر انیس الرحمان نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اکتوبر 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

اگر زبان نہیں ہوتی تو انسان کا وجود ممکن نہیں ہوتا: شمس الرحمٰن فاروقی

نئی دہلی: ہر زبان میں ایک تہذیب، روایت، ثقافت اور اپنے دور کے حالات و واقعات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر علاقے میں بولی جانے والی زبان کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ اگر زبان نہیں ہوتی تو انسان کا وجود ممکن نہیں ہوتا۔ زبانیں انسانی احساسات، جذبات و خیالات

کا اظہار کرنے کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ مگر آج زبانوں کو لوگوں کو جوڑنے کی بجائے توڑنے کے کام کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ زبان کسی کو توڑنے یا جوڑنے کا کام نہیں کرتی بلکہ یہ کام تو انسان خود کرتے ہیں کسی بھی زبان کو اس طرح استعمال کرنا کہ وہ لوگوں میں انتشار پیدا کردے اس میں قصور ہمارا ہی ہے زبان کا نہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف اردو اسکالر، نقاد و محقق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقدہ ہندوستانی زبانوں کے تیسرے 'سمنوے آئی ایچ سی لنگویج فیسٹول' میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ 'جوڑتی زبانیں، جڑتی زبانیں، لنگویج کنکشن' کے موضوع پر منعقد اس 4 روزہ ادبی فیسٹول میں مختلف موضوعات کے 20 سے زائد اجلاس میں ہندوستان کی 20 زبانوں و بولیوں کے 90 سے زائد مقررین اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اس سے قبل پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، ہندی کے معروف ادیب و نقاد ونود کمار شکل، این بی ٹی ڈائرکٹر ایم اے سکندر، راج لبراہن، گری راج کیراڑو و دیگر مہمانان نے شمع روشن کر کے لنگویج فیسٹول کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس موقعے پر ایم اے سکندر نے تمام ہندوستانی زبانوں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس کے ادب کو ہر ہندوستانی و ہر شخص تک ترجمہ کی مدد سے پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کو بخوبی سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں یہ بات ہمیشہ دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اگر ہم اپنی زبان کھودیں گے تو ہم اپنی شناخت بھی کھودیں گے۔ اس موقعے پر فیسٹول کے ڈائرکٹر راج لبراہن نے لنگویج فیسٹول کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے تعلق سے اٹھنے والے سوالات کا جواب تلاش کرنا اور ان زبانوں کے بولنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اس فیسٹول کا بنیادی مقصد ہے۔ اس موقعے پر گری راج کیراڑو، ستیہ نند نروپم و دیگر ادیبوں و سرکردہ شخصیات نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ بعد ازاں گجراتی زبان کے معروف ادیب و دانشور چندر کانت ٹوپی والا کو اس سال کے پہلے 'سمنوے لنگویج ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اکتوبر 2013

عربی زبان کے فروغ پر جامعہ ہمدرد میں سیمینار

نئی دہلی: 'عربی زبان کا یہ امتیاز رہا ہے کہ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کا رسم الخط عربی رہا ہے، عربی کے بہت سے الفاظ جیسے عدالت، دین، دنیا، فساد، فرصت، غسل، غزل وغیرہ ان زبانوں میں منتقل ہوئے، گرچہ بعض اوقات ان کے معانی بدل گئے اور صرف اسی

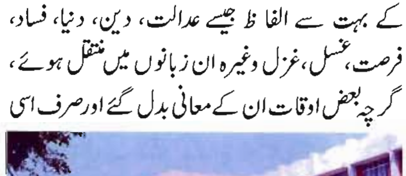

پر بس نہیں، بلکہ بعض عربی تعبیرات نے بھی اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ وہ ہندوستان میں زبان زد ہوگئے اور ہندوستانی فلموں میں بھی استعمال ہونے لگے، جیسے انشا اللہ، ماشاء اللہ، الحمدللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، استغفراللہ وغیرہ،' ہندوستان میں عربی زبان پر بولتے ہوئے سینئر اسکالر ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے یہ باتیں اسلامک فقہ اکادمی انڈیا کے زیر اہتمام جامعہ ہمدرد کے کنونشن سنٹر میں منعقدہ ایک سیمینار میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ 'اسی طرح ملک کے بڑے بڑے کتب خانوں میں مخطوطات کا ذخیرہ ان کتب خانوں کی شناخت بن گیا، عربی زبان کی ادبی، علمی، فقہی، ثقافتی اور فکری خدمات نے بھی اس ملک کو علمی دنیا میں نمایاں مقام عطا کیا، اس لیے آج تک مجمع بحارالانوار، تحفۃ المجاہدین، تفسیر الرحمان، وتیسیر المنان، مسلم الثبوت، تاج العروس، سواطع الالہام، حجۃ اللہ البالغہ اور نزہۃ الخواطر وغیرہ پوری علمی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جاتی ہے۔' سیمینار میں ہندوستان کے بڑے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے نمائندہ افراد نے شرکت کی، جب کہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم اور انٹیگرل یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی نے سیمینار کی صدارت کی۔ اسلامک فقہ اکادمی کے سکریٹری برائے سیمینار مولانا مفتی محمد عبیداللہ اسعدی نے اکادمی کی طرف سے تمام مہمانوں اور نمائندوں کا استقبال کرتے ہوئے اکادمی کے مقاصد کا مختصراً تعارف بھی کرایا۔ اس موقعے پر خطاب کرنے والوں میں افلوحیدر آباد کے سابق صدر شعبہ عربی پروفیسر محسن عثمانی ندوی، آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربی ٹیچرس و شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے موضوع کی مناسبت سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ سیمینار کی مختلف نشستوں میں درجنوں اساتذہ اور اسکالروں نے اپنے مقالات پیش کیے، جن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر ڈاکٹر حبیب اللہ خان، ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی، پروفیسر ایوب تاج الدین، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر فوزان، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نعیم الحسن، ڈاکٹر اکرم، ڈاکٹر مجیب اختر، پی ایچ ڈی اسکالر صدرالاسلام، قمرالدین قاسمی، جسیم الدین قاسمی، جے این یو سے پروفیسر اسلم اصلاحی، ڈاکٹر قطب الدین، پی ایچ ڈی اسکالر عبدالرحمٰن نے اپنے مقالات پیش کیے۔ علاوہ ازیں کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹر شاد حسین دارالعلوم دیوبند سے مفتی عارف جمیل قاسمی، مفتی ساجد قاسمی اور مفتی اشرف عباس نے آخری نشست میں اپنے مقالات پیش کیے۔ سیمینار

کے اخیر میں ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے قرارداد پیش کی، جب کہ مفتی نادر القاسمی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 نومبر 2013

ہمدرد یونیورسٹی کے پانچ مراکز دہلی سے باہر کھولنے کا اعلان

نئی دھلی: ہم نے ان تمام یونیورسٹیز کے وائس چانسلرز کو مشاورتی خطوط لکھے ہیں، جہاں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ہے کہ ایک منصوبہ بند جدید نصاب تعلیم کے تحت ایک ایسا نظام تعلیم و تحقیق بنایا جائے جو ملک وملت اور ہندوستانی سماج پر اثر انداز ہو، ایک ایسی جماعت تیار کرنے کی ضرورت ہے جو تمام بین المذاہب اور بین الاقوامی اسلامی مسائل اور عصری مذاکرات میں کلیدی رول ادا کرے۔ شعبۂ اسلامیات جامعہ ہمدرد کے زیر اہتمام ریسرچ اسکالرز آف اسلامک اسٹڈیز کے دوسرے سالانہ دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں جامعہ ہمدرد کے وی سی ڈاکٹر غلام نبی قاضی نے یہ باتیں کہیں اور اپنے صدارتی خطاب میں یہ اعلان کیا کہ بہت جلد دہلی کے علاوہ پانچ دوسرے صوبوں میں بھی ہمدرد یونیورسٹی کے سینٹرز قائم ہوجائیں گے، جس کی ابتدا کیرل سے ہو رہی ہے پھر آسام پھر کشمیر پھر بہار۔ سیمینار کا آغاز ڈاکٹر محمد احمد نعیمی کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر صفیہ عامر نے نظامت کی اور صدر شعبۂ اسلامیات پروفیسر غلام یحییٰ انجم مصباحی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر انجم نے بھی ایک خوش خبری سنائی کہ شعبۂ اسلامیات میں ایک نئے شعبے مرکز ایران شناسی کا قیام ہوگیا ہے جس کا افتتاح مہمان خصوصی ڈاکٹر علی فولادی کلچرل کونسل اسلامی جمہوریہ ایران نئی دہلی کرنے جا رہے ہیں۔ اس میں داخلہ کی کارروائی مکمل ہوچکی ہے اور تدریس اسی ہفتے میں شروع ہوجائے گی۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے کہا کہ قومی کونسل میں عربی اور فارسی زبان وادب کے ساتھ اسلامیات کا بھی پینل بن گیا ہے، ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اس قومی سیمینار کے پہلے اور موجودہ اجلاس میں جتنے مقالات پیش کیے گئے ہیں، ان کو ایڈٹ کرکے مرتب کریں، قومی کونسل کے مالی تعاون سے ان کی طباعت ہوگی۔ مہمانِ خصوصی نے یونیورسٹیز آف انڈیا کے ذمے داروں سے کہا کہ جب دوسرے پروفیشنل اور ٹیکنیکل شعبوں میں پوزیٹیو رزلٹ اور کوالیٹی کا خیال رکھتے ہیں تو پھر اسلامیات کے شعبے کو نظر انداز کرنے کی کیا وجہ ہے؟ افتتاح کے بعد سیمینار کی پہلی اور دوسری نشست میں آٹھ مقالات پیش کیے گئے جس میں جامعہ ہمدرد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور یونیورسٹی آف کشمیر کے ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی اور مذکورہ اداروں کے اساتذہ نے جج کے فرائض انجام دیے۔ پہلی نشست کے چیئرمین تھے پروفیسر رضی احمد کمال صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نظامت محمد ظفر الدین برکاتی نے کی، جب کہ دوسری نشست کے چیئرمین پروفیسر نسیم احمد شاہ یونیورسٹی آف کشمیر اور نظامت محمد جعفری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2013

▲ 'معاشرے کی بیداری میں اردو میڈیا کا رول' کے پروگرام میں شافع قدوائی خطاب کرتے ہوئے، جب کہ اسٹیج پر مرزا ذکی بیگ، مولا بخش اسیر، اسد مرزا، مولانا ابوالکلام قاسمی، مشرف عالم ذوقی ودیگر

معاشرے کی بیداری اردو میڈیا پر سیمینار

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین کے غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'تعمیر ملت فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام ایک قومی سیمینار بعنوان 'معاشرے کی بیداری میں اردو میڈیا کا رول' کا انعقاد کیا گیا جس میں دانشوروں نے اردو صحافت کو عوامی زندگی کا عکاس اور وقت کا نباض بتاتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت نے انسانیت، اخلاق ومروت اور عام انسانوں کے دکھ درد کو سامنے لاکر معاشرے میں بیداری کا اہم ثبوت فراہم کیا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہت زیادہ مل جائیں گی۔ پروگرام کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ ماس کمیونی کیشن کے چیئرمین پروفیسر شافع قدوائی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض محفوظ عالم ندوی اور مولانا مرزا ذکی بیگ نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اس موقع پر روزنامہ انقلاب نارتھ کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی نے صحافت کی قدروں اور صحافتی ذمے داریوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ صحافت میں صرف اخبار سے جڑے افراد کا ہی رول نہیں ہوتا بلکہ عام انسانوں کا بھی اہم رول ہوتا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عوامی بیداری لانے کے لیے عام آدمی بھی صحافت کے ساتھ اپنا کردار ادا کرے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت فرقہ واریت اور تشدد سے دور رہی ہے۔ اس موقع پر برٹش جائزہ کے ایڈیٹر مسٹر اسد مرزا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام میں اردو صحافت کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مختلف شاخوں پر مقالات بھی پیش کیے گئے۔ پروگرام میں مولانا ابوالکلام شمسی، پٹنہ، معروف فکشن نگار، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر فریاد آزر، ڈاکٹر ایم اے باقی، ڈاکٹر سجاد اختر، اسد مرزا، معروف ادیب وشاعر اور کالم نگار تحسین منور، بسمل عارفی، ڈاکٹر امتیاز فریدی، ڈاکٹر راغب اختر، ڈاکٹر افتخار الزماں، ڈاکٹر شکیل حبیبی، خاور حسن، حبیب سیفی اور محفوظ عالم نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ صحافت کے بغیر آج زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاس جو بھی معلومات ہوتی ہیں وہ سب صحافت کے ذریعے ہی پہنچتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میڈیا معاشرے میں اس حد تک داخل ہوچکا ہے کہ اب معاشرے کا سمت سفر طے کرنے میں بھی اہم رول ادا کررہا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے اردو میڈیا کی سماجی بیداری پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اخبارات سماجی بیداری کی طرف کوشاں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اکتوبر 2013

اردو میڈیا کی تقویت وقت کا تقاضہ

نئی دھلی: انگلش اور ہندی میڈیا کی طرح اردو میڈیا اتنا آگے نہیں بڑھ سکا۔ اردو میڈیا کے ساتھ کچھ پریشانیاں ہیں جنھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو وہی پرموٹ کرے گا جو اس سے محبت کرتا ہے، اردو اخبارات کی بقا کے لیے مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ انھوں نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ سینٹر اور نوبل ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے اب تک 6 ہزار بچوں کو ٹریننگ دی، جس میں سے 60 فیصد بچے روزی روٹی سے جڑ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ 184 بچوں میں سے 18 بچوں کی سرکاری نوکری لگ چکی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 نومبر 2013

ساتھ ساتھ روزنامہ راشٹریہ سہارا و عالمی سمے چینل کے گروپ ہیڈ سید فیصل علی، سنند پشکر، سیدہ سیدین حمید اور مشہور فلمی وسیاسی شخصیت وممبر پارلیمنٹ شتروگھن سنہا نے بھی شرکت کی۔ تمام معزز مہمانوں کا استقبال ہائی کمشنر برائے پاکستان سلمان بشیر نے کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اکتوبر 2013

رام پور رضا لائبریری میں منعقدہ بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتی چیف گیسٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شعبۂ فارسی کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت

رام پور رضا لائبریری میں بین الاقوامی سیمینار

رامپور: خانقاہوں کا مقصد تعلیم دینا اور تہذیب سکھانا تھا۔ نیز صوفیائے کرام جوڑنے کی بات کیا کرتے تھے اور انگریز تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار رضا لائبریری رامپور کے ڈائرکٹر پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی نے کیا۔ وہ رامپور رضا لائبریری کے سہ روز انٹرنیشنل سیمینار بعنوان 'ملفوظات صوفیا ہندوستان- ہندوستانی وثقافت کے مآخذ' پر خطاب کرر ہے تھے۔ انھوں نے اس موقعے پر کہا کہ خانقاہوں کے ذریعے لوگوں کو دین کی تعلیم دی گئی اور دین دار اور مہذب بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ صوفیائے کرام نے خانقاہوں میں مدارس کی داغ بیل ڈالی اور ان مدارس کے دروازے خاص طور پر غربا کے لیے کھولے گئے تاکہ علم کی روشنی جگمگانے لگے اور لوگ تعلیم یافتہ ہوں کیونکہ تعلیم کے بغیر انسانی زندگی بھی ناقص ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملفوظات میں 'فوائد الفواد' اور 'خیر المجالس' یہ دو اہم اور بڑی کتابیں ہیں۔ صدر مجلس پروفیسر آزرمی دخت صفوی ڈائرکٹر پرشین انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ صوفیائے کرام کے ملفوظات ان کے اقوال و حالات کو پڑھنا، سمجھنا اور اپنی روزمرہ زندگی میں اتارنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان کے یہاں اتحاد و اتفاق محبت واخوت اور بھائی چارگی کا سبق ملتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید لیاقت حسین معینی سجادہ نشیں درگاہ معین الدین چشتی شعبہ تاریخ اے ایم یو نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ آخر میں پاکستان سے تشریف لائے معروف اسکالرس ڈاکٹر حمیرہ ناز نے ہندوستانی اور پاکستانی صوفیاء اور ان کے ملفوظات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر انسان کچھ بننا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ صوفیا کی تعلیمات کا مطالعہ کرے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ اس سیمینار کا آغاز ڈاکٹر انوار الحسن کے ذریعے قرآن پاک کی تلاوت سے کی گئی۔ نعت نبی کریمؐ کا نذرانہ بارگاہ رسالت میں سید نوید قیصر نے پیش کیا۔ پروگرام کا افتتاح پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے شمع روشن کر کے کیا۔ مہمانوں کا استقبال صنم علی خاں، ڈاکٹر تبسم صابر، احداللہ خاں آزر نعمانی نے گلدستہ پیش کر کے کیا۔ آخر میں کوآرڈی نیٹر شجاع الدین نے مہمانان وشرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار میں ڈاکٹر عابد رضا خاں بیدار سابق ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ، چیف میڈیکل آفیر ڈاکٹر رمیش کمار ورما، ڈاکٹر شعائراللہ خاں ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء وجیہ، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، ڈاکٹر تنویر احمد خاں، مولانا اسلم جاوید قاسمی، سعادت اللہ خاں، اظہر عنایت وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2013

پاکستانی ہائی کمیشن میں شامِ غزل

نئی دھلی: چانکیہ پوری میں واقع پاکستانی سفارت خانہ میں ایک 'شام غزل' کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہرۂ آفاق گلوکار غلام علی نے اپنی مترنم آواز میں کئی غزلیں پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیا۔ واضح رہے کہ پاکستانی سفارت خانہ کی جانب سے پہلے بھی اس طرح کے تہذیبی وثقافتی پروگرام پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ سفارت خانہ کے پریس اتاشی منظور علی میمن کے مطابق اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد کا اصل مقصد دونوں ممالک کے عوام کو تہذیبی و ثقافتی سطح پر مزید قریب کرنا اور خوشگوار آپسی تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی ممالک کے فنکاروں نے دوطرفہ رشتوں کو بہتر بنانے اور ماحول کی کشیدگی کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جہاں ایک طرف پاکستان میں ہندوستانی فلموں اور اداکاروں کے تئیں ایک مثبت فکر پائی جاتی ہے وہیں دوسری طرف پاکستان کے غلام علی، مرحوم مہدی حسن، مرحوم نصرت فتح علی خاں، عدنان سمیع سمیت کئی گلوکاروں کو ہندوستان میں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ اس پروگرام میں مشہور صحافی شیکھر گپتا اور شاہد صدیقی کے

ادیب ماہر، انٹرمیڈیٹ کے مساوی

الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کا خیر مقدم

علی گڑھ: الہ آباد ہائی کورٹ نے ایک ایسا تاریخی فیصلہ صادر فرمایا ہے جس سے مستقبل میں اردو داں افراد کے لیے بھی ترقی کی راہیں واہوں گی اور ان کو ملک کے قومی دھارے میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ اردو علی گڑھ کے اوایس ڈی مسٹر فرحت علی خاں نے کیا۔ وہ آج جامعہ اردو علی گڑھ میں الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد عدلیہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منعقدہ میٹنگ سے خطاب کرر ہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ الہ آباد ہائی کورٹ نے جامعہ اردو علی گڑھ کی ادیب

ماہر کی سند کو یو پی بورڈ کے انٹرمیڈیٹ کے مساوی تسلیم کر کے نہ صرف اردو زبان کی عظمت بلکہ جامعہ اردو کی 74 سالہ خدمات کو بھی تسلیم کیا ہے جس کے لیے تمام اردو طبقے عدالت کا ممنون و مشکور ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ڈائرکٹر جسیم محمد نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ انتظامیہ طویل عرصے سے جامعہ اردو علی گڑھ کی اسناد کو مساوی درجہ دلانے کے لیے جدو جہد میں مصروف ہے اور عدالت نے اس ادارے کی ادیب ماہر کی سند کو مساویت عطا کر کے ان کوششوں کو تقویت بخشی ہے۔

اشتیاق انصاری کو 5 مئی 1995 کو اردو مترجم کی ملازمت ملی تھی اور 15 مئی 1995 کو ان کو یہ کہہ کر ہٹا دیا گیا کہ یہ اسناد انٹر اور بی اے کے مساوی نہیں ہیں۔ اشتیاق انصاری نے عدالت سے رجوع کیا اور رٹ داخل کی۔ بالآخر 18 سال بعد ان کو کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ جیت صرف اشتیاق انصاری کی جیت نہیں ہے بلکہ اس جیت نے ادیب ماہر اور ادیب کامل کی اسناد رکھنے والے

ہزاروں افراد کے راستے ہموار کردیے ہیں اور اب ان افراد کو مستقبل میں اس سلسلے سے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' ہند، دہلی، 7 اور 24 اکتوبر 2013

اکادمی برائے اساتذہ کی ورکشاپ

نئی دہلی: اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ نئی دہلی ایک ایسا ادارہ ہے جو جدید تدریسی طریقہ کار کا فروغ، تعلیمی مسائل کا حل اور تعلیم و تدریس سے متعلق مواد کی فراہمی جیسے امور پر ورکشاپ، سیمینار، مباحثہ اور پیٹشن پروگرام کا انعقاد کرتا رہتا ہے، دہلی کے مدارس کے اساتذہ کے لیے دس روزہ رخ ساز اور پیٹشن کورس اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موصولہ اطلاع کے مطابق اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر علی نے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کی، پروفیسر وہاج الدین علوی صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ السلامیہ بہ طور مہمان خصوصی اس اجلاس میں شریک ہوئے، نظامت کے فرائض ڈاکٹر واحد نظیر نے انجام دیے، ڈاکٹر مزمل حسین قاسمی نے اس دس روزہ کورس کی تفصیلی رپورٹ پیش کی، اس موقعے پر ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اپنی غزل پیش کی اور ڈاکٹر حنا آفریں نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کے مہمان خصوصی نے اپنے خطاب میں کہا کہ علم کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ افادیت و اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ایک کل جزو کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ صدر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مدارس کے فارغین کی ذہانت اور قوت حافظہ میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ قرآن کے تیس پارے اپنے سینے میں محفوظ رکھتے ہیں، یہ طلبا اگر مقابلہ جاتی امتحانوں کی طرف راغب ہوں تو بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 اکتوبر 2013

انڈیا اسلامک سینٹر میں سرسید لیکچر

نئی دہلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان صرف ایک دانشور ہی نہیں بلکہ ایک انتہائی جری رائٹر بھی تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب برٹش حکومت انتہائی بربریت پر اتری ہوئی تھی انھوں نے 'سرکشی بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' لکھ کر اپنی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ یہ بات آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'سرسید خصوصی لیکچر' کے دوران رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر عزیز الدین احمد نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہی۔

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے سرسید احمد کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان کی تعلیمی اور علمی خدمات کا عہد حاضر کی کسی اور شخصیت سے موازنہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہم سب کی ذمے داری ہے کہ نئی نسل کے لیے بہتر سے بہتر تعلیمی ادارے قائم کریں۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان نے صدارتی تقریر میں کہا کہ سرسید شروع سے ہی جدید تعلیم کے حامی تھے۔ 1857 میں غدر کے بعد جو حالات تھے اور پورے ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا تب ہی سرسید نے ماحول کو بھانپ کر یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اگر اب مسلمانوں نے جدید تعلیم کی جانب توجہ نہیں دی تو پیچھے رہ جائیں گے۔ اپنی اسی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے وہ برطانیہ تک سے ٹیچر لے کر آئے تاکہ مسلمان اعلیٰ اور جدید تعلیم حاصل کر کے ترقی کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی ملک میں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی جانب توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے اور انھیں خود کو نئی ٹیکنالوجی سے ہمکنار کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 اکتوبر 2013

ذاکر حسین دہلی کالج: کبیرا کھڑا بازار میں

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں 'آرٹ اینڈ کلچر سوسائٹی' کی جانب سے ہندی کے مشہور تخلیق کار بھیشم ساہنی کا ڈرامہ 'کبیرا کھڑا بازار میں' پیش کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر دنیش سنگھ نے مہمانِ خصوصی کے طور پر شرکت کی جب کہ دہلی یونیورسٹی کی رجسٹرار الکا شرما بھی بطور خاص موجود تھیں۔ پروفیسر دنیش سنگھ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی کا تہذیبی و ثقافتی ورثہ ہے۔ کالج کی اپنی ایک کشش ہے، جس کے باعث آدمی خود بخود کھنچا چلا آتا ہے۔ انھوں نے ڈرامہ کے ڈائرکٹر سریندر شرما کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ڈرامے میں کبیر داس کے کردار کو زندہ کردیا ہے۔ اس موقعے پر ڈی یو کے وائس چانسلر نے کالج کے آرٹ اینڈ کلچر سوسائٹی کو 5 لاکھ روپے کا عطیہ دینے کا بھی اعلان کیا۔ اس موقعے پر ذاکر حسین دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اسلم پرویز نے مہمانانِ خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ 'کبیر کھڑا بازار میں' ایک ایسا ڈرامہ ہے جس میں محبت، بھائی چارگی اور مذہبی رواداری کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے دیگر اہلکار اور بڑی تعداد میں اساتذہ و طلبہ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 24 اکتوبر 2013

دھلی :

'اداس نسلیں' پر مذاکرہ

نئی دھلی: تقسیم ہند کے پرشور حالات کے نتیجے میں تحریک پانے والے عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' کی اشاعت کے 50 برس مکمل ہونے پر غالب اکادمی کے زیر اہتمام ایک مذاکرہ اہتمام کیا گیا جس میں ناول کے

'اداس نسلیں' پر مذاکرہ کے دوران اسٹیج پر پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور ڈاکٹر عقیل احمد، جب کہ مائک پر ڈاکٹر سرورالہدیٰ

تہذیبی، سماجی اور تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی۔ اداس نسلیں 1963 میں شائع ہوا تھا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے اور نظامت ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے کی۔ جے این یو کے ریسرچ اسکالر عبدالسمیع، محمد مقیم، محمد علام الدین، ذاکر فیضی، غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل نے مقالے پڑھے۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور پروفیسر شمیم حنفی نے اس مذاکرے پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اداس نسلیں کو انسانی رشتوں کے سیاق میں دیکھنے پر زور دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 اکتوبر 2013

یوم دختر اور اردو میڈیا

نئی دھلی: دوسرے بین الاقوامی یوم دختر کے موقعے پر آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں یونیسیف کے زیر اہتمام لڑکیوں کی تعلیم کے لیے معاشرے میں بیداری پیدا کرنے میں اردو میڈیا کے اہم رول کے سلسلے میں "Innovations in education" کے موضوع پر اردو میڈیا ایڈیٹرس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ شکھر کے تعاون سے منعقد کی گئی اس کانفرنس کی صدارت ڈی ڈی نیوز کے ڈائرکٹر جنرل ایس ایم خان نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں ایس ایم خان

'پاکستانی مزاح نگار کو استقبالیہ' پروگرام میں حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مجموعہ 'بابونگر' کا رسم اجرا کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سینئر صحافی اسد رضا، منظور عثمانی، عظیم اختر و دیگر

نے بحیثیت میڈیا شریک کار: اردو میڈیا کے لیے مواقع' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اردو میڈیا کے رول کو انتہائی اہم بتاتے ہوئے کہا کہ اردو میڈیا تعلیم کے معاملے میں حکومت اور یونیسیف کی پالیسیوں اور معلومات و اطلاعات پہنچانے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ایس ایم خان نے کہا کہ اردو الیکٹرانک میڈیا مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے بہت اہم رول ادا کرسکتا ہے اور سیریلیز کے ذریعے لوگوں میں تعلیم کے حصول کی اہمیت و ضرورت کا رجحان پیدا کیا جاسکتا ہے اور اخلاقی ذمے داری کا احساس دلایا جاسکتا ہے۔ سہارا اردو میڈیا اور عالمی سمے ٹی وی چینل کے ہیڈ سید فیصل علی، پروفیسر ریحان سوری، گیان منتر ڈاٹ کام کے سی ای او حسن کبیر جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لیے وسائل پیدا کرنے اور حکومت یونیسیف کی کیرولین ڈین ڈولک آر ٹی ای کارکن امبریش رائے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 نومبر 2013

پاکستانی مزاح نگار کو استقبالیہ

نئی دھلی: انسان کے ایک دوسرے کے قریب آنے اور آپس میں ملنے جلنے سے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور انسان کئی الجھنوں سے نجات پاسکتا ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کی زندگی میں فاصلے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک کے ادبا کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جس سے کہ ہندوستان و پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے نزدیک آئیں اور خطے سے شدت پسندی، نفرت، بھوک و غریبی جیسے بڑے مسائل کا خاتمہ ہوسکے۔ ان خیالات کا اظہار پاکستان کے معروف طنز و مزاح نگار حسین احمد شیرازی نے بستی حضرت نظام الدینؒ میں واقع غالب اکادمی میں ایک استقبالیہ تقریب میں کیا جو انڈین کلچرل سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔ اس موقعے پر حسین احمد شیرازی کے مزاحیہ مضامین کے مجموعہ 'بابونگر' پر مذاکرہ و محفل طنز و مزاح کا بھی انعقاد کیا گیا اور 'بابونگر' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس ادبی پروگرام کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جب کہ راشٹریہ سہارا اردو کے سینئر صحافی اسد رضا، منظور عثمانی اور عظیم اختر نے بطور مہمان اعزازی و مہمان ذی وقار شرکت کی۔ پروگرام کی ابتدائی نظامت میکش امروہوی نے کی۔ بعدازاں نظامت غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں انڈین کلچرل سوسائٹی کے روح رواں و میزبان کے ایل نارنگ ساقی نے تمام مہمانان و شرکا کا خیر مقدم کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 15 اکتوبر 2013

اردو طلبا کے تعلیمی مقابلے

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے اسکولی طلبا کے درمیان بیت بازی مقابلہ برائے سینئر زمرہ منعقد ہوا۔ آج کے مقابلے میں ڈاکٹر خالد علوی اور فرحت احساس بطور جج شریک ہوئے اور آبزرور کی حیثیت سے اسد رضا نے شرکت کی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے مقابلے کے نتائج کا اعلان کیا۔ مقابلہ میں ہمدرد پبلک اسکول سنگم وہار کی ٹیم کو اول اور سرودیہ بال ودیالیہ نمبر 1، جامع مسجد و ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول جعفر آباد کی ٹیم کو دوم اور نیو ہورائزن اسکول کی ٹیم کو سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا جب کہ زینت محل سرودیہ کنیا ودیالیہ جعفر آباد کی ٹیم کو حوصلہ افزائی انعام کے لیے منتخب کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اکتوبر 2013

کرشن چندر کے ڈرامے کی پیش کش

نئی دھلی: کرشن چندر سے منسوب 25 ویں اردو ڈراما فیسٹول میں 'لیونگ تھیٹر' کرشن چندر کے ایک ریڈیائی ڈراما 'دروازہ کھول دو' پیش کیا، جس کے ہدایت کار شیخ خیرالدین تھے۔ آغازِ ڈرامہ نے قبل سکریٹری اکادمی انیس اعظمی نے گزشتہ ڈراموں کی کامیاب پیش کش پر جملہ ڈرامہ گروپ کو مبارکباد دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اکتوبر 2013

آندھرا پردیش: ————

مولانا آزاد یونیورسٹی میں ابن صفی پر سیمینار

حیدرآباد: ''ابن صفی حقیقی معنوں میں نابغہ روزگار تھے۔ وہ اپنے طرز کے موجد اور خاتم دونوں تھے۔'' ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں پدم شری مجتبیٰ حسین نے ابن صفی پر مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کی جانب سے منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کی اختتامی تقریب سے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد، نائب شیخ الجامعہ نے کی۔ صدارتی خطبے میں ابن صفی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ابن صفی عوام کے بیچ رہے اور عام ادب کو فروغ دیا۔ انھوں نے ادب کے دائرے کو وسیع کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ ادب عامہ کی تحریروں کو بھی معیاری ادب میں جگہ مل سکے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، رجسٹرار مانو نے اپنی استقبالیہ تقریر میں سیمینار کے کامیاب انعقاد پر اطمینان کا اظہار کیا۔ پروفیسر خالد سعید، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، ڈاکٹر ارشاد احمد نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اکتوبر 2013

صحافتی نصاب تعلیم میں اخلاقی اقدار شامل کرنے کا مشورہ

حیدرآباد: 24 اکتوبر سینئر صحافی اور 'خبردار جدید' کے ایڈیٹر جناب معصوم مرادآبادی نے شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے طلبا کو اپنے ایک توسیعی لیکچر میں انھوں نے کہا کہ صحافت مشن سے لے کر پروفیشن بنی تو سب کچھ ٹھیک تھا لیکن کمیشن لے کر خبروں کی اشاعت کا سلسلہ ایک بڑا ہی سنگین مسئلہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایمانداری اور سخت محنت کا کوئی متبادل نہیں ہے اور طلبا اگر کامیابی چاہتے ہیں تو انھیں اس راستے سے ہوکر گزرنا ہوگا۔ صحافت کو عوام کی امانت قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایڈیٹر اخبار کی ملکیت تو رکھتا ہے لیکن اخبار اور اس کا مواد ایک امانت ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر اپنی آرا کا اظہار صرف اداریہ میں کرسکتا ہے۔ خبروں کو روکنا اور بلیک آؤٹ کے نام پر کسی مخصوص خبر کو

روکنا صحافتی اقدار کے سراسر منافی ہے۔ صدر شعبہ ایم سی جے جناب احتشام احمد خان نے معصوم مرادآبادی کا تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر جناب محمد مصطفیٰ علی سروری، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور حسین عباس رضوی، اسسٹنٹ پروفیسر بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، عبدالواسع، اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر، حیدرآباد، 24 اکتوبر 2013

اتر پردیش:

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا مضمون نویسی مقابلہ

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'تعلیم نسواں کے سلسلے میں سرسید کی فکر اور کاوش' موضوع پر منعقدہ کل ہند مضمون نویسی مقابلے کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس مقابلے میں اول انعام کا حق دار جے جی کالج آف کامرس،

احمد آباد گجرات کے الطاف حسین محمد یوسف سیٹھ کو قرار دیا گیا ہے جب کہ دوئم اور سوئم انعامات کے لیے بالترتیب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن، نئی دہلی کے رفیق ایم پی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سیدہ ایمن مظہر کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس مقابلے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے 60 طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ یونیورسٹی اور کالج سطح کے طلبا و طالبات کے لیے منعقدہ اس کل ہند مضمون نویسی مقابلہ میں فاتحین کو پہلے انعام کے لیے 25,000 روپیہ، دوسرے کے لیے 15,000 روپیہ اور تیسرے انعام کے لیے 10,000 روپیہ کی خطیر رقم سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف صوبوں کے سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے ایک طالب علم کو اسٹیٹ ٹاپر کے طور پر 5,000 روپیہ فی کس کے حساب سے دیے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 اکتوبر، 2013

مسلم یونیورسٹی میں پریم چند کے 305 ڈراموں کی پیش کش کا ریکارڈ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جنرل ایجوکیشن سینٹر کے ڈرامہ کلب کے زیر اہتمام ایک تقریب 'پریم اتسو' کا انعقاد عمل میں آیا جس میں منشی پریم چند کے 11 ڈرامے کینیڈی ہال میں اسٹیج کیے گئے۔ یہ پریم اتسو ممبئی کی جانی مانی 'آئیڈیل ڈرامہ اینڈ انٹرٹینمنٹ اکادمی' کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ اکادمی کے ڈائرکٹر مجیب خاں ہیں جنھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ منشی جی کی ناٹکوں کو عوام کے روبرو پیش کیا۔ اس اکادمی نے منشی جی کے 315 ناٹکوں میں سے 305 ناٹکوں پر پیش کش دے کر ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ انھوں نے یہاں جو ناٹک پیش کیے ان میں مندر، مسجد، قاتل، دو بھائی، بڑے گھر کی بیٹی، اگر غم نہ ہو تو بکری خرید لو، معصوم بچہ، پریرنا، نجات، کفن، مس پدما اور کوچڑ شامل ہیں۔ یہ پروگرام ڈرامہ کلب کے سکریٹری عارج قدوائی نے ڈرامہ کلب کے صدر ارمان رسول فریدی اور کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر ایف ایس شیرانی کی قیادت میں پیش کیا۔ اس موقعے پر سابق کوآرڈی نیٹر آصف نقوی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر دانش محمود وغیرہ بھی موجود تھے۔ سبھی ناٹکوں کو تماش بینوں نے کافی سراہا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 6 اکتوبر 2013

لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو تہذیب پر توسیعی خطبہ

لکھنؤ: اردو صرف ہندوستان نہیں پوری دنیا کی بہت بڑی زبان ہے۔ اس زبان میں ترسیل کی بے پناہ طاقت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خان محمد عاطف سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے توسیعی خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ کلیدی خطیب کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضا نیر سربراہ شعبۂ اردو نے کہا کہ اردو غزل ہندوستانی تہذیب کی مکمل طور سے ترجمانی کرتی ہے۔

ہندوستان کے ہندو غزل گو شعرا نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور مسلمان شعرا نے ہندو تہذیب کے سنسکاروں کو جس طرح غزل کے استعاروں میں پیش کیا ہے، اس کی مثال دوسری زبان کے شاعروں میں نظر نہیں آتی، ہماری سانجھی تہذیب کی پیش کش ہی اپنے آپ میں ایک بڑی علامت ہے بلاشبہ اردو غزل ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی نمائندہ صنف سخن ہے۔ اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر وسیم بیگم نے ہندوستان میں اردو غزل کا ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے عہد بہ عہد غزل کا تاریخی جائزہ اور تہذیبی پس منظر پیش کیا۔ پروفیسر وسیم بیگم نے کہا کہ نئی غزل کے موضوع، اسلوب اور آہنگ بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود غزل ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر احمد عباس نے کہا کہ لکھنؤ نے نمستے، السلام علیکم، کی جگہ جو آداب، تسلیمات، کی روایت قائم کی وہ خود اپنے آپ میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس جلسے میں محمد علی سحر، ریسرچ فیلو، اے جے کمار، محمد یاسر جمال، احمد معاذ اور شعبۂ اردو کے تمام طلبا و طالبات موجود تھے۔ شکریے کے کلمات ریسرچ اسکالر اختر سعید نے ادا کیے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 27 اکتوبر 2013

اردو یونیورسٹی میں پروفیشنل کورسز کے مواقع

لکھنؤ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اردو والوں کے لیے بے شمار مواقع فراہم کیے ہیں اور ان سے نہ صرف اردو والے فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ اردو میں مختلف پروفیشنل کورسز کرنے کے بعد روزگار کے بہتر مواقع بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد نے لکھنؤ کیمپس میں اساتذہ سے ایک خصوصی ملاقات کے دوران کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ہماری یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد میں ویمن ایجوکیشنل، پروفیشنل کورسیز اور ووکیشنل کورسیز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پنج سالہ منصوبہ میں بھی ہمارے وائس چانسلر ان چیزوں کو ترجیحی بنیاد پر شامل کر رہے ہیں۔ خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ وہ اردو داں طبقہ جو معاشی طور پر پچھڑا ہوا ہے ان کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایسے مواقع فراہم کر رہی ہے کہ وہ معاشی طور پر خود کفیل ہو سکیں۔ لکھنؤ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم نے پرو وائس چانسلر صاحب کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد کی انتظامی صلاحیت اور شخصی سنجیدگی کی تعریف کی۔ ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر ہمایعقوب، ڈاکٹر شاہ محمد فائز، ڈاکٹر عشرت ناہید، ڈاکٹر مجاہدالاسلام، ڈاکٹر نور فاطمہ، ڈاکٹر سرفراز احمد خاں، ڈاکٹر نکہت فاطمہ، ڈاکٹر ذیشان حیدر، ڈاکٹر ثمامہ فیصل اور جناب سعید بن مخاشن نے بھی نائب شیخ الجامعہ سے گفتگو کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 نومبر 2013

جامعہ مدرسہ عالیہ کو عربی یونیورسٹی بنانے کی مانگ

رامپور: نیشنل کمیشن گورنمنٹ آف انڈیا کے کوارڈی نیٹر محمد حسین صابری (پسماندہ طبقات) نے کانگریس کے

نائب صدر راہل گاندھی کو ایک میمورنڈم بھیج کر یہ مانگ کی ہے کہ جامعہ مدرسہ عالیہ اورینٹل کالج کو مرکزی عربی یونیورسٹی کا درجہ دے کر مولانا ابوالکلام کے خواب کی تعبیر کی جائے یہ تاریخی مدرسہ 1774 میں جس کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس نے اتنی ترقی کی کہ دنیا میں اپنا لوہا منوایا ہر جگہ کی یونیورسٹیوں میں اس کی ڈگری کو مانا گیا ہے۔ میمورنڈم میں مانگ کی گئی ہے اس مدرسہ عالیہ کے لیے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے خواب دیکھا تھا کہ اس کو عربی نیشنل یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 13 اکتوبر 2013

فارسی ادب اور ٹیگور پر مذاکرہ

رام پور: رام پور رضا لائبریری میں فارسی ادب کے ٹیگور پر اثرات کے موضوع پر ایک پروگرام کا انعقاد ہوا جس میں ممبئی کے معروف صحافی شمیم طارق نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر شمیم طارق نے کہا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رابندرناتھ ٹیگور سادہ مزاج شخصیت کے مالک تھے اور مختلف مواقع پر ان کی شخصیت کے الگ الگ پہلو سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رابندرناتھ ٹیگور ایک کہانی کار شاعر اور آرٹسٹ کے ساتھ ساتھ آزادی کی لڑائی میں سرگرم عمل رہے۔ ڈاکٹر لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ ٹیگور کے دادا نے حافظ شیرازی کی دیوان حافظ کا بنگالی ترجمہ کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کشور سلطانہ، اظہر عنایتی، ڈاکٹر سید انوار الحسن قادری، ہیرالال کرن، عاصم راجہ اور ڈاکٹر مہندی حسن سمیت بڑی تعداد میں معززین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اکتوبر 2013

مرادآباد میں سرسید ڈے

مرادآباد: مقامی میفیئر کالج پنڈت نگلہ میں منعقدہ سرسید ڈے کی تقریب میں نیشنل مائنارٹیز ایجوکیشنل کونسل کے قومی چیئرمین اور سرسید ڈے تقریب کے مقرر خصوصی جسٹس ایم ایس اے صدیقی نے خطاب کرتے ہوئے سرسید کی خدمات کا اعتراف کیا۔ مہمان خصوصی خواتین اقلیتی کمیشن کی چیئرپرسن شبستان غفار نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرسید نے قوم کی خواتین کو تعلیم یافتہ بنائے جانے پر بھی زور دیا۔ راشد فیڈریشن کے چیئرمین کالج کے منیجر ابوبکر منصور شمسی، پرنسپل ڈاکٹر چھٹن خاں، حاجی یوسف انصاری ممبر اسمبلی نے بھی اظہار خیال کیا۔ سید محمد ہاشم نے نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2013

بلند شہر میں یوم سرسید

بلند شہر: ہندوستان میں سب سے پہلے تعلیم نسواں کی آواز سرسید احمد خاںؒ نے بلند کی تھی، جس کی بدولت آج ملک کی بیٹیوں نے دنیا میں نمایاں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے مسلم گرلس ڈگری کالج کے ہال میں سید حمایت علی کی صدارت میں منعقد سی ایس یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے مشترکہ پروگرام 'جشن یوم سرسید احمد خاں' سے اپنے خطاب میں کہا۔ اس موقعے پر مہمانان ذی وقار افاق الرحیم خاں نے تمام علیگ برادری (ابنائے قدیم و جدید) سے اپیل کرتے ہوئے کہ کہ اب سے 25 سال قبل علیگ برادری تعلیم بیداری کی مہم چلائی تھی جس کے نتائج آج سب کے سامنے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2013

میرٹھ میں جشن سرسید

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی، میرٹھ کے باہمی اشتراک سے منعقدہ ہفت روزہ جشن سرسید تقریبات کا فیض عام انٹر کالج، میرٹھ میں شہر قاضی پروفیسر زین الساجدین کی سرپرستی میں شاندار آغاز ہوا جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر محمد یوسف قریشی ایڈوکیٹ نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور نواب کوکب حمید (ایم ایل اے و سابق وزیر حکومت اتر پردیش) اور مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر معراج الدین (سابق وزیر، حکومت اتر پردیش) شریک ہوئے جب کہ مقررین کے طور پر پربھات کمار رائے، قاری شفیق الرحمٰن قاسمی، روحامہ احمد، ذیشان احمد خان نے شرکت کی اور نظامت آفاق احمد خاں نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 اکتوبر 2013

لکھنؤ میں مرزا ہادی رسوا پر سیمینار

لکھنؤ: مشہور ناول نگار مرزا ہادی رسوا کی مجموعی خدمات کے جائزہ اور نئی نسل کو ان کی حیات و خدمات سے واقف کرانے کے لیے لکھنؤ سوسائٹی کے زیر اہتمام جے شنکر پرساد ہال میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ شام ادب کے عنوان سے منعقد تقریب میں مقررین نے کہا کہ امراؤ جان کو اردو ادب کے ناولوں میں بہت ہی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ امراؤ جان کی اہمیت سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس ناول میں 19 ویں صدی کا لکھنؤ پوری طرح سے پیش کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کی خوبی ہے۔ افسانہ نگار عابد سہیل نے کہا کہ مرزا رسوا کی زندگی دوسروں سے مختلف تھی اور ان کا زندگی کے تئیں نظریہ بھی الگ تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو امراؤ جان جیسا ناول دیا۔ امراؤ جان ادا ناول پر امراؤ جان کے نام سے فلم بنانے والے مظفر علی نے کہا کہ انھوں نے اس موضوع پر بڑی تحقیقات کی، تب کہیں جا کر فلم بن سکی ہے، جس میں امراؤ جان کے ساتھ ساتھ پوری لکھنؤ تہذیب کی جھلک موجود ہے۔ فروخہ جعفر جنھوں نے اس فلم میں ریکھا کی والدہ کا کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس فلم میں باریک ترین پہلوؤں پر بھی محنت سے کام کیا گیا تھا جب کہ وسیم بیگم نے کہا کہ امراؤ جان صرف ایک کردار ہی نہیں بلکہ لکھنوی تہذیب کا آئینہ ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 اکتوبر 2013

اردو میں امتحان اور جائزے کا معائنہ

رام پور: چاند ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام سہ روزہ بعنوان اردو زبان میں امتحان اور جائزہ کا معائنہ باشتراک این ٹی ایس انڈیا وزارت فروغ انسانی وسائل کا انعقاد عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب میں ڈاکٹر رضوان احمد اور ڈاکٹر سلیم احمد نے تفصیل سے این ٹی ایس انڈیا کے اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ این ٹی ایس انڈیا کا مقصد مختلف ذرائع اور شعبوں میں 16 لاکھ اساتذہ کو تیار کرنا ہے تا کہ اردو کے فروغ کے لیے بہتر کارہائے انجام دیے جاسکیں۔ انھوں نے بتایا کہ تنظیم کے ذریعہ ہر سال ہندی، تامل اور اردو میں 45 محققین کو فیلوشپ کو اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنظیم کے ذریعے ایک ماہانہ اخبار نیشنل ٹیسٹنگ سروس انڈیا کے نام سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور ساتھ ہی تنظیم کے ذریعے 6 ڈاکومینٹ تیار کی جاچکی ہیں۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر حسن احمد نظامی سابق چیئرمین فخرالدین علی احمد اکادمی (لکھنؤ) نے شرکا کو این ٹی ایس کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا کہ فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کی ایک اسکیم ہے جس کا قیام ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے لیے میسور میں کیا گیا ہے، جس کا مقصد امتحانات و جائزہ کی اشیا تیار کرنا، اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کی تربیت کرنا اور ملک کے اندر امتحانات و جائزہ کی ضروریات کی تکمیل کرنا۔ تنظیم کے سکریٹری صدا توصیف نے ورکشاپ میں شامل لوگوں کو اس کے فوائد سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ورکشاپ سے اردو زبان میں امتحانات دینے والے طلبہ و

طالبات اور اردو داسکالرس کو فائدہ حاصل ہوگا۔ اس موقعے پر انھوں نے مہمان خصوصی اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اکتوبر 2013

میڈیا میں ادب کو جگہ نہ ملنا باعث تشویش: وسیم بریلوی

شاہجہاں پور: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین اور عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر وسیم بریلوی نے کہا کہ آج ہمارے ملک کے سامنے تمام ایسے چیلنج ہیں جن کا سامنا سیاست دانوں کے علاوہ ادبا اور دانشوروں کو مل کر کرنے کی ضرورت ہے۔

انھوں نے اس بات پر فکر و تشویش کا اظہار کیا کہ آج میڈیا اور اخبارات میں ادب کو کم ترجیح دی جارہی ہے۔ اخبارات میں سیاست، فلم، کھیل اور جرائم کو زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب کہ زبان و ادب کو اخبار میں کم جگہ دے کر اس کی اہمیت اور افادیت پر سوال کھڑے کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں سبھی کو مل کر سوچنے اور اس سمت میں کچھ کرگزرنے کی پہل کرنی چاہیے۔ پروفیسر وسیم بریلوی نے یہ باتیں روزنامہ 'انقلاب' کے نامہ نگار سے خصوصی ملاقات کے دوران کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک سبھی مذاہب و ذات و طبقات کے باشندوں کا ایک خوبصورت گلشن ہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سبھی کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اپنے وطن سے محبت کرے اور وقت پڑنے پر قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اکتوبر 2013

اردو کے پاس ادب کا ایک بڑا سرمایہ موجود

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں غیر اردو داں بستیوں میں اردو زبان و ادب کی صورت حال پر منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر صابرہ حبیب نے روس، نائجیریا، افریقہ، سمیت کئی غیر ممالک میں اردو زبان کے تعلق سے اپنے تجربات پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی تمام زبانیں قابل قدر ہوتی ہیں۔ لیکن مادری زبان تو ماں ہے۔ دوسری زبانوں کو جاننے کی بنا پر رشتوں کو خوشگوار بنانا بہت آسان ہوجاتا ہے اور میری مادری زبان اردو ہے۔ تقریب کا آغاز ڈاکٹر فردوس جہاں صدر شعبہ اردو ممتاز کالج کی نظم سے ہوا۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے پروفیسر صابرہ حبیب کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے کہا انھوں نے نہ صرف لکھنؤ یونیورسٹی میں بلکہ روس، افریقہ، وغیرہ ممالک میں روسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تدریسی خدمات کو بھی انجام دیا ہے۔ اس موقعے پر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر عباس رضا نیر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 1 اکتوبر 2013

فیروز آباد میں اردو سروے رپورٹ پر اعتراض

فیروز آباد: مسلم کلیان و ایجوکیشنل سمیتی کی ایک نشست مولانا آزاد نسواں انٹر کالج میں منعقد کی گئی جس میں اردو سے متعلق سروے میں پائی جانے والی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ سمیتی کے سکریٹری احمد اُسامہ نے کہا کہ حکومت کی جانب سے یونافائیڈ ڈسٹرکٹ انفارمیشن سسٹم آف ایجوکیشن، آٹھواں اکھل بھارتی سروشکشن، ہاؤس ہولڈ سروے جیسے متعدد سروے کرائے جاتے ہیں، لیکن اردو سے متعلق اطلاعات ان سروے میں صحیح نکل کر آرہی ہیں، یہ ضروری نہیں۔ گزشتہ ماہ نیشنل یونیورسٹی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن کے محکمہ ایجوکیشنل مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (ای ایم آئی ایس) کی سروے رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ اردو میڈیم مسلم بچوں کا پسندیدہ ذریعے تعلیم نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سروے رپورٹ بے شک کچھ حقائق پر مبنی ہوسکتی ہے، لیکن یہ زمینی حقیقت ہرگز نہیں مانی جاسکتی۔ یہ کام پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو ہی کرنا پڑتا ہے اور سروے مکمل ہونے کے بعد اس کی رپورٹ تیار کرنے میں جو سافٹ ویئر اور کمپیوٹر آپریٹر اپنا کردار ادا کرتے ہیں وہ بھی بڑا اہم ہے۔ سمیتی کے نائب سکریٹری احمد عبداللہ نے بتایا کہ گزشتہ سال تک اس فارم میں تدریس کے میڈیم کے طور پر کسی زبان کو منتخب کرنا تھا، جس میں ہندی کا کوڈ 4 تھا، جب کہ اردو کا 18، اور انگریزی کا 19 کوڈ تھا۔ سب سے پہلی غلطی تو یہیں ہوا کرتی تھی کہ اساتذہ اس کالم کو بھرنے میں جلد بازی کرتے تھے اور بغیر آگے کے کوڈ دیکھے ہوئے کوڈ 4 بھر دیتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2013

چار روزہ کتاب میلے کا افتتاح

لکھنؤ: نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے ڈاکٹر خورشید جہاں گرلس اینڈ بوائز انٹر کالج سمیتی کے تحت سلیم پور ہاؤس قیصر باغ میں چار روزہ کتاب میلے کا افتتاح کیا گیا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے فیتہ کاٹ کر رسمی طور پر میلہ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کتابوں کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں انسانی حیات کی رہنما ہیں اس لیے کتابوں کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ، جغرافیہ اور سائنسی حقائق بدلتے رہتے ہیں لیکن میر، غالب، تلسی داس اور کالی داس کا لکھا ہوا ادب ماہ و سال کی گردش سے متاثر ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس موقع پر 'منشی نول کشور کی حیات و خدمات پر سیمینار' میں پروفیسر اشفاق عابدی کی صدارت میں ہوا۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر ہارون رشید نے کی۔

قیصر باغ، سلیم پور ہاؤس لان پر چل رہے کتاب میلے کے دوسرے دن بھی کتابوں کی خریداری کے ساتھ ساتھ بچوں کا آرٹ، رنگولی اور مہندی کا مقابلہ جاتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ثقافتی پروگرام میں ایک شاندار مشاعرہ بزرگ شاعر قمر گونڈوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں قمر گونڈوی کے علاوہ ڈاکٹر حبیب خان، رفعت شیدا، شکیل گیاوی، ڈاکٹر ہارون رشید، عرفان لکھنوی، آفتاب اثر ٹانڈوی، زاہد لکھنوی، سلیم تابش، ساحل عارفی، کمال ادیب، قمر سیتاپوری، احسن اعظمی، ماہر لکھنوی، راجو پرکاش، ساحر لکھنوی، کے کے سنگھ مینک، سعید لکھنوی اور محترمہ نیتو سنگھ نے اپنا کلام پیش کرکے سامعین و ناظرین کو لطف و اندوز کیا۔ 30 اکتوبر 2013 کو چاند تعلیمی سوسائٹی کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کی جانب سے شام 4 بجے میلہ گراؤنڈ پر مرزا ہادی رسوا فن اور خدمات موضوع پر ادبی سیمینار منعقد کیا گیا۔

پریس ریلیز، انجینئر عتیق الرحمن، 28 اور 29 اکتوبر 2013

بہار:

اردو فکشن میں خواتین کی خدمات

پٹنہ: بہار کے جے ڈی وومینس کالج میں 30 اور 31 اگست

2013 کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تعاون سے ایک دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کا موضوع تھا

’اردو فکشن میں خواتین کی خدمات‘۔ اس تقریب کا افتتاح مشترکہ طور پر مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر نند جی کمار، اردو کی عظیم فکشن نگار محترمہ جیلانی بانو، ہندی اور میتھلی کی کی ممتاز اور مشہور کہانی کار اور شاعرہ ڈاکٹر اوشا کرن خاں، نے کیا۔ افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ مہمان ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے پیش کیا۔ افتتاحی تقریب کے علاوہ سیمینار کی دو نشستیں منعقد ہوئیں۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ نے مہمانوں کے اعزاز میں اردو بھون میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی جس میں مہمانوں کی خدمات میں گلدستے اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ سیمینار میں بیرون ریاست سے جیلانی بانو، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر صالحہ زریں، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر قمر جہاں، پروفیسر اسرائیل رضا، ڈاکٹر منظر اعجاز، شہاب ظفر اعظمی وغیرہ اردو کے مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔

بذریعہ ڈاک: عبدالصمد، پٹنہ، بہار 10 اکتوبر 2013

تصوف سے فرار: اسباب اور سد باب

پٹنہ: 10 ویں صدی ہجری کے معروف صوفی اور جید عالم دین آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ ارزانیؒ کے عرس کی پانچ روزہ تقریب کے دوران 9 اکتوبر 2013 کو خانقاہ میں ایک کل ہند سیمینار کا بھی انعقاد ہوا موضوع تھا ’تصوف سے فرار: اسباب اور سد باب‘ جس کی صدارت ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد مدظلہ نے فرمائی۔ اس سیمینار میں پروفیسر سید شاہ طلحہ رضوی برق نے کہا کہ خانقاہوں نے ہر دور میں انسانوں میں درد دل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دور حاضر میں خانقاہیں اس سلسلے میں ناکام ہیں۔ اس لیے خانقاہوں کو اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر کل ہند سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تصوف میں دل کی صفائی پہلا قدم اور لازمی قدم قرار پائی ہے۔ اس لیے پہلی کوشش دل کی صفائی کی ہونی چاہیے۔ سیمینار کی صدارت خانقاہ کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد نے کی اور نظامت کے فرائض تحریک اردو کے جنرل سکریٹری اور سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے انجام دیے۔ اس سے قبل دائرہ وصی، سہسرام کے سجادہ نشیں، معروف فکشن نگار پروفیسر حسین الحق شہودی نے کہا کہ اسلام شروع ہوتا ہے بیعت سے اور تصوف مکمل ہوتا ہے بیعت سے۔ صدر مجلس پروفیسر سید شاہ حسین احمد نے امام غزالی کے اقتباسات کے حوالے کی روشنی میں تصوف کی

کما حقہ تعریف کرنا ناممکن قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ احساسات کی چیز ہے اور ہر اچھا آدمی صوفی ہے۔ ڈاکٹر محبوب اقبال نے ’تصوف سے فرار: اسباب اور سد باب‘ پر بھرپور احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے تصوف کی مختلف جہات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے فرار کی وجہوں کو نمایاں کیا اور سد باب کو واضح کیا۔ سراج اجملی نے اپنے مقالے میں صوفیاء کرام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی خدمات اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے پر زور دیا۔ آخر میں پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر حسین الحق اور صدر مجلس ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد کے ہاتھوں خانقاہ شاہ ارزانی کے ترجمان سہ ماہی رسالہ ’دیوان‘ کے خصوصی شمارہ ’تصوف نمبر‘ کی رسم اجرا عمل میں آئی۔

بذریعہ ڈاک: محمد فیروز عالم، پٹنہ بہار، 24 اکتوبر 2013

پورنیہ میں علی طلحہ کی یاد میں جلسہ

پورنیہ: پورنیہ کمشنری میں تعلیمی انقلاب پیدا کرنے والے کنسٹی ٹیونٹ نہرو کالج کے بانی مرحوم پروفیسر علی طلحہ کی 74 ویں یوم پیدائش تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر علاقے کے معروف ادیب شمس جلیلی، پورنیہ کی تصنیف ’مغنی نامہ‘ کا رسم اجرا بزرگ شاعر و ادیب پروفیسر طارق جمیلی کی رہائش پر عمل میں آیا۔ اس رسم اجرا تقریب میں کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر طارق جمیلی نے مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج سے تقریباً نصف صدی قبل سیمانچل کی تعلیمی پسماندگی کا حال بہت برا تھا اور یہاں سے انھوں نے تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘، دہلی، 26 اکتوبر 2013

کہکشاں اردو کوئز کا انعقاد

گوپال گنج: اردو کالج گوپال گنج میں بارہویں جماعت کے اردو طلبہ و طالبات کے لیے کہکشاں اردو کوئز مقابلہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ذوالفقار علی پرنسپل ہذا نے کی اور نظامت ذاکر حسین ذکی ہاشمی نے انجام دی۔ اس موقعے مہمان خصوصی ریاض احمد نے مقابلہ میں شریک طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں معروضی نقطۂ نظر سے پڑھنے کی صلاح دی۔ مہمان ذی وقار جاوید اقبال نے یہ اعتراف کیا کہ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں پرنسپل ذوالفقار علی اور شعبہ اردو کے لکچرر جناب ذکی ہاشمی جنھوں نے کہکشاں اردو کوئز مقابلہ منعقد کرکے نہ صرف اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے کہ بلکہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ کہکشاں اردو کوئز مقابلے میں حصہ لینے والے طالب علموں کے کل چھ گروپ تھے، گروپ ڈی نے اول مقام حاصل کیا جس میں فلک ناز اور صوفیہ پروین نے نمایاں نمبر حاصل کیے۔ آخر میں ذوالفقار علی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’قومی تنظیم‘، پٹنہ، 11 اکتوبر 2013

جھار کھنڈ

مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت

گریڈیھہ: انجمن ترقی اردو گریڈیہہ کی ایک نشست مورخہ 2 اکتوبر 2013 کو علی کوٹیج موہن پور میں زیر صدارت شمیم تومانی منعقد ہوئی جس میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے ان کی زندگی اور قربانیوں پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں سید علی عباس سکریٹری انجمن نے بھی مہاتما گاندھی اور اردو کے تعلق سے کئی معلومات فراہم کیے۔ مہاتما گاندھی کا اردو میں تحریر کردہ ایک خط جو چودھری محمد حسین لاہور کے نام تھا جس میں مہاتما گاندھی نے علامہ اقبال کی نظم ہمارا ہندوستان پر اپنے گہرے تاثرات کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی منجھلا ڈیہہ میں الحاج ادریس صاحب اور ماسٹر عثمان صاحب نے اپنی گفتگو میں اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ بینگا باد میں انعام الحق کی رہنمائی میں اردو کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی۔ باتفاق رائے انجمن کی ایک شاخ تنظیم کی تشکیل ہوئی جس کی ذمے داری توحید عالم صدیقی کو سونپی گئی۔ حاجی حسین الحق، پروفیسر حسین انعام الحق و دیگر شرکا نے نہایت ہی جامع تجویزات پیش کیے۔ اس ضمن میں گریڈیہہ شہر اور نواح کی اردو لائبریری، آزاد لائبریری بھنڈاری ڈیہہ اور نیشنل اردو لائبریری بڑھیا کھاد کے نظم و نسق کے سلسلے میں متعلقہ ذمے داران سے رابطہ کیے جانے کا فیصلہ لیا گیا۔ مظلوم مظہر نے کہا کہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ذاتی زندگی سے اردو کو جوڑنے کی ضرورت ہے۔

رپورٹ: مظلوم مظہر، جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو، گریڈیہہ، 7 اکتوبر 2013

جموں کشمیر:

فیض حسین انقلاب

راجوری: راجوری کے معروف شاعر، ادیب، سماجی کارکن اور تحریک آزادی کے اہم کارکن فیض حسین انقلاب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے حوالے سے کلچرل اکادمی کے سب دفتر راجوری کی جانب سے ڈاک بنگلہ راجوری میں یک روزہ سیمینار بعنوان 'فیض حسین انقلاب۔فن وشخصیت' منعقد کیا گیا جس میں خطے کے معروف دانشوروں وادیبوں نے اپنے پرچے پڑھے۔ اس تقریب میں بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ارشاد احمد جمال مہمان خصوصی تھے جب کہ سابق ممبر قانون ساز کونسل چودھری گلزار احمد نے صدارت کی۔ ادھر پروگرام میں ممبر قانون ساز اسمبلی چودھری ذوالفقار علی، ممبر قانون ساز کونسل شام لال بھگت اور سابق ممبر پارلیمان واسپیکر مرزا عبدالرشید مہمان ذی وقار کے طور پر موجود رہے۔ پروگرام کا انعقاد کلچرل آفیسر ڈاکٹر علمدار عدم کی جانب سے کیا گیا تھا۔ سجاد میر نے مہمانوں کو گلدستے پیش کیے جب کہ پروگرام کی نظامت معروف ناظم، شاعر، ادیب اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر لیاقت نیر نے انجام دی۔ معروف دانشوران و فلمکار نظیر قریشی، ایم این قریشی، عبدالسلام بہار، ڈاکٹر رشید قادری، امیر محمد شمسی، پرویز ملک اور منظور عثمانی نے فیض حسین انقلاب پر اپنے مقالے پڑھے اور ان کے کردار کو ابھارا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 اکتوبر 2013

'بچوں کی دنیا' کی مقبولیت کا ریکارڈ

اورنگ آباد میں 5 ہزار کاپیاں ایک ساتھ فروخت

اورنگ آباد/ مہاراشٹر: اردو ادب کی تاریخ میں شاید ہی اس سے قبل بچوں کے لیے شائع ہونے والے کسی رسالے کو کسی ایک شہر میں اتنی بڑی تعداد میں خریدا گیا ہو۔ حیرت انگیز اور ناقابل یقین حد تک مہاراشٹر کے ثقافتی شہر اورنگ آباد کے بچوں نے قومی اردو کونسل سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو 5 ہزار کی تعداد میں خرید کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے، جو یقیناً گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیے جانے کا مستحق ہے۔ اردو کتب و رسائل کو شہر میں فروخت کرنے والے مرزا عبدالقیوم ندوی نے بتایا کہ ہمارے شہر کے اردو اسکول کے اساتذہ و انتظامیہ بہت ہی مددگار اور اچھے کاموں کی ستائش وحوصلہ افزائی کرنے والے واقع ہوئے ہیں۔ ان کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ قوم کے بچے پڑھیں اور آگے بڑھیں اس لیے وہ مجھے رسالہ 'بچوں کی دنیا' کے تعارف کا پورا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مرزا عبدالقیوم ندوی مزید کہتے ہیں کہ بچے پڑھتے نہیں یہ بچوں پر جھوٹا الزام ہے۔ اگر بچے پڑھتے نہیں ہوتے تو 'بچوں کی دنیا' اتنی بڑی تعداد میں کیسے فروخت ہوتا۔ انھوں نے اردو کے کئی ایک ادیبوں اور شاعروں سے بچوں کے رسائل کے بارے میں دریافت کیا کہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں بچوں کے رسائل کے خریدار ہونے چاہئیں تو سب کا جواب نفی میں تھا اور کوئی بھی 100 سے زائد ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ 'بچوں کی دنیا' اورنگ آباد میں 3 ہزار اور ریاست کے پربھنی میں دو ہزار کی تعداد میں فروخت ہو چکا ہے تو وہ حیرت کرنے لگتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 نومبر 2013

راجستھان:

اردو ٹیچنگ سینٹر کا افتتاح

جودھپور: بزم اردو، جودھپور اور راجستھان اردو اکادمی جے پور کے مالی تعاون سے یوم گاندھی کے
پر اردو ٹیچنگ سنٹر کا افتتاح پال روڈ شانتی پری نگ
واقع شری جودھپور برہم چھتریہ سماج سنستھان
گیا۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے بتایا
سینٹر پر مفت اردو پڑھانے اور سکھانے کا اہتمام
ہے۔ خواہش مند خواتین وحضرات اس سینٹر سے
حاصل کر سکتے ہیں۔ راجستھان ہائی کورٹ سابق چیف جسٹس مگھ راج کلا بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس کے علاوہ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے جگل کابرا، نائب مہاپور نیاز محمد بھی شریک ہوئے۔ اجلاس کی صدارت اے ڈی راہی نے کی۔ پروگرام کی نظامت محمد افضل نے کی اور برجیش امبر نے اظہار تشکر پیش کیا۔

بذریعہ ڈاک: نثار احمد راہی، سکریٹری بزم اردو، جودھپوری، راجستھان، (ہندی سے ترجمہ)، 3 اکتوبر 2013

کرناٹک:

محمود ایاز کی شخصیت پر سمپوزیم

بنگلور: محمود ایاز ایک بلند پایہ شاعر، صحافی اور سماجی خدمت گزار تھے۔ انھوں نے روزنامہ 'سالار' نکال کر جنوبی ہند

ان خیالات کا اظہار ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام سی او ایس ہال، دارالسلام بلڈنگ میں منعقدہ یک روزہ سمپوزیم بعنوان 'محمود ایاز: فکر وفن' میں کیا۔ انھوں نے افتتاحی اجلاس میں اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ محمود ایاز جیسے جینئس بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مہمانِ ذی وقار پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ محمود ایاز ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور ان کی ادبی کاوشوں میں خاصی رنگارنگی اور تنوع نظر آتا ہے۔ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ فکر کی تہہ داری کے ساتھ پراثر اور نرم وشگفتہ اظہار کے پیکر سے محمود ایاز کی شاعری کا اچھوتا پن نمایاں ہوتا ہے۔ مشہور شاعر خلیل مامون نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ محمود ایاز کی شخصیت بھی تہ دار تھی اور شاعری بھی۔ وہ ایک آزاد خیال اور کشادہ دل فنکار تھے۔ سمپوزیم کے پہلے اجلاس کی صدارت شافع قدوائی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ممتاز شاعرہ شائستہ یوسف نے کی۔ آخری اجلاس کی صدارت معروف شاعر فرحت احساس نے کی۔ اس موقعے پر بنگلور کی متعدد سرکردہ شخصیات کے ساتھ مختلف کالجوں کے طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، مشتاق صدف، پروگرام آفیسر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 23 اکتوبر 2013

مہاراشٹر:

عادل ناگپوری کے فکروفن پر سیمینار

ناگپور: انیسویں صدی کے وسط ہند کے ادبی ماحول میں سانس لینے والے اس عظیم المرتبت شاعر اور انشاپرداز نے فارسی اور اردو نظم ونثر میں اپنی تقریباً سترہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو فکری وفنی لحاظ سے انتہائی وقیع وجامع

[illegible] پڑتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مشہور محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے عادل ناگپوری: عہد، شخصیت اور کارنامے کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران کیا۔ اس سیمینار کا اہتمام یونائیٹڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن مومن پورہ ناگپور نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (حکومت ہند) کے اشتراک سے ہوٹل عظیم بابو ناگپور کے آڈی ٹوریم میں منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارشد جمال نے 'عادل کی غزل گوئی' پر اپنا پرمغز مقالہ پیش کیا جس میں انھوں عادل کی غزلوں کو آتش وناسخ کے ہم پلہ قرار دیا۔

پریس ریلیز، جاوید احمد انصاری، مہاراشٹر، 3 نومبر 2013

اعزاز و اکرام:

پریس کونسل آف انڈیا کا اردو صحافت ایوارڈ عارف عزیز کو

بھوپال: پریس کونسل آف انڈیا کے ایوارڈ برائے صحافت 2013 کا اعلان کردیا گیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ سالِ گزشتہ سے شروع ہونے والا اردو صحافی کا ایوارڈ اس مرتبہ بھوپال اور لکھنؤ کے حصے میں آیا ہے اور یہ گراں قدر ایوارڈ روزنامہ 'ندیم' بھوپال کے نمائندہ خصوصی عارف عزیز کے ساتھ روزنامہ 'آگ' لکھنؤ کے ایڈیٹر محمد ابراہیم علوی کو اردو صحافت کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دینے پر دیا گیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک قومی ادارہ کے کل ہند سطح کے اعزاز کے لیے بھوپال کے ایک سرگرم صحافی کا انتخاب کرکے اسے ایوارڈ کا اہل سمجھا گیا جو بھوپال کی پوری اردو صحافت کا اعزاز ہے۔ عارف عزیز کی اردو صحافت کا سفر ہفت روزہ 'ایاز' بھوپال سے 74-1973 سے شروع ہوا، انھوں نے روزنامہ 'آفتاب جدید' بھوپال، سے کالم نگاری کا آغاز کیا، روزنامہ 'افکار' کے ایڈیٹر اور روزنامہ 'بھوپال ٹائمز' کے جوائنٹ ایڈیٹر کی خدمات بھی انجام دیں اور 25 برس سے روزنامہ 'ندیم' میں نمائندہ خصوصی اور کالم نگار کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اب تک اٹھارہ انیس ہزار مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی 9 کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں، جن میں خاکہ نگاری، تحقیق وتنقید نگاری، سفرنامے اور کالموں کے دو مجموعے شامل ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 نومبر 2013

وسیم بریلوی کو امروہہ کے 60 سالہ کلب کا ایوارڈ

امروھہ: سرزمین امروہہ کی مشہور ادبی تنظیم الایچی کلب کی 60 سالہ یادگار شہر کے مدھورم ہال میں منعقد کی گئی، اس موقعے پر کلب کی جانب سے الایچی کلب اراکین کی زندگی پر کاروانِ خلوص' نامی ایک کتاب کی رونمائی قومی کونسل کے

وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی و پاکستان حکومت سے وابستہ سید سبطین نقوی کے ہاتھوں عمل میں لائی گئی۔ پروگرام کا افتتاح حکیم شعیب اختر، نواب انتقام علی خاں ومحبوب حسین زیدی (صدر) وحاجی اقرار احمد انصاری نے الایچی کلب امروہہ کی یادگار تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرکے کیا۔ مہمان ذی وقار سید محمد سبطین نقوی سابق صدر مرکز سادات امروہہ پاکستان نے ہندوستان اور امروہہ کے درمیان کے تعلق سے مدلل وجامع تقریر کی، موصوف نے کہا کہ پاکستان میں بھی ایک چھوٹا امروہہ بسا ہوا ہے، جہاں امروہہ کے ادب، تہذیب و ثقافت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس موقعے پر مہمان کو الایچی کلب کی جانب سے پروفیسر سید محمد سیادت نقوی کے دست مبارک سے مومینٹو بھی پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا اہتمام کا گیا۔ جس میں سلیم امروہی، ہندوستان پاکستان رشتوں کو بہتر بنانے والی اہم شخصیت سینئر آئی اے اس سندیپ سائیلس، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، پاپولر میرٹھی، پروفیسر وسیم بریلوی نے غیر ملکی مہمان کو معیاری کلام سنا کر لطف اندوز کیا۔ اس موقعے پر خورشید انور، حسن امام، حاجی اقرار احمد انصاری سابق چیئرمین، عسکری رضا ایڈوکیٹ، چوق امروہی، نوشاد علی انجینئر، نوید عیاض، نرالے میاں انصاری، حسن عارف انصاری، تمنا امروہی، خالد صدیقی، اعجاز حیدر، بابی ملک، رضا کمال ودیگر اہم ادبی سماجی شخصیات وضلع انتظامیہ کے افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 3 نومبر 2013

مظفرحنفی

نئی دھلی: ادبی اور ثقافتی تنظیم 'ہنس واہنی' نے اپنے سالانہ ایوارڈ برائے 2013 کا کیفی اعظمی ایوارڈ پروفیسر مظفرحنفی کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ انعام کی رقم، سپاس نامے، سند اور نشان یادگار عظیم شاعر اور دانشور کی خدمت میں شال وگلپوشی کے بعد سول لائنز الہ آباد کے شنکر لعل میموریل ہال میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں پیش کی گئی۔ بعد ازاں مظفرحنفی کی تازہ ترین تصنیف 'گفتگو و دوبدو' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ یہ کتاب ان پرلطف مکالموں کا مجموعہ ہے جو گزشتہ دو برسوں سے روزنامہ 'انقلاب' (ممبئی) میں شائع ہورہے تھے۔

پریس ریلیز، پروفیسر مظفرحنفی، بٹلہ ہاؤس، 4 نومبر 2013

محمد اسداللہ کو ساہتیہ رتن راشٹریہ سمان

ناگپور: معروف ادیب اور انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسداللہ کو 'راشٹریہ ساہتیہ کلا اور سنسکرتی پریشد، ہلدی گھاٹی، راجستھان' کی جانب سے 'یوم اساتذہ کے موقعے' پر منعقدہ ایک تقریب میں 'ساہتیہ رتن راشٹریہ سمان' سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر مہارانا پرتاپ میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر موہن شری مالی

اور ڈاکٹر امر سنگھ ودھان بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد اسداللہ کی گزشتہ تین دہائیوں کے دوران اردو ادب میں تخلیقی خدمات اور مراٹھی زبان وادب کے تراجم وتعارف پر مبنی تصانیف کے اعتراف میں انھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ محمد اسداللہ کی نو تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

بذریعہ ڈاک: آغا غیاث الرحمٰن، ناگپور، 14 اکتوبر 2013

امروہہ والوں کو اعزاز

نئی دھلی: برصغیر ہندو پاک کے معروف شاعر جون ایلیا کی یاد میں آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں امروہہ

فاؤنڈیشن کے زیراہتمام جشنِ جون ایلیا، تقریب فخرِ امروہہ ایوارڈ اور بین الاقوامی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس ادبی تقریب کی صدارت انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے کی، جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر پاکستان کی انجمن سادات امروہہ کے بانی وصدر سید شمیم ہادی نقوی نے شرکت کی۔ ادبی وشعری محفل میں حکومت ہند کے منصوبہ بندی کمیشن کی ممبر اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد کی چانسلر سیدہ سیدین، ہندوستان کے سابق سفیر وکل ہند کانگریس کمیٹی کے ترجمان م افضل، ممبر پارلیمنٹ جینت چودھری، سلطان احمد (پاکستان)، سماجوادی پارٹی اترپردیش کے جنرل سکریٹری مولانا جاوید عابدی، جون ایلیا کی بڑی بہن شاہ زناں نجفی اور معروف شاعر وفلمساز کمال امروہوی کی بیٹی وشاعرہ رخسار کمال امروہوی اور اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع بطور مہمانان ذی وقار موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ سراج الدین قریشی ودیگر مہمانان نے شمع روشن کرکے ادبی محفل کا باقاعدہ آغاز کیا۔

اس موقعے پر مختلف میدانوں میں نمایاں اور گراں قدر خدمات انجام دینے والی ملکی وبیرونی ممالک میں قیام پذیر امروہہ کی شخصیات کو 'فخر امروہہ ایوارڈس' سے نوازا گیا جن میں نیشنل ایوارڈ یافتہ ہندوستان کے معروف سائنس داں ڈاکٹر ایس وجیہ احمد نقوی، سید شمیم ہادی نقوی (پاکستان)، کمال فاروقی، شاہ زناں نجفی، رخسار کمال امروہوی، ڈاکٹر ایس پی سنگھ چپسل اور ڈاکٹر ہری ایس ڈھلوں شامل ہیں۔ اس سے قبل پروفیسر ناشر نقوی کی تازہ تصنیف 'برج شرف' کا مہمان کے ہاتھوں اجرا کیا گیا۔ بعدازاں امروہہ فاؤنڈیشن کی مرتب کردہ ڈکشنری کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اکتوبر 2013

نواب چھتاری کو سرسید ایوارڈ

علی گڑھ: مقبول سوشل ہیلتھ اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام منعقد قومی سیمینار بعنوان 'سرسید احمد خاں حیات وخدمات' کے مہمان خصوصی جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی چیئرمین قومی کمیشن برائے اقلیتی ادارہ جات حکومت ہند نے خطاب کرتے ہوئے معمارِ قوم سرسید احمد خاں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر شبستاں غفار نے مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم نسواں پر کم توجہ کی گئی ہے۔ صدر جلسہ نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کہا کہ آج ہم اس

جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نواب ابن سعید خان آف چھتاری کو سرسید ایوارڈ 2013 پیش کرتے ہوئے ساتھ میں ہیں پروفیسر افضال احمد اور الحاج بدرالسلام

محسن قوم کا یوم پیدائش منا رہے ہیں جس نے اپنی تمام زندگی اور اثاثہ قوم کی بہتری اور تعلیم کے لیے صرف کردی۔ سرسید اکادمی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر شان محمد نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے تعلیم کے ساتھ جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ کی وہ تھی تربیت۔ سرسید قومی سیمینار کے موقعے پر سوسائٹی کی جانب سے ہر سال کی طرح امسال کا سرسید قومی ایوارڈ نواب ابن سعید خاں آف چھتاری کو مہمانِ خصوصی جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی کے ہاتھوں تہنیتی نشانات تقسیم کیے گئے۔ پروگرام کے کنوینر پروفیسر افضال احمد نے نظامت کرتے ہوئے سبھی مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور مہمانِ خصوصی جسٹس سہیل اعجاز صدیقی کو سوسائٹی کی تاحیات رکنیت تفویض کی گئی۔ سوسائٹی کے کوآرڈی نیٹر رضوان ایم مقبول نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 اکتوبر 2013

عالمی یومِ اردو

نئی دھلی: شاعر مشرق علامہ اقبال کی یوم پیدائش 9 نومبر کی مناسبت سے منائے جانے والے عالمی یوم اردو

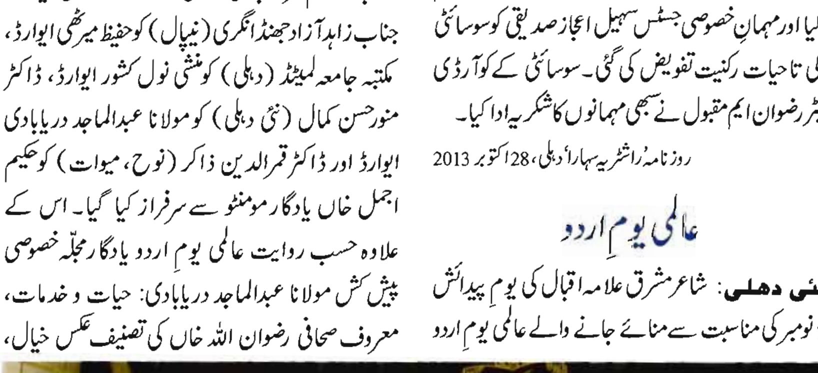

غالب اکاڈمی دہلی میں منعقدہ عالمی یوم اردو تقریب کا منظر

تقریبات کے تحت سب سے بڑا پروگرام قومی دارالحکومت دہلی میں واقع غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین میں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے منعقد ہوا، جس کی صدارت ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کی۔ پروگرام کا آغاز معروف عالم دین قاری محمد مخدوم حسینی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور محمد نظام نے نعت پاک کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کے بعد معروف ومعتبر شاعر متین امروہوی اور مولانا مجیب بستوی نے کلام پیش کیے۔ جبکہ نظامت کے فرائض سہیل انجم نے ادا کیے۔ سابق ممبر پارلیمنٹ، کانگریس پارٹی کے ترجمان جناب م افضل، پدم شری پروفیسر اختر الواسع، جسٹس شکیل احمد خاں، سپریم کورٹ کے وکیل جناب وصی احمد نعمانی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سربراہ پروفیسر توقیر احمد خاں، جناب رام پرکاش کپور اور عالمی یوم اردو تقریبات کے کنوینر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے خطاب کیا۔ اس تقریب میں گنگا جمنی تہذیب کی علامت مشہور شاعر گلزار دہلوی سمیت متعدد صحافی، ادیب، شاعر، دانشور، سیاست داں اور مختلف اسکولوں کے اساتذہ، بچے اور خواتین بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ اس موقعے پر جناب محمد عتیق (جودھپور) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، ڈاکٹر سیّد صادق علی ٹونکی (ٹونک) کو علامہ اقبال ایوارڈ، ڈاکٹر سیّد مسعود الحسن عثمانی (لکھنؤ) کو قاضی عدیل عباسی ایوارڈ، جناب معصوم مرادآبادی (دہلی) کو محفوظ الرحمٰن ایوارڈ، جناب زاہد آزاد جھنڈانگری (نیپال) کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) کو منشی نول کشور ایوارڈ، ڈاکٹر منور حسن کمال (نئی دہلی) کو مولانا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ اور ڈاکٹر قمرالدین ذاکر (نوح، میوات) کو حکیم اجمل خاں یادگار مومنٹو سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ حسب روایت عالمی یوم اردو یادگار مجلّہ خصوصی پیش کش مولانا عبدالماجد دریابادی: حیات وخدمات، معروف صحافی رضوان اللہ خاں کی تصنیف عکس خیال، ڈاکٹر منور حسن کمال کی تصنیف جنگ آزادی اور تحریک خلافت اور محترمہ زیبا نور (اہلیہ حکیم محمد طارق امروہوی مرحوم) کی مرتب کردہ کتاب ڈاکٹر شریف احمد: شخصیت اورفن کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، محمد عمران قنوجی، پریس سکریٹری، نئی دہلی، 12 نومبر 2013

پروفیسر نارنگ کی کتاب 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' کی رسم اجرا کا ایک منظر

شجاع الدین شاہد کو شاستری گورو ایوارڈ

ممبئی: آل انڈیا شاستری سوشل فورم کی جانب سے سال 2013 کے لیے اردو کے شاعر و ادب اطفال میں گراں قدر خدمات کے لیے شجاع الدین شاہد کو شاستری پرسکار سے نوازا گیا ہے۔ شجاع الدین شاہد کو پہلی کتاب 'گلشن گلشن پھول کھلے' نے بڑی

مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس ایوارڈ کے ملنے پر یوسف دیوان نے بھی شجاع الدین شاہد کو مبارکباد پیش کیا۔

بذریعہ ڈاک: یوسف دیوان، سکریٹری اردو منچ ممبئی، اکتوبر 2013

رسم اجرا:

غالب پر گوپی چند نارنگ کی کتاب کا اجرا

بنگلور: غالب شناسی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' ایک نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ برسوں بعد غالب پر زندہ رہنے والی یہ کتاب ہمارے سامنے آئی ہے۔ اردو ایک سیکولر زبان ہے۔ غالب بھی سیکولر ذہن و مزاج رکھتے تھے اور پروفیسر نارنگ بھی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اس اعتبار سے اس کتاب کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار کرناٹک کے گورنر ہنس راج بھاردواج نے آل انڈیا اردو منچ کے زیر اہتمام بنکویٹ ہال راج بھون میں پروفیسر نارنگ کی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی اور کرناٹک کے وزیر اعلیٰ سدارامیا نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہر کارنامہ قابل رشک ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی ایک نادر کتاب ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو کسی مخصوص فرقے کی زبان نہیں ہے۔ پروفیسر نارنگ جیسی شخصیتوں سے اردو کا وقار بلند ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کرناٹک میں اردو دوسری سب سے بڑی زبان ہے۔ وزیر برائے حج و اوقاف اور اقلیتی امور میونسپل انتظامیہ قمر الاسلام نے پروفیسر نارنگ کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 'اردو کا فروغ اور لسانی اقلیت' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دینا تھا لیکن ان کی غیر موجودگی پر ان کا توسیعی خطبہ اردو کے ممتاز شاعر چندر بھان خیال نے پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے توسیعی خطبے میں کہا کہ اردو ہے تو ہندوستان کا سیکولرزم ہے، اردو ہے تو جمہوریت ہے۔ یہ ہندوستان کی رنگارنگی کا ایک خاص رنگ ہے۔ یہ رنگ نہیں تو ہندوستان نہیں۔ چندر بھان خیال نے اس موقعے پر کہا کہ غالب پر پروفیسر نارنگ کی کتاب ایک ایسا دھماکہ ہے، جس کے سبب غالب شناسی کی ایک نئی کائنات وجود میں آ گئی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شافع قدوائی فرحت احساس، ڈاکٹر مشتاق صدف وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ آل انڈیا اردو منچ کے سرپرست اور ممتاز شاعر خلیل مامون نے صدارتی کلمات میں کہا کہ پروفیسر نارنگ نے غالب کی دقیقہ سنجی، معنی آفرینی و خیال بندی اور شونیتا پر خیال افروز گفتگو کی ہے۔ یہ یقیناً ایک بڑی کتاب ہے جسے وہی لکھ سکتے تھے۔ پروگرام کے آغاز میں شائستہ یوسف نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروگرام کے آخر میں چندر بھان خیال، شافع قدوائی، فرحت احساس اور مشتاق صدف کو گورنر ہنس راج بھاردواج اور وزیر اعلیٰ سدارامیا نے اعزازات سے نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اکتوبر 2013

امیتابھ بچن کے ہاتھوں اردو کتاب کا اجرا

ممبئی: ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ کی کتاب کے اردو ترجمہ کا اجرا ہندی سنیما کی قدآور شخصیت امیتابھ بچن نے کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر قاسم امام نے ہری ونش رائے کی نظم سے شروع کی جب کہ پرنسپل محمد سہیل لوکھنڈ والا نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر ممبئی کے پالک منتری جینت پاٹل نے کہا کہ ''میں اکثر کہا کرتا تھا کہ اپنے اندر کے انسان کو زندہ رکھنا ہو تو پولیس محکمے سے دور رہو جو اس محکمے سے وابستہ ہوا، وہ دن رات جرم و سزا سے لڑتا بھڑتا رہے گا۔ ایسی صورت میں انسانیت کہاں رہ جائے گی؟ مگر آج مجھے اپنا خیال بدلنا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ نہ صرف انسانیت کی تلاش میں ہیں بلکہ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے انسان کی تلاش کی راہ سجھائی ہے۔' مشہور نغمہ نگار جاوید اختر نے اس موقعے پر اپنی تقریر کے دوران کہا کہ ''جس کا جو کام ہے وہ وہی کرتا ہے۔ پولیس کا کام ہوتا ہے تلاش کرنا اور ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ نے انسان کو تلاش کرنے کا کام کیا ہے۔ انسان اور آدمی کا وہی رشتہ ہے، جو چٹان اور مورت کا ہے، یہ کام جاری ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وقت کی پابندی کا سب کو احساس دلایا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کے ذریعے جنت میں جانے کی کوشش سبھی کرتے ہیں مگر انسانیت کی راہ اختیار کر کے دنیا میں جنت بنانے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ واضح رہے کہ اس کتاب کو 'ہند فاؤنڈیشن' نے شائع کیا ہے جس کے چیئرمین عبدالرحمٰن ونو نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس کتاب کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ اسے مفت حاصل کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ اتنی اچھی کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ظہیر قاضی، عبدعلی بھانپور والا، عبدالحمید ناتھانی اور سید جمشید علی کے علاوہ حسین دلوائی، نظام الدین رائین، جعفر بھائی، وی آر شریف، ممبئی کے پولس افسران اور دیگر عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 16 اکتوبر 2013

بوسکی کا پنچ تنتر

نئی دھلی: انڈیا ہیبی ٹٹ سینٹر میں منعقد ہندوستانی زبانوں کے تیسرے 'سمنوے آئی ایچ سی لینگویج فیسٹول' میں معروف فلمساز اور شاعر گلزار کی تازہ ترین تصنیف 'بوسکی کا پنچ تنتر' کا اجرا کیا گیا۔ اس کتاب کا اجرا انگریزی کے مشہور رائٹر پون کمار ورما، ہندی کے معروف شاعر کیدار ناتھ سنگھ اور راج کمل پرکاشن کے اشوک مہیشوری نے کیا۔ اس موقعے پر پون کمار ورما نے کہا کہ گلزار کی یہ نئی کتاب ان کے تخیل کی وسعت اور پہنچ کو واضح کرتی ہے۔ اس موقعے پر گلزار نے کہا کہ جب ایک نسل کے بعد دوسری نسل آتی ہے تو زبان میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر زبان زندہ ہے تو وہ بدلتی رہے گی۔ اس سے قبل آج لینگویج فیسٹول کے پہلے اجلاس کا آغاز ہندوستان کی پہلی خاتون جسٹس اور معروف مصنفہ لیلی سیٹھ کی بچوں کے ساتھ بات چیت سے ہوا، جس میں انھوں نے بچوں کو

آئین کی اہمیت، ضرورت، خوبیاں اور باریکیاں بتائیں۔ اس موقعے پر بچوں نے موجودہ آئینی نظام کے تعلق سے سوالات بھی پوچھے۔ فیسٹول کا دوسرا اجلاس معدوم ہوتی ہوئیں ثقافتیں کے سلسلے میں تھا جس میں جے این یو کی پروفیسر اونتا ابی، انگریزی کے دانشور آلوک رائے، اشونی کمار پنکج اور ماہر لسانیات اودے نارائن سنگھ نے بحث کی۔ تیسرے اجلاس میں راجستھانی زبانوں پر مباحثہ ہوا جس میں راجستھانی فلموں کے اداکار رام کمار سنگھ، اسٹیج آرٹسٹ ارجن دیو چرن اور رتن شاہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اکتوبر 2013

دیویندر اسر کی پہلی برسی پر کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: اردو ادب کے برصغیر ہند و پاک کے معروف فکشن نگار، ادیب و دانشور دیویندر اسر کی پہلی برسی کے موقعے پر ہندی بھون میں ایک پروقار یادگاری ادبی محفل کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر صادق، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر نریندر موہن، ڈاکٹر مہیب سنگھ، را.جی سیٹھ، ڈاکٹر پربھاکر کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو، ہندی اور پنجابی ادبی شخصیات موجود تھیں۔ انھوں نے اس موقعے پر دیویندر اسر کی ادبی، سماجی صحافتی اور علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالی اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر دیویندر اسر کی دو کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ ان کی کتابوں کا اجرا معروف افسانہ نگار اور علمی و ادبی تنظیم سنچیتنا کے سنچالک ڈاکٹر مہیب سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر صادق نے دیویندر اسر کی حیات و شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خوبیاں بیان کیں اور کہا کہ دہلی میں دیویندر اسر نے ہی ان کی ادبی و فنی تربیت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ دیویندر اسر کی منظر کشی پر کمال حاصل تھا اور وہ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے اردو ادب پر چھائے رہے۔ معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیویندر اسر کے مختلف افسانوں کے کچھ پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے فن پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر پربھاکر نے دیویندر اسر کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 نومبر 2013

گاندھی جی اور سید عابد حسین

دھرہ دون: اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کی سابق پروفیسر صغریٰ مہدی کی 'گاندھی جی اور ڈاکٹر سید عابد حسین' اور 'تسبیح روز و شب' نامی دو کتابوں کا اجرا کیا۔ اس موقعے پر گورنر نے کہا کہ ڈاکٹر حسین ایک مجاہد آزادی کے ساتھ عظیم ماہر تعلیم، فلسفی اور دانشور تھے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی ڈاکٹر حسین کے مداح تھے اور باپو نے ان کی صلاحیت کا استعمال ملک میں تعلیمی اور اقتصادی ادارے قائم کرنے کے لیے کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر حسین کے مشورے پر ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ دونوں کے مابین بہت اچھے روابط تھے اور ان پر لکھی گئی یہ کتاب اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہوگی۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 اکتوبر 2013

لالۂ صحرائی کی رسم اجرا کے موقعے پر (دائیں سے) م افضل، حنیف ترین، سراج الدین قریشی، ڈاکٹر بلرام جاکھڑ اور پروفیسر اختر الواسع

لالۂ صحرائی

نئی دھلی: شاعری کا کام تمام حدوں کو توڑتے ہوئے ایک دوسرے کو قریب لانا اور آپس میں ملانا ہے، لوگوں میں نفرت کی جو بیماری پھیل رہی ہے اس کا علاج شاعری کے ذریعے ہونا چاہیے۔ مجھے فخر ہے کہ حنیف ترین اپنی شاعری سے ہندوستان کا نام پوری دنیا میں روشن کررہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار آج انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں سابق مرکزی وزیر بلرام جاکھڑ نے ڈاکٹر حنیف ترین کے مجموعہ کلام 'لالۂ صحرائی' کی رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ بلرام جاکھڑ نے کہا کہ یہ ایک روحانی غذا ہے جو ایک دوسرے کو شاعری سے ملتی ہے، انسان کو انسان ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں حدیں بن گئی ہیں لیکن یہ شاعری کا کام ہے کہ تمام حدیں توڑتے ہوئے ایک دوسرے کو آپس میں ملائے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ حنیف ترین صرف شاعری ہی نہیں کرتے بلکہ عصری ضرورتوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ڈاکٹر جیسے انتہائی مصروف شعبہ سے تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے غیر اردو دانوں کی سرزمین پر اردو کے حوالے سے شاعری کے جو پرچم گاڑ رکھے ہیں وہ ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔ شعیب رضا فاطمی اور احمد محفوظ نے مقالہ پڑھا۔ اس موقعے پر احتشام رحیم خاں، محمد شمیم سوت والے، محمد ساجد ایڈووکیٹ، وصی احمد نعمانی، علی گڑھ اولڈ بوائز کے صدر محمد ارشاد، مشتاق صدف، ایس اے عبدالرحمٰن، مولانا محمد رحمانی، پیغام آفاقی، ظفر نقوی، محمد احمد کاظمی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی اور دیگر لوگ موجود تھے۔ نظامت معروف صحافی ودود ساجد نے کی، جب کہ حنیف ترین نے اپنی غزلیں اور نظمیں سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 29 اکتوبر 2013

مسافر خواب لکھتا ہے

ناسک: 29 ستمبر 'بھترا اسٹیٹ' کے 'ہمسفر ہال' میں ہندی شاعر راکیش مہیشوری کی صدارت میں شبیر آصف کے مجموعۂ کلام 'مسافر خواب لکھتا ہے' کی تقریب اجرا کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو، مراٹھی اور ہندی کے شعرا و ادبا بھی شریک ہوئے۔ اس تقریب کی نظامت سریتا بھترا اور مراٹھی کے شیام پاڑیکر نے کی۔ غلام احمد جویا، آدم مُلا، چندر پرکاش بھترا، ایڈوکیٹ بھترا اور صاحبِ تصنیف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعدازاں نیشنل ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کے سابق پرنسپل زین الدین سر کی صدارت میں ایک سہ لسانی مشاعرہ ہوا جس کی نظامت ناصر شکیب نے کی۔ مشتاق احمد مشتاق، غلام احمد جویا، سید جاوید علی، شبیر آصف، ناصر کشیب، شیام پاڑیکر (مراٹھی)، شریمتی سنتوش شری واستو (ہندی)، ڈاکٹر جیوتی کجھبے اور صدرِ مشاعرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو مستفیض کیا۔

پریس ریلیز، شبیر آصف، مالیگاؤں، ناسک، 10 کتوبر 2013

کھلتی کلیاں

لکھنؤ: مرکز علم و فن شہر نگاراں میں جوہر فاؤنڈیشن ایک ایسا ادارہ ہے جس نے ادبی و تہذیبی وراثتوں کے وقار کو قائم رکھا ہے۔ قابل تحسین ہیں فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری محمد وصی صدیقی جنھوں نے اپنی روایتوں کو دوہراتے ہوئے برلن جرمنی میں ڈرامہ نویس افسانہ نگار

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی کتاب 'بہار میں اردو افسانہ: تنقیدی جائزہ' کی رسم اجرا کا منظر

اور شاعر عارف نقوی کی نئی شعری کتاب 'کھلتی کلیاں' کی رسم اجرا کے لیے دانشوروں کو ایک میز پر پھر جمع کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور نظامت ڈاکٹر ہارون رشید نے انجام دی۔ خصوصی مہمانوں کی فہرست میں پروفیسر شارب ردولوی، فیاض رفعت، اور عابد سہیل شریک رہے۔ اس موقعے پر عارف نقوی نے اپنے تجربات بانٹتے ہوئے کہا کہ میں نے کتاب کا نام 'کھلتی کلیاں' اسی لیے رکھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اس پرآشوب دور میں امید کی کلیاں پھر کھلیں گے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ عارف نقوی کی نظمیں صحن مسجد میں کھلنے والے گل کی طرح ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ عارف نقوی کی شاعری میں انسانی درد کا بیان پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ عابد سہیل نے عارف نقوی کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی نظموں کے محاسن بیان کیے۔ اخیر میں جلسے کے کنوینر محمد وصی صدیقی نے کلمات تشکر ادا کیے۔ جلسے میں خاص طور سے ڈاکٹر سلیم قدوائی نئی دہلی، ناہید فرزانہ، چودھری شرف الدین، ڈاکٹر معراج ساحل، شیخ فراست حسین، انور جمال، آفتاب اثر محسن لکھنوی کے ساتھ ادب نواز حضرات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 28 اکتوبر 2013

بہار میں اردو افسانہ: تنقیدی جائزہ

بتیا: قرآن گھر اکیڈمی میں ماہنامہ رہنما کے زیر اہتمام معروف مصنف ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی تازہ ترین تصنیف 'بہار میں اردو افسانہ: تنقیدی جائزہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ اجرا کی رسم مغربی چمپارن کے سی جے ایم، منوج کمار سنگھ، منصف محمد رستم، سید ہاشم رضا، شیلندر جی پی بتیا کورٹ، ایڈیٹر رہنما رضوان ریاضی اور عدلیہ کے دیگر حکام کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ رضوان ریاضی نے تمام حکام اور معزز مہمانان کرام کا استقبال کیا اور رسم اجرا کی تقریب کے حوالے سے مصنف کا تعارف پیش کیا تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے بتیا کورٹ کے منصف عزت مآب جناب محمد رستم نے ڈاکٹر نسیم کی تصنیف کو حد درجہ اہمیت کا حامل قرار دیا۔ مولانا محمد علی مدنی صوبائی ناظم اہلحدیث بہار نے بھی اپنی تقریر میں مصنف کی کاوش کو سراہا۔ اپنے تاثرات کا اظہار کرنے والوں میں ایڈوکیٹ اجے کمار دوبے، محمد ذاکر، شیلندر کمار سنہا، جناب وسیم اکرم، محمد نعیم الدین اور محمد مختار وفا نے بھی بہار میں اردو افسانے کی سمت و رفتار پر ڈاکٹر نسیم کی کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ اخیر میں مہمانِ خصوصی منوج کمار سنگھ سی جے ایم نے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مصنف کو اس کی عمدہ کاوشوں کے لیے تہ دل سے مبارکباد پیش کی۔ پروگرام کی نظامت منظر سلطان نے انجام دی۔ تقریب کے آخر میں اظہار تشکر کرتے ہوئے جناب رضوان ریاضی نے عدلیہ کے سارے حکام، عمائدین شہر، وکلاء حضرات، شعرا کرام اور دوسرے تمام اہل ذوق حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم بتیا، بہار، 1 نومبر 2013

تیرے ساتھ

نئی دھلی: اردو کلچرل سوسائٹی دہلی کے زیر اہتمام بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں ایک ادبی و شعری محفل کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں معروف ادبی شخصیت میکش امروہوی کی تازہ تصنیف 'تیرے ساتھ شعری انتخاب' کا اجرا کیا گیا اور بعد ازاں کل ہند مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت تسمیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق احمد نے کی جب کہ نظامت معین شاداب اور پیمبر نقوی نے کی۔ اس موقعے پر کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر احمد امتیاز اور ڈاکٹر عطیہ امتیاز نے مقالے پیش کیے اور کتاب پر پر مغز تبصرہ کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے میکش امروہوی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میکش امروہوی نے بنا کسی سرکاری مدد کے اب تک جتنے بھی پروگرام منعقد کیے ہیں ان کا مقصد قومی یکجہتی کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے میکش امروہوی کی تازہ تخلیق کے منظر عام پر آنے پر انھیں مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر سید فاروق احمد نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔ اردو کلچرل سوسائٹی کے صدر پیمبر نقوی اور جنرل سکریٹری امیر امروہوی نے تمام شعرا، مہمان اور شرکا کا شکریہ ادا کیا جب کہ اردو کلچرل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری امیر امروہوی نے میکش امروہوی کی 40 سالہ شعری خدمات کے حوالے سے میکش امروہوی کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 14 اکتوبر 2013

تخلیق کی دہلیز پر

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویجز اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے کمیٹی روم میں فاروق اعظم قاسمی کی کتاب 'تخلیق کی دہلیز پر' کی رسم رونمائی کی تقریب منعقد ہوئی جس میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر مظہر مہدی، ڈاکٹر ہادی سرمدی، جاوید رحمانی، عبدالسمیع، محبوب حسن ہمدم، قمر صدیقی اور احمد علی جوہر کے ہاتھوں کتاب 'تخلیق کی دہلیز پر' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر مظہر مہدی نے کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کتاب اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ادب کے تئیں سنجیدہ ہیں۔ بعض مضامین میں روایتی طرز کا احساس ہوتا ضرور ہے البتہ اس میں بھی ایک نئے پن کا انداز سمایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہادی سرمدی نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ہمیں امید ہے کہ ان کی اس طرح کی کاوشیں ہمارے سامنے آتی رہیں گی۔ ان کی کتاب دوسروں کے لیے بھی تحریک کا سبب بنے گی۔ جاوید رحمانی نے اپنے تاثرات میں کہا کہ آج نئی نسل میں جس طرح کی سہل پسندی کا رجحان در آیا ہے وہ اردو ادب کے لیے نقصان دہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 نومبر 2013

وفیات

ظفر عدیم

نئی دھلی: سینئر اردو صحافی، شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار ظفر عدیم کا 16 نومبر کی سہ پہر اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے اوکھلا کے ذاکر نگر واقع ان کے مکان پر انتقال ہوگیا، وہ 65 سال کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی اور چار بچے ہیں۔

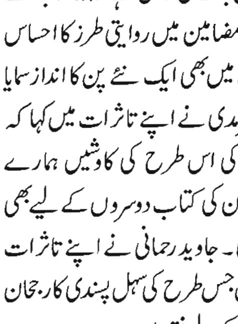

بہار کے شہر مظفر پور سے صحافت کی ابتدا کرنے والے ظفر عدیم نے تقریباً 40 سال تک اردو ادب اور صحافت کی خدمت کی۔ روزنامہ 'تیج' دہلی سے اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا، اس کے بعد وہ فلمی ستارے، اخبار نو، ماہنامہ جرائم اور 'بیسویں صدی' و 'روبی' میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ آخر میں روزنامہ 'قومی آواز' سے وابستہ ہوگئے اور اس کے بند ہونے تک

وہاں اہم ذمے داری نبھاتے رہے۔ ظفر عدیم کا گزشتہ دو سال سے روزنامہ انقلاب میں جمعہ کے روز مستقل کالم شائع ہوا کرتا تھا۔ ظفر عدیم کا ایک دیوان 'دیوان عدیم' کے نام سے شائع ہوا ہے اور کئی شعری مجموعے مثلاً بھینی بھینی مہک، لالہ رخ، ڈھیر سارے ناول اور ہرچہ بادا باد جیسی معرکۃ الآرا کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ یہ ان کا امتیاز تھا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور دیگر کئی رہنماؤں کی انگریزی کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ کئی سرکاری اور غیرسرکاری اداروں نے انھیں ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ ان کی تدفین بعد نماز عشا اوکھلا کے بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی جس میں اردو برادری کی نامور شخصیات موجود تھیں۔ ان میں ظفر عدیم کے دیرینہ رفیق کار نصرت ظہیر، معروف نقاد حقانی القاسمی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ظفر انور، نعمان قیصر، ابونعمان، عتیق ہاشمی، سہیل انجم، عبدالغفار، اشفاق احمد، عبدالحی (خرم قیومی)، کفیل احمد نعمانی اور دیگر سوگوار شامل تھے۔ کانگریس کے ترجمان اور سابق ممبر پارلیمنٹ م افضل نے ان کے انتقال کو اردو صحافت کا ایک بڑا خسارہ قرار دیا اور کہا کہ 'اخبار نو' سے ان کا بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ معروف صحافی شاہد پرویز، سید اجمل حسین، معصوم مرادآبادی، سید منصور آغا، مودود صدیقی، نایاب رحمان، جلال الدین اسلم، مولانا رحمت اللہ فاروقی، محمد ذکیرالدین ذکی، خلیق اعظمی، محمد غفران، منور شکوری، چندر بھان خیال، محمد احمد، بسمل عارفی، ظفر انور شکرپوری، قیصر سمستی پوری، ڈاکٹر ظفر انصاری، ڈاکٹر عبدالواسع، اے این شبلی اور ڈاکٹر میم ضاد فضلی وغیرہ نے ظفر عدیم کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 نومبر 2013

منّا ڈے

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

ممبئی: پانچ دہائیوں پر محیط کریئر کے مالک عظیم بالی ووڈ گلوکار منّا ڈے جمعرات کے روز 94 سال کی عمر میں ایک اسپتال میں انتقال کر گئے۔ ان کی آخری رسوم بنگلور میں ادا کی گئیں۔ بنگلور شہر کے مقامی ہسپتال کے سینئر ڈاکٹر نے بتایا کہ گلوکار جو حالیہ ماہ کے دوران سانس کی تکلیف کا شکار تھے آج صبح دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے۔ یکم مئی 1919 کو کولکاتا میں پیدا ہونے والے منا کا اصلی نام پرابودھ چندرہ ڈے تھا تاہم ان کے انکل انھیں پیار سے منا کے نام سے پکارتے تھے جو کہ بعد میں عام ہوگیا۔ انھیں گزشتہ کچھ مہینوں سے طبی معائنہ کے لیے باقاعدگی سے اسپتال لایا جارہا تھا اور ستمبر میں ان کو ڈائلسس پر بھی رکھا گیا تھا۔ لیکن گزشتہ روز انھیں سانس کے عارضہ اور گردوں کا کام کرنا بند کردینے کی وجہ سے انھیں اسپتال کے انتہائی نگہداشت والے یونٹ (آئی سی یو) لایا گیا تھا۔ جہاں انھوں نے جمعرات کی نصف شب میں تین بج کر پانچ منٹ پر زندگی کی آخری سانس لی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کو کانوں میں آئے روز گونجنے والی 'لاگا چنری میں داغ'، 'اے میری زہرہ جبیں'، 'زندگی کیسی ہے پہیلی' اور 'یاری ہے ایمان میرا' جیسی مسحور کن اور دلفریب آواز کے مالک کی یہ آواز اب صرف ریکارڈنگز میں زندہ رہے گی۔ ان کی آخری ریکارڈ 2006 میں عمر نامی فلم کے دوران کی گئی۔ آزادی کے بعد ہندی فلموں میں محمد رفیع، مکیش اور لتا منگیشکر کے ساتھ چوتھا نام منّا ڈے کا ہی لیا جاتا تھا جو ہر طرح کے گیت گانے میں ماہر تھے۔ کلاسیکی موسیقی ان کے خون میں تھی۔ اس کی تعلیم انھوں نے اپنے چچا ایکٹر، سنگر اور ٹیچر کرشن چندر ڈے سے حاصل کی جو کے سی ڈے کے نام سے مشہور تھے۔ نابینا کے سی ڈے پاٹ دار آواز میں گاتے تھے اور تیری گٹھری میں لاگا چور، اور من کی آنکھیں کھول جیسے ان کے فلمی گانے لوگوں کو آج بھی یاد ہیں۔ مگر منّا ڈے نے ان کی نقل نہیں کی اور اپنا راستہ الگ بنایا۔ وہ 'پیار ہوا اقرار ہوا' جیسے ہلکے پھلکے رومانی گیت بھی گاتے تھے اور 'دکھ بھنجنا وندنا سن ہماری' جیسے ٹھیٹھ کلاسیکی گانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ مزاحیہ گیتوں میں وہ ایک زمانے میں مشہور کامیڈین محمود کی آواز بن گئے تھے جن کے لیے انھوں نے درجنوں گیت گائے جن میں پیاس کی آگ میں تن بدن جل گیا، او میری مینا اور خالی ڈبہ خالی بوتل لے لے میرے یار قابل ذکر ہیں۔ ان مزاحیہ گیتوں کے برعکس 'اے مرے پیارے وطن اے مرے بچھڑے چمن تجھ پہ دل قربان' اور 'قسمیں وعدے پیار وفا سب باتیں ہیں باتوں کا کیا' انھوں نے اس قدر درد بھری لے میں گائے تھے کہ شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو ان گیتوں کو سن کر بھر نہ آئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2013 اور شعبۂ ادارت، 'اردو دنیا'

راجندر یادو

نئی دہلی: ہندی کے معروف مصنف اور ہنس میگزین کے ایڈیٹر راجندر یادو کا یکم اکتوبر کی رات انتقال ہوگیا۔ وہ 84 برس کے تھے۔ یادو کی کل رات اچانک طبیعت خراب ہوگئی

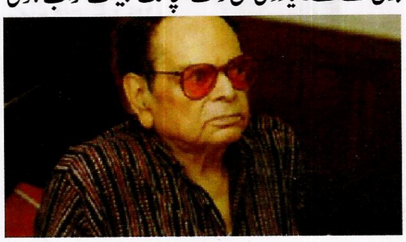

تھی اور انھیں سانس لینے میں تکلیف ہورہی تھی۔ انھیں رات 11 بجے فوراً ایک نجی اسپتال لے جایا گیا، لیکن انھوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ مسٹر یادو کے پسماندگان میں ان کی مصنفہ بیوی منو بھنڈاری کے علاوہ ایک بیٹی ہے۔ مسٹر یادو کے انتقال سے ہندی ادب کی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی ان کی آخری رسوم آج دوپہر کے بعد ادا کردی گئیں۔ 28 اگست 1929 کو آگرہ میں پیدا ہوئے راجندر یادو کا شمار ممتاز مصنفین میں کیا جاتا ہے۔ وہ منشی پریم چند کے میگزین ہنس کے 1986 سے مدیر تھے، جو ہندی کا سب سے مقبول ادبی میگزین سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذریعے ہندی کے نئے لکھنے والوں کی ایک نئی نسل بھی سامنے آئی۔ راجندر یادو کے مشہور ناول 'سارا آسمان' پر باسو چٹرجی نے ایک فلم بھی بنائی تھی۔ ان کی مشہور تخلیقات میں جہاں لکشمی قید ہے،... چھوٹے چھوٹے تاج محل، کنارے سے کنارے تک، ٹوٹنا، ڈھول جیسے افسانوں کے مجموعے نیز اکھڑے ہوئے لوگ، شہ اور مات، اندی تھے انجان پل اور عورت جیسے ناول بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنی بیوی منو بھنڈاری کے ساتھ ایک انچ مسکان نامی ناول لکھا۔ راجندر یادو نے دنیا کے مشہور مصنف چیخوف ترا گنیف اور الوے یرامو جیسے ادیبوں کی تخلیقات کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ مسٹر یادو نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور وہ کولکاتا میں بھی کافی دنوں تک مقیم رہے۔ وہ ایک طویل عرصے سے دہلی میں مقیم رہے اور دارالحکومت کے دانشورانہ حلقے کی ایک اہم ہستی مانے جاتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اکتوبر 2013

راشد منیر

ممبئی: اردو کی ممتاز ادیبہ محترمہ سلمیٰ صدیقی کے فرزند اور اسٹیج، ٹی وی کی شخصیت راشد منیر 27 اکتوبر کی شب رحلت کر گئے۔ راشد منیر گزشتہ سال بھر سے بیمار تھے۔ انھیں فالج کا عارضہ تھا۔ وہ ادبی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے دستاویزی فلموں کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ وہ اردو کے مشہور ادیب رشید احمد صدیقی کے نواسے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں والدہ سلمیٰ صدیقی اور تین بیٹیاں ہیں۔ پیر کو بعد نمازِ ظہر میرا روڈ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ عبیداعظم اعظمی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے راشد منیر کے اہل خانہ کی طرف سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔

پریس ریلیز، ندیم صدیقی، اردو ٹائمز، 28 اکتوبر 2013